# فہرست

آغا بابر

# گلاب دین چٹھی رساں

پوسٹ آفس کے پچھواڑے والی عمارت کے لمبے کمرے میں خاصی چہل پہل دکھائی دے رہی تھی۔ آج چٹھی رسانوں کے علاقے بدلے گئے تھے۔ چٹھی رساں گلاب دین کا چہرہ اترا ہوا تھا۔

کرم الٰہی نے اکرام سے پوچھا ”گلاب دین کی ماں کیوں مری ہوئی ہے۔؟“

”بھئی اس کی بدلی ہیرا منڈی ہو گئی ہے۔“

کرم الٰہی نے ہاتھ آگے کرتے ہوئے کہا ”سوں رب دی؟“

اکرام بولا ”سوں رب دی“ اور اس نے بھانڈ کی چپڑ اس کی طرح اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر دے مارا۔ دونوں کھل کھلا کر ہنس پڑے۔

”اس کا کیا مطلب ہوا جی؟ رزق دینے والا تو خدا ہوتا ہے۔ مجھے خواہ نوکری کیوں نہ چھوڑنی پڑے میں تو بڑے صاحب کے پاس اپیل کروں گا۔ آپ خود سمجھدار ہیں۔ افسروں کو کچھ تو خیال کرنا چاہیے کہ کون سا علاقہ کس کو دینا چاہیے۔“ گلاب دین اپنے دل کی بھڑاس نکال رہا تھا۔

وہ پانچ وقت کا نمازی تھا۔ اپنے محلے میں تراویح کی نمازوں میں قرآن خوانی کا انتظام کرنا ہمیشہ اس کے ذمے ہوتا تھا۔ بازار میں معراج شریف کا چندہ اسی کے ایماء سے اکٹھا ہوتا اور اسی کے ہاتھوں سے خرچ ہوتا تھا۔ میلاد النبی کے موقعے پر محلے کے لڑکے بالے اس کی ہدایت کے مطابق خوبصورت محراب نما دروازے بناتے اور جھنڈیاں لگاتے تھے۔ مسجد کے باقاعدہ نمازیوں میں اس کا شمار تھا۔ دین دار لوگوں کی صحبت سے مسئلے مسائل سے بھی خاصی آگاہی ہو چکی تھی۔ فرض شناسی اور ایمان داری کی بنا پر اپنے پرائے بھی اسے عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ مگر آج اس کی عزت کا دم گھٹ رہا تھا۔ ہیرا منڈی میں خط بانٹنے جائے گا‘ طوائفوں کے کوٹھوں پر چڑھ کر آوازدے گا ’بی بی جی خط آیا۔ غلیظ گلیوں میں جا کر پیشہ وروں کو ان کے یاروں کے خط دے گا‘ جو ہوس سے شروع ہو کر ہوس پر ختم ہوں گے‘ جن کا مضمون صرف بدکاری ہو گا۔ کسی خط میں ماں کی مامتا نہ ہو گی۔ کسی خط میں باپ کا پیار نہ ہو گا‘ ماں کی چھاتیوں میں دودھ کی جگہ سنکھیا ہو گا اور باپ کی

نگاہوں میں بے غیرتی' بے شرمی' بے حیائی ۔۔۔۔۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

اگلے دن پوسٹ ماسٹر کہہ رہا تھا" گلاب دین کیوں پیش ہونا چاہتا ہے؟"

سپروائزر بولا" آپ سے کوئی درخواست کرنا چاہتا ہے۔ صرف دو منٹ کے لیے پیش ہونے کو کہہ رہا ہے۔"

"بلاؤ"

گلاب دین کا چہرہ بڑے صاحب کی پیشی میں زرد پڑ رہا تھا' دل بیٹھا جا رہا تھا' کترے ہوئے لب زیادہ موٹے دکھائی دے رہے تھے' داڑھی کے بال زیادہ گھنے نظر آ رہے تھے۔ وہ شاید تازہ تازہ وضو کر کے دعا مانگ کر آیا تھا۔

"کیا بات ہے' گلاب دین؟"

"جی' میں صرف یہ عرض کرنے کو پیش ہوا ہوں کہ میری تبدیلی ہیرا منڈی کر دی گئی ہے۔۔۔۔"

"تو پھر"

"جی' ذرا خیال فرمایئے' میں پانچ وقت کا نمازی پرہیزگار آدمی ہوں۔ میری بڑی بے عزتی ہو گی۔"

اس نے درخواست نکال کر میز پر رکھ دی اور اپنے خالی کوٹ کی جیب سے کالے دانوں کی تسبیح نکال کر بولا" حضور' جس ہاتھ سے یہ تسبیح پھیری جاتی ہے وہ بدکاری کے اڈوں میں جا کر پیشہ ور عورتوں کو خط تقسیم کرے گا؟ استغفراللہ! مجھ سے یہ نہ ہو سکے گا۔ جناب! میری گزارش ہے کہ مجھے فیض باغ کا علاقہ دے دیا جائے یا مصری شاہ میں رہنے دیا جائے۔"

پوسٹ ماسٹر نے پیپر ویٹ کو ہاتھ میں گھماتے ہوئے کہا" تو تمہاری تبدیلی منسوخ کر دی جائے؟"

"آپ کے بچے جیتے رہیں۔ یہی کمترین کا مطالبہ تھا۔"

"سردست یہ مشکل ہے۔ غور کرنے کے لیے تمہاری عرضی رکھ لیتے ہیں مگر اس وقت تبدیلی منسوخ نہیں ہو سکتی۔"

گلاب دین کے سینے میں ایک تیر سا لگا۔

سراج اور گلاب دین' دونوں چٹھی رساں' پانی والے تالاب سے ہوتے ہوئے جب نوگزے کی قبر پر پہنچے تو سراج رک گیا۔ اس نے ہاتھ میں تھامی ہوئی ڈاک کو چھانٹا اور بولا" مولوی گلاب دین آ۔ ادھر سے شروع کریں" وہ دائیں ہاتھ کو گھوم گیا۔" یہ پہلا چوبارہ فیروزاں کا ہے۔ ادھر سب گانے والیاں رہتی ہیں۔"

پھاٹک کے سامنے چارپائی بچھائے تین چار آدمی بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔ مکان کے پختہ چھجے پر ایک عورت کندھے پر تولیہ ڈالے گیلے بالوں کو انگلیوں سے جھٹکے دے دے کر سکھا رہی تھی۔ دوپٹہ نہ ہونے کی

وجہ سے گلاب دین کو وہ بہت بے شرم دکھائی دی۔ ہر جھٹکے کے ساتھ اس کا سینہ۔۔۔ اس کا جی چاہا وہ آنکھیں بند کر لے۔ اس نے اپنی پگڑی کا شملہ پکڑ کر ناک اور منہ چھپا لیا۔

"کل سے میری جگہ یہ چٹھیاں تقسیم کیا کریں گے۔"

"ہیں! نیا چٹھی رساں لگ گیا؟"۔۔۔۔۔۔۔۔"جی ہاں"

لمبی لمبی مونچھوں والے نے تاش کے پتوں کو پتاخ سے بند کرتے ہوئے پہلے سراج کو دیکھا' پھر گلاب دین کی طرف نگاہ پھرائی۔ دیکھنے والے کی آنکھیں سرخ تھیں اور چارپائی کا کافی حصہ اس کے بھاری جثے نے گھیرا ہوا تھا۔ اس نے گھٹنا اٹھا کر لٹھے کی چادر کو چڈوں میں دے لیا اور پھر آسودگی سے بیٹھ گیا۔ اس کی پنڈلیوں پر منڈے ہوئے بالوں کا کھردرا غبار پھیلا ہوا تھا۔

"منشی ہوراں کا نام کیا ہے؟" نوجوان چھوکرے نے پوچھا۔

سراج نے جواب دیا "گلاب دین۔"

نوجوان چھوکرے نے ہنس کر کہا "رانجھا پھل گلاب دا میری جھولی ٹٹ پیا۔"

"وے شرم نہیں آتی تجھے؟ سلام دعا لینے کی بجائے مسخریاں کرنے لگا۔" تھڑے پر کھڑی ہوئی طوائف نے جھڑکا۔ اس نے اپنا ایک پاؤں کنہرے پر اٹھا کر رکھا تھا' جس سے اس کی وزنی رانوں کا اندازہ لگانے میں کوئی غلطی نہیں ہو سکتی تھی۔

"ادب بی بی اپنی شلوار جا کے سیو پہلے۔"

اس نے اپنا پاؤں کنہرے سے نیچے رکھ لیا اور بولی "نئے منہ بے شرما"

مونچھوں والے نے ڈبیا اٹھا کر گلاب دین سے کہا "سگریٹ پیو مولبی جی۔"

گلاب دین بولا "جی نہیں۔ مہربانی۔"

سراج نے سگریٹ سلگا لیا اور سلام علیکم کر کے آگے چل دیا۔

"یہ مونچھوں والا کون ہے؟"

"اس گلی کا چودھری۔"

"اور لچر سا چھوکرا؟"

"یہ بلو کے چاچے کا لڑکا ہے۔ یہ بلو ہی تو تھی۔ ڈھولک کے گیت بہت اچھے گاتی ہے۔ یہ نچلی بیٹھک بالاں کی ہے اور اوپر چوبارے میں گنگ رہتی ہے' اس نے ہاتھ میں پکڑی ڈاک میں سے ایک لفافہ نکال کر گلاب دین کو دکھایا' جس پر سرنامہ لکھا تھا' زمرد سلطانہ عرف گنگ۔ وہ سیڑھیاں چڑھ کر گلیارے میں آ پہنچے۔

بیٹھک خالی پڑی تھی۔ دروازے پر موتیوں سے پروئی ہوئی لڑیاں آپ ہی آپ لرز رہی تھیں۔ سراج نے میلی میلی چاندنی پر خط پھینکتے ہوئے کہا "چٹھی لے لو جی۔" ایک ٹھگنی سی عورت نے آ کر خط اٹھا لیا۔

سراج بولا "بی بی جی! کل سے یہ چٹھی رساں چٹھیاں بانٹا کریں گے۔"

"اچھا منشی" اس نے بے دھیانی میں کہا اور اضطراب سے لفافے کو دیکھ کر یہ کہتی ہوئی اندر چلی گئی

"منگ جی! چٹھی آئی ہے۔"

واپسی پر تاش کھیلنے والوں کے پاس سے گزرتے وقت گلاب دین نے اپنی خالی خالی نگاہیں ہوا میں ڈال دیں تاکہ وہ لچر سالے کا پھر مذاق سے کچھ کہہ نہ دے۔ مگر ان لوگوں نے دیکھا بھی نہیں کہ کون گزر گیا۔

بازار میں پہنچ کر گلاب دین نے ایک لمبا سا سانس لیا اور شملے کے سرے سے ماتھا پونچھا۔ سراج کہہ رہا تھا "یہ نکا پان والا ہے۔ یہ شہابے کی دکان ہے شہابے کے پان ساری ہیرا منڈی میں مشہور ہیں۔ یہ اس کا شاگرد ہے دن کو یہ بیٹھتا ہے۔ شہابا اس وقت سویا ہوا ہوگا شام کو بیٹھے گا۔ پان سگریٹ کی دکانیں دلالی کے اڈے ہیں مولوی جی۔"

اس وقت گلاب دین کو چپ لگی ہوئی تھی۔ وہ سراج کے یوں براہ راست خطاب پر چونک پڑا۔ بولا "خدا غارت کرے ان لوگوں کو۔"

"بازار میں یہ لوگ جو ہم کو اس وقت دکانوں پر بیٹھے نظر آ رہے ہیں، یہ طوائفوں کے ملازم ہیں۔"

ایک گلی کے سرے پر کھڑے ہو کر سراج چٹھی رساں نے خطوں کو پھر چھانٹا "اس گلی میں پیشہ کمانے والی بیٹھتی ہیں۔" سراج نے بغیر کسی جذبے کے کورے گائیڈ کی طرح کہا اور گلاب دین کو لے کر آگے بڑھ گیا۔ اس گلی میں سے سڑے ہوئے خربوزوں کی بو آ رہی تھی۔ گلاب دین نے شملے سے پھر اپنا منہ ڈھک لیا اور عاجزی سے بولا "اس گلی میں جانا ضروری ہے؟"

"صرف ایک خط ہے"........ "کس کا؟"

"کنجروں کے چودھری حاتو کا۔ اس گلی کی بہت کم چٹھیاں ہوتی ہیں۔ اگر کوئی ہوتی ہے تو وہ چودھری کی یا کسی دلال کی ہوتی ہے۔"

چودھری کی خضاب لگی داڑھی تھی۔ وہ چارپائی پر بیٹھا حقہ پی رہا تھا اور ایک شخص اس کی پنڈلیاں سونت رہا تھا قریب ہی ایک تیل مالشیا بیٹھا تھا۔

"کدھر ماسٹر؟" اس نے چٹھی رساں کی طرف دیکھ کر کہا۔

"چودھریو! آپ کی یہ چٹھی تھی۔"

کسبیاں اپنی اپنی دہلیزوں پر لوہے کی کرسیاں رکھے بیٹھی تھیں۔ چہروں پر پھٹکار برس رہی تھی۔ گلاب دین نظریں نیچی کیے سراج کے ساتھ ساتھ گزر رہا تھا۔ اتنے میں کسی عورت کی آواز آئی "میاں مٹھو! چوری کھائی ہے؟"

گلاب دین نے چور آنکھ سے دیکھا۔ ایک کسبی نے اپنے دروازے پر طوطے کا پنجرا لٹکا رکھا تھا۔ چٹھی رساں کو دیکھ کر بولی "منشی جی ہماری کوئی چٹھی نہیں آئی؟"

سراج نے جب نفی میں سر ہلایا تو بولی "ہائے! ہمیں کوئی چٹھی نہیں لکھتا۔"

دروازے کی چوکھٹ کے ساتھ دوپٹہ اتارے' سینہ اکڑائے' ایک عورت کھڑی تھی۔ بولی "یاراں پٹی! اب تجھے کون چٹھی لکھے گا۔ مر گئے تیرے سب یار چٹھیاں لکھنے والے۔"

یہ دونوں آگے نکل گئے۔ سراج نے کہا "طوطے والی عورت کا نام گلابو ہے۔ اس گلی کی ساری رونق اس کے دم سے ہے۔ بہت سے تماش بین اس گلی میں اسی کی خاطر آتے ہیں۔"

گلی آگے سے تنگ ہوتی جا رہی تھی۔ تماش بین' جو چھدرے چھدرے دکھائی دیتے تھے' اب ان کی وجہ سے راستہ رکتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ گلاب دین کا دم گھٹنے لگا۔ اس نے کھلی سڑک پر پہنچ کر اطمینان کا سانس لیا' پگڑی کے شملے سے ماتھا پونچھا اور داڑھی پر ہاتھ پھیرا۔ داڑھی پر ہاتھ پھیرتے وقت اسے یاد آیا کہ اس نے تماش بینوں کے ریلے میں ایک داڑھی والے کو بھی دیکھا تھا جس کے ماتھے پر ہار لپٹا ہوا تھا اور پھر کنجروں کے چودھری کی خضاب رنگی بھرویں داڑھی اسے یاد آئی۔ وہ تھک چکا تھا اور اپنے کام سے بے زاری محسوس کر رہا تھا۔ اس نے سوچا کاش! اس کی نون تیل کی دکان ہوتی' آرام سے بیٹھا دکان کرتا۔ اسے معلوم نہیں تانگوں کے اڈے تک پہنچنے میں کتنا وقت لگا۔ سینما کے قریب کا ماحول اسے کچھ مختلف لگا۔ اس کا جی چاہا سیڑھیوں پر بیٹھ کر آتے جاتے لوگوں کو دیکھتا رہے تاکہ اس کے اعصاب پر سے کھچاؤ دور ہو جائے۔

سراج نے اس کی طرف دیکھ کر کہا "کیوں منشی جی' تھک گئے؟"

"نہیں تو"۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ "بس یہ دو چٹھیاں اور باقی ہیں۔" یہ کہہ کر سراج نے چار پانچ خط گلاب دین کو تھما دیے۔ گلاب دین کو یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے غلیظ خون سے بھرے لتے' کوڑے کے ڈھیر پر سے اٹھا کر اس کے باوضو ہاتھوں میں تھما دیے ہوں۔

اتنے میں سراج ایک مکان میں داخل ہو گیا۔ جس کی ڈیوڑھی بہت بڑی تھی اور جو خالی پڑی تھی۔ وہ بے دھڑک آگے صحن تک بڑھ گیا۔ صحن میں ایک طرف نواڑی پلنگ پر دو نوجوان لڑکیاں لہسن کی تریاں چھیل رہی تھیں۔ سامنے لہسن کے چھلکوں کا ڈھیر لگا تھا۔ زمین پر چوکی بچھائے ایک چھوٹی سی لڑکی الگ بیٹھی لہسن

چھیل رہی تھی۔ سراج نے گلاب دین کے کان میں کہا "یہ بدرو اور قدرو کا مکان ہے اور گلاب دین کے ہاتھ میں تھی ڈاک میں سے ایک خط جس پر بدرالنساء کا نام لکھا تھا نکال لیا۔ ان کی آواز سن کر دونوں لڑکیوں نے نگاہیں اوپر اٹھائیں۔

سراج بولا "خط آیا جی۔"

دونوں لڑکیاں بے تابی سے آگے بڑھیں۔ سراج نے خط دینے کے لیے گلاب دین کو آگے دھکیلا۔ یہ پہلا خط تھا جو گلاب دین نے دیا۔

بدرالنساء خط کھول کر پڑھ رہی تھی کہ ڈیوڑھی میں سے دو بھاری بھرکم آدمی داخل ہوئے۔ سراج بولا "لو استاد ہوری بھی آگئے۔ منشی جی استاد نورالدین کی چٹھی دیکھنا۔"

گلاب دین خط چھانٹنے لگا کہ بدرالنساء خوشی سے چلائی "آپا کے کاکی ہوئی۔" دونوں لڑکیاں بدرالنساء کے پیچھے بھاگ گئیں۔

استاد نورالدین صحن میں کھڑا کہہ رہا تھا۔ "او حیوانو! شیطانو! ہمیں چٹھی تو دکھاؤ۔"

برآمدے میں لگی چق کے پیچھے سے کسی معمر عورت کی آواز آئی "استاد جی قمر کے کاکی ہوئی ہے۔"

"نصیبوں والی ہو۔ مبارکاں ہوں اماں جی۔"

"آپ کو بھی ہوں۔ اری لڑکیو چٹھی رساں کا منہ میٹھا کر دو۔"

استاد بولا "ایک چٹھی رساں نہیں دو ہیں۔"

سراج مسکرا کر بولا "استاد جی آپ بڑے جچتی ہیں۔ اپنا خط بھی لیا کہ نہیں؟"

گلاب دین نے نورالدین کو اس کا خط دے دیا جو محض اشارہ پانے کا منتظر کھڑا تھا۔ دوسرا بھاری بھرکم آدمی بولا "آج آپ۔۔۔۔"

سراج نے کہا "آج میرا آخری دن ہے۔ کل سے منشی گلاب دین چٹھیاں بانٹا کریں گے۔"

سراج کے ہاتھ میں قدرو نے آکر دو روپے دے دیئے۔ استاد نے گلاب دین کی طرف دیکھ کر بکت کی "بڑی قسمتوں والے ہو۔ کنجروں کے گھر سے پہلے دن ہی بونی کر چلے ہو۔"

بدرو بولی "مسخریاں چھوڑو۔ استاد جی۔ باہر جا کے اب ہوروں کو دیکھو اور کہو گھر مٹھائی کی ٹوکری لے کر آئیں۔"

بازار میں پہنچ کر سراج نے لوہے کے جنگلے والے مکان کی طرف اشارہ کر کے کہا "یہاں بیگماں رہتی ہے۔ وہ ساتھ والا مکان بھکو کا ہے۔ اس کے پیچھے وہ جو بیٹھک نظر آتی ہے وہ استاد نورالدین کی ہے۔ اسے

بدرنگے کی بیٹھک بھی کہتے ہیں۔ دیکھنا تو ایک چٹھی مشتری کی بھی تھی۔"

گلاب دین نے ڈاک دیکھ کر کہا "ہاں"

"یہ گھر زہرہ و مشتری کا ہے۔" یہ کہہ کر وہ ڈیوڑھی میں داخل ہو گیا۔ سامنے برآمدے میں ایک عورت چارپائی پر کروٹ لیے لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے موٹے موٹے کولہوں پر سے قمیض ہٹی ہوئی تھی۔ قدموں کی چاپ سن کر بھی اس نے اس طرف نہ دیکھا' جیسے کوئی نشہ پی کر بے سدھ پڑی ہو۔

سراج نے کھانس کر کہا' چٹھی رساں آیا۔"

ساتھ والے کمرے سے ایک نازک سی دبلی پتلی لڑکی خط لینے کے لیے نکل آئی۔ سامنے والے کمرے میں دو سازندے بیٹھے ایک چھوٹی سی لڑکی کو سبق دے رہے تھے۔ جس نے ناک میں نتھنی پہن رکھی تھی۔ ہاتھ کان کے پاس رکھے لمبی آواز میں کہتی جا رہی تھی' آ"۔۔۔۔ اسی طرح پھر کہے جا رہی تھی۔۔۔۔۔۔"جا"۔۔۔۔۔

نئے بازار میں آ کر سراج نے دوبارہ گلاب دین کو ایک روپیہ دینے کی کوشش کی۔ دونوں روپے خود رکھ لینا اسے اچھا نہ لگتا تھا۔ اس نے ایک روپیہ زبردستی اس کے کوٹ کی جیب میں ڈال دیا اور بولا' بزرگو یہ کوئی حرام کا پیسہ نہیں ہے۔ سمجھنے کی بات ہے۔ کسی کی جیب سے روپیہ نکال لینا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ روپیہ کا تو یہی حساب کتاب ہے۔ آج یہ ہماری جیب میں' کل دوسرے کی جیب میں' پرسوں وہاں سے تیسرے کے پاس۔ کسی کے پاس کب ٹھہرتا ہے۔"

گلاب دین کو وہ نتھنی والی لڑکی یاد آ گئی جسے پہلے سبق یہی دیا جا رہا تھا۔۔۔آ۔۔۔۔۔۔جا۔۔۔۔پھر آ۔۔۔۔۔۔پھر جا۔۔۔۔۔۔۔"یہ اب کدھر کو؟" گلاب دین نے سراج کو اب ایک تیسری گلی میں گھستے ہوئے دیکھ کر حیرت سے پوچھا۔

"ہمیں کس بھڑوے کا ڈر ہے۔ منشی جی؟ ہم اپنی ڈیوٹی دے رہے ہیں۔ اس طرح تو آپ بھر پائے۔؟"

اس گلی میں کچے گوشت کی بساندھ آ رہی تھی' جیسی بیف مارکیٹ سے آتی ہے۔ دو رویہ کرسیوں پر پیشہ ور عورتیں مردوں کی طرح ٹانگ پر ٹانگ رکھے بڑی بے باکانہ بیٹھی تھیں۔ ان کی باتیں بے ہودہ اور حرکتیں بڑی لچر تھیں۔ کچھ اوپر چوباروں پر بیٹھی تاک جھانک کر رہی تھیں۔

سراج بولا "یہاں سب ورڈ ز مال ہے۔" نصف گلی میں پہنچ کر اس نے کہا "منشی جی۔ فضل دین معرفت الٰہی جان کا خط نکالنا۔ اسے دے دو۔"

گلاب دین نے اس پتے کا خط الٰہی جان کو دے دیا۔ جس کے پاس سے اسے نسوار کی بو آئی۔ ایک دروازے کے سامنے سے تماش بین ایک مشکی رنگ کی عورت سے چہلیں کر رہے تھے۔ جس نے تہبند باندھ

رکھا تھا' کانوں میں موتیے کے پھول تھے اور بالوں میں سرخ گلاب اڑس رکھا تھا۔ سراج نے یہ کہہ کہ علاقے کے باخبر چٹھی رساں ہونے کا مظاہرہ کیا۔ "یہ خانگی ذات کی مسلن ہے۔"

اس وقت گلاب دین کو یہ بات اچھی نہ لگی۔ باہر نکلتے ہی اس نے ہڑ بڑا کر پوچھا "ان خانگیوں کی کتنی تعداد ہوگی؟"

"کوئی گنتی شمار نہیں۔ خانگیاں نہیں کہتے انھیں' مولوی جی۔ یہ کنجریاں ہیں۔ نئی پیشہ بیٹھنے والی کو خانگی کہتے ہیں۔؟" ........."خوک" گلاب دین نے حلق کھرچ کر زور سے تھوکا۔

ڈاک تقسیم کرنے کے دو وقت تھے۔ ایک دوپہر' ایک سہ پہر۔ دونوں وقت گلاب دین کو علاقہ گھومنا پڑتا۔ چاروں طرف چٹھیاں بانٹنے جانا پڑتا۔ اس بات کا اسے بڑا افسوس تھا کہ وہ بدرو قدرو کے گھر سے لیا ہوا روپیہ واپس نہیں دے سکا۔ اس روز سراج نے روپیہ زبردستی اس کی جیب میں ڈال دیا تھا۔ اس نے اسے اسی طرح رہنے دیا کہ اگلے روز جا کر واپس دے دے گا۔ مگر اسے ادھر جانے کا حوصلہ نہ پڑا۔ اس نے سوچا کسی روز ان کی چٹھی دینے جائے گا تو روپیہ بھی واپس کر دے گا۔ مگر چٹھی ہی نہ آئی۔ جس دن آئی اس سے دو روز پہلے اس کی جیب سے وہ روپیہ نکال کر اس کی بیوی نے مٹی کا تیل منگا لیا تھا۔

بدرو اور قدرو سفید چاندنی پر لیٹی تھیں۔ گاؤ تکیے پر ان کی چھوٹی بہن آلتی پالتی مار کر بیٹھی ہوئی تھی اور آج اپنی عمر سے بڑی دکھائی دے رہی تھی۔ پاس ان کے باپ بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ جب گلاب دین صحن میں داخل ہوا تو بدرو اسے دیکھتے ہی بولی' "چٹھی رساں آیا۔"

گلاب دین نے ڈاک چھانٹ کر تین لفافے اسے پکڑا دیے۔ اس کا باپ بولا "آؤ منشی جی' جی آیاں نوں۔ لڑکیاں روز کہتی تھیں' چٹھی نہیں آئی۔ نئے منشی جی لگے ہیں کہیں ہماری چٹھیاں دوسری جگہ نہ دے دیں۔"

گلاب دین بولا "جی نہیں۔ آپ کی چٹھی نہیں آئی تھی۔"

"میری بات کا خیال نہ کریں۔ آدمی بشر ہے۔ غلطی ہو ہی جاتی ہے۔ بازار میں میری لڑکیاں بدرو اور قدرو کے نام سے مشہور ہیں۔ اصل نام بدر النساء اور قدر النساء ہے۔ تیسری قمر النساء کراچی میں بیٹھک کرتی ہے۔"

قدر النساء چاندنی پر لیٹی لیٹی بولی' "ابا یہی تو اس روز کاکی کے پیدا ہونے کی چٹھی لائے تھے۔"

"بڑے مبارک قدم ہیں آپ منشی جی۔ خدا آپ کا بھلا کرے۔ یہ منی آرڈر تو لکھ دیں۔" اس نے گاؤ تکیے کے پیچھے سے ایک منی آرڈر فارم اٹھا کر گلاب دین کے ہاتھ میں دے دیا' بیٹھنے کے لیے جگہ خالی کر دی اور حقہ کی طرف موڑ کر نوکر سے کہتا گیا "اوئے' منشی جی کے لیے لسی لا۔"

"جی نہیں تکلیف نہ کریں۔"

"تکلیف کس بات کی بھئی۔ گھر کی لسی ہے۔"

"کوئی لویرا ہے؟"

"بھینس ہے منشی جی۔"

بدرالنساء بولی" ہمارا گھرانہ تو مغلوں کے وقت سے آباد ہے۔"

گلاب دین کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی۔ بدرو کا باپ بولا" ہم کوئی ایسے ویسے نہیں۔ بڑے خاندانی کنجر ہیں۔" پھر اس نے قمرالنساء کے نام منی آرڈر لکھنا شروع کر دیا۔ جب آخری خانہ آیا تو بولا "یہ دو سو روپیہ تمہیں کاکی کی چوسنی کے لیے بھیجا جا رہا ہے۔ تمہاری ماں کی طبیعت اچھی نہیں' جوں ہی اچھی ہوئی' تمہیں ملنے آ جائے گی۔"

لسی کے شکریہ کے طور پر گلاب دین نے پوچھ لیا" کیا تکلیف ہے گھر میں"؟" چکر آتے ہیں۔ ہم لوگ پرہیز بھی تو نہیں کرتے نا منشی جی۔"

گلاب دین چلنے لگا تو بدرو کا باپ بولا" منشی جی جس روز گھر کی لسی پینے کو جی چاہا کرے بلا تکلف چلے آیا کریں۔"

آہستہ آہستہ گلاب دین کو سب کے اندرون خانہ کا حال معلوم ہوتا چلا گیا۔ مثلاً یہ گیروے رنگ کا کشادہ مکان جس میں بدرو اور قدرو رہتی تھیں' ان کی پرداوی کو ایک رئیس لالہ مکند لال نے بنوا کر دیا تھا اور یہ کہ اب وہ سب سے چھوٹی لڑکی مہرالنساء کے لیے کسی اچھے رئیس کی تاک میں تھے۔ گزشتہ روز قدرو کو جب مجرے کے لیے گلبرگ جانا تھا تو بدرو نے مہرالنساء کو کس کس طرح سجایا تھا اور وہ بقول ان کے تنخی پہنے ہوئے موی گڑیا دکھائی دیتی تھی۔ بدرو اور قدرو کے باپ کا نام عبدالکریم تھا اور بھائی کا نام تیم تھا جو کانوں میں مندراں پہنے رہتا' اچھا کھاتا' اچھا پہنتا اور کوئی کام نہیں کرتا تھا۔ بدرو اور قدرو کی ماں سخت پردہ کرتی تھی۔

زہرہ و مشتری کے گھر موٹے موٹے چوتڑوں والی عورت جو کروٹ بدلے لیٹی نظر آتی تھی وہ زہرہ و مشتری کی سوتیلی بہن ہے' جسے افیون کھانے کی علت ہے' اسی طرح گولی کھا کر لیٹ جاتی ہے۔ زہرہ و مشتری کی ماں پردہ کرتی ہے اور پچھلے سال حج کرنے گئی تھی۔ اس کی دیکھا دیکھی گھر والوں کے سامنے بدرو اور قدرو کی ماں بھی حج کرنے کی خواہش کا اظہار کرتی رہتی ہے۔ مگر عبدالکریم اور اس کی تینوں بیٹیاں اس لیے حامی نہیں بھرتیں کہ ماں کی صحت کمزور ہے۔

گلاب دین کو یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جس گانے والی کی بیٹھک زیادہ چلے' دوسرے کے گھر فوراً خبر پہنچ

جاتی ہے کہ فلاں کے ہاں آج کل زیادہ سوسائٹیاں آتی ہیں۔ یہ سب کام طوائفوں کے ملازم کرتے ہیں جو رات بھر ادھر ادھر پھرتے رہتے ہیں۔ دن بھر دکانوں پر بیٹھے تاش کھیلتے ہیں اور ہارنے والوں سے پیڑے کی لسیاں پیتے ہیں۔

جن جن مکانوں کے دروازوں پر دن کو موٹی موٹی چقیں اور تہہ دار ٹاٹ لٹکے رہتے ہیں' رات کو انہیں مکانوں کے دروازے اس زور سے کھلتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے چق اور ٹاٹ کی دھجیاں اڑ گئی ہیں۔ اسے یہ سب مکان پراسرار نظر آتے تھے۔

وہ ایک دم تھکا ہوا تھا' پیاس بھی لگی ہوئی تھی۔ اس کا جی عبدالکریم کے گھر کی لسی پینے کو چاہا۔ اس نے سوچا یہ چار چٹھیاں بانٹ کر چوک کی طرف مڑ جائے گا۔ جوں ہی وہ چٹھیاں بانٹنے گلی میں داخل ہوا وہاں شور مچا ہوا تھا۔ مسلن کی ایک رنڈی سے لڑائی ہو رہی تھی۔ چند رنڈیاں کھڑی تماشا دیکھ رہی تھیں۔ جب گلاب دین وہاں سے گزرنے لگا تو مسلن اپنی مخالف رنڈی کی طرف لچر سا اشارہ کر کے بولی" جانی تجھے چٹھی رساں۔۔۔۔۔"

" جانی کشتئے' تجھے چٹھی رساں۔۔۔۔۔" دوسری نے پلٹ کر جواب دیا۔

سب رنڈیاں کھل کھلا کر ہنس پڑیں اور گلاب دین بغیر چٹھیاں بانٹے گلی میں سے نکل آیا اور عبدالکریم کے پاس پہنچا جو اپنی ڈیوڑھی میں بیٹھا حقہ پی رہا تھا" خیر ہے؟ آپ کچھ گھبرائے ہوئے ہیں۔"

گلاب دین نے پگڑی کے شملے سے ماتھا پونچھا اور سارا واقعہ بیان کر دیا۔

عبدالکریم اگلے روز گلاب دین کو چودھری حاتو کے پاس لے گیا جس نے اللہ رکھی مسلن کو خوب پیٹا اور گلاب دین سے کہنے لگا" دیکھو منشی جی۔ آپ نے مجھے یہ تو نہیں بتایا نہ کہ گلابو کی گلی سے گزرتے وقت پھونداں کنجری آپ کو لچکریں کیا کرتی تھی۔ جب آپ گزرتے وہ گلابو سے کہتی" نی تیرا خصم گلاب دین آیا ای۔" مجھ سے یہ شکایت دوسری رنڈیوں نے کی تھی اور میں نے ایک دن اس بات پر پھونداں کی پسلیاں بھی توڑی تھیں۔ ہمیں تو آپ کا پہلے ہی بڑا خیال ہے' منشی جی۔ مگر ایک بات آپ سے کہنی ہے مجھے' وہ یہ کہ گلیوں میں سے آپ مردوں کی طرح گزرا کریں' کھسروں کی طرح نہیں۔ اس علاقے میں تو آدمی کو بڑا استراگل ہو کر رہنا چاہیے۔"

جب گلاب دین عبدالکریم کے ساتھ اس کے گھر پہنچا تو ڈیوڑھی سے باہر ایک لمبی سی سبز کار کھڑی دیکھ کر عبدالکریم بولا" میرا خیال ہے' رانا ہوری آئے ہیں۔"

بیٹھک میں خستہ صوفے پر جس کا غلاف پرانی میل سے موم جامہ بن چکا تھا' رانا صاحب بیٹھے تھے۔

صوفے کے بازو پر بدرو بیٹھی تھی اور مہرو ایرانی سلک کے تھان کو اپنے بازوؤں سے ناپ رہی تھی۔ پھیلتے بازوؤں سے اس کے سینے کی گوری گولائیاں سامنے آ کر آنکھیں لڑا رہی تھیں۔

رانا سے ہاتھ ملا کر عبدالکریم گاؤ تکیے پر بیٹھ گیا اور مہرو سے بولا "منجھے سے کہو منشی کو لسی پلائے۔"

بدرو بولی "بازار گیا ہے۔ میں جاتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ صوفے کے بازو پر سے اٹھ بیٹھی اور اندر سے لسی کا ایک گلاس لا کر گلاب دین کے ہاتھ میں دے دیا' پھر پراسرار طریقے سے آہستہ سے بولی۔

"آپ ابھی جائیں مت۔"

"وہ وہاں سے اپنی ریشمی شلوار کو ہاتھوں میں سنبھالتی ناپ کر برآمدے میں پہنچی۔ وہاں سے بیٹھک میں آ کر رانا سے بولی' اماں ہوری اندر بیٹھے بھینس کا سودا کر رہے ہیں۔"

پھر باپ کی طرف دیکھ کر کہنے لگی "منشی جی کہتے ہیں' بھینس کا مالک کہتا ہے' لینا ہے تو دو دن میں آ کر اپنا مال لے جائیں۔"

باپ نے مسکرا کر رانا کی طرف دیکھا اور بولا "یہ دونوں بہنیں باری باری لسی بلوتی ہیں۔ اصل میں رانا جی! اب ہماری بھینس سوکھ گئی ہے۔ روز کہتی تھیں ابا' نئی لے دو۔"

رانا منیٰن سی نگاہیں بدرو کے چہرے پر ڈال کر بولا "تو لے لو نا۔ کتنے میں دیتا ہے؟"

"کیوں ابا جی آٹھ سو مانگتا ہے؟"

"ہاں پتر"

"کل مجھ سے چیک لے لینا" رانا بڑی بے غرضی سے بولا۔

بدرو نے چونچلا پن سے وہیں کھڑے کھڑے کہا "اچھا منشی جی آپ اب جائیں' ڈوگر سے کہہ دیں' ابا جی آ کر بھینس لے جائیں گے۔"

بھینس؟ کیسی بھینس؟ وہ سوچنے لگا۔

اس نے باہر نکلتے ہی پنواڑی سے پوچھا "یہ رانا ہوری کون ہیں۔"

"جس نے بدرو کو سرفراز کیا تھا' اس کا منشی ہے۔ کوئٹے سے آیا ہے۔ بھولے نہ ہو منشی جی' مال لایا ہوگا۔ اب چھوٹی بھی جوان ہو گئی ہے۔ بڑا استرا نگل آدمی ہے۔"

استرا نگل کیا ہوتا ہے؟ سوچتا ہوا وہ گڑھے کی قبر کی طرف چل دیا۔

اگلے روز اسے رانا کو دیکھنے کا شوق پھر بدرو کے گھر لے گیا۔ بیٹھک میں ساتھ ساتھ دو پلنگ بچھے تھے۔ ایک پر رانا بیٹھا نائی سے شیو بنوا رہا تھا۔ دوسری پر چائے کی پیالیاں وغیرہ بکھری پڑی تھیں۔ ان کا ملازم

گنجا' برآمدے میں کونڈی میں بادام رگڑ رہا تھا اور بدرو کا بھائی قیم ریشمی تہمد کو سمیٹے منڈی ہوئی پنڈلیاں ننگی کیے اس کے پاس بیٹھا کچھ ہدایات دے رہا تھا۔ قدرو اور مہرو گاؤ تکیوں پر بیٹھی لہسن چھیل رہی تھیں۔

"چودھری ہوری ہیں گھر؟"

"نہیں منشی جی۔ میری کوئی چٹھی نہیں آئی؟" مہرو جلدی سے بن کر بولی جیسے دو دن میں اسے پر لگ گئے ہوں۔

"تیری چٹھی کہاں سے آئے گی کشیے" قدرو نے جھٹ سے اس کا پتا کاٹ دیا۔ ساتھ کے کمرے سے بدرو نکل آئی۔ جس نے نہایت خوبصورت سوٹ پہن رکھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں خوشبو کی شیشی تھی جو وہ اپنے لباس پر چھڑک رہی تھی۔ کچھ خوشبو اس نے رانا پر چھڑکی اور بولی "منشی جی' کوئٹے کی سوغات لیتے جائیے۔ یہ چار سیب زہرہ مشتری کے گھر دیتے جائیں اور یہ دو آپ کا حصہ۔"

بدرو نے ایک پچھو میں سے چھ سرخ سرخ سیب نکال کر گلاب دین کو تھما دیے' جو اس نے اپنے چمڑے کے تھیلے میں اڑس لیے اور لمبے لمبے سانسوں سے خوشبو کی لپٹیں لیتا ہوا باہر نکل گیا۔

زہرہ و مشتری اپنی بیٹھک میں دو اجنبیوں کے ساتھ بیٹھی رمی کھیل رہی تھیں کہ گلاب دین نے جا کر سیب ان کے سامنے رکھ دیے۔ دونوں بہنوں نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا "منشی جی' دیگ چڑھی ہے ان کے گھر؟" زہرہ نے دلچسپی سے پوچھا۔

"میں نے نہیں دیکھی" گلاب دین نے جواب دیا۔

برآمدے میں ان کی سوتیلی بہن کے تو بڑے نے کروٹ بدل کر گلاب دین کی طرف دیکھا اور پھر پیٹھ موڑلی۔

اگلے دن ڈاک چھانٹتے وقت اسے زہرہ کے نام کی چٹھی ملی۔ وہ چاہتا تھا کہ بدرو یا قدرو کی چٹھی ملے تاکہ آج پھر ادھر کا پھیرا رہے۔

سہ پہر کو جب وہ ہاتھ میں زہرہ کی چٹھی لیے مکان میں داخل ہوا تو زہرہ اور مشتری میٹنی شو دیکھنے گئی ہوئی تھیں۔ رانا برآمدے میں ان کی بہن سے چہلیں کر رہا تھا جو اسے اپنی جتنی موٹی موٹی گالیاں دے رہی تھی۔

ادھر بھینس خریدنے کو رقم دے آیا ہے' ادھر بھینس کے چٹکی لے رہا۔ رانا استر انگل آدمی ہے یا بھینسوں کا سوداگر! گلاب دین یہ سوچتا ہوا باہر نکل آیا۔

تین روز بعد اسے اڑتی اڑتی ایک خبر ملی۔ اس نے سوچا' پنواڑی کی دکان اس کے سامنے ہے' اسی سے

تصدیق کرنی چاہیے۔

پٹواری بولا" جو تم نے سنا ہے ٹھیک ہے۔ رانا تو مہرو کے لیے تیار تھا مگر بدرو کی ماں نہیں مانی۔"

گلاب دین نے پوچھا" عبدالکریم اور قیم راضی تھے؟"

" قیم تو سردائیاں گھوٹ گھوٹ کر پلاتا تھا" پٹواری مسکرا کر بولا" جس کا مال اس کا گال منشی جی۔"

خوبصورتی کس طرح بیچی جا سکتی ہے۔ جسم کس طرح فروخت ہو سکتا ہے۔ وہ اس طرح کی باتیں سوچتا بھی جاتا' بازار میں چلتی پھرتی طوائفوں کو خالی ذہن سے دیکھتا بھی جاتا اور چھٹیاں بھی بانٹتا جاتا۔ اس نے اپنے کام سے کام رکھا اور کتنے ہی دن بدرو اور قدرو کے گھر نہ گیا۔ ایک روز اسے موتی بازار میں عبدالکریم ملا جس کی زبانی اسے معلوم ہوا کہ انہوں نے اب نئی بھینس خرید لی ہے۔ عبدالکریم نے کہا" کسی روز آنا ہمارے گھر جلسہ ہونے والا ہے۔"

ایک روز بدرو کے نام پانچ سو روپے کا منی آرڈر آ گیا۔ گلاب دین نے پڑھا۔ رانا حیات بخش نے کوئٹے سے بھیجا تھا۔ آخر میں لکھا تھا جلسے کے لیے روپیہ بھیج رہا ہوں۔ مجھے بھی اس دن یاد کر لینا۔

وہ چق اٹھا کر اندر گیا تو بدرو چارپائی پر لیٹی سگریٹ پی رہی تھی۔ آہٹ سن کر اٹھ بیٹھی" شکر ہے آپ بھی آئے منشی جی۔"

" کوئی خط ہی نہیں تھا۔۔۔۔۔۔۔"

" خط نہ ہو تو کیا آنا چھوڑ دینا تھا۔ اتے ہوری اتنا یاد کرتے تھے آپ کو۔"

کمروں میں سے عبدالکریم بھی نکل آیا۔ منی آرڈر کا سن کا سب کی باچھیں کھل گئیں۔ مہرو بھی چنگیر اٹھائے بھاگی بھاگی باہر چلی آئی۔

" اب منشی جی آپ ذرا کاغذ پنسل لے کر بیٹھ جائیں۔ کاکی اندر سے حقہ اٹھا لا۔"

مہرو نے حقہ لا کر باپ کے پاس رکھ دیا جس نے منہ میں نے لے کر گلاب دین کو دیگوں کا مسالا لکھوانا شروع کر دیا۔ گلاب دین کی حیرت دور کرنے کو عبدالکریم نے کہا" ہم مہرو کی کاکی کی خوشی کرنا چاہتے ہیں۔ قیم تو ناکارہ آدمی ہے۔ کل میں اور آپ جا کر سودا لے آئیں گے۔ نائی کو بھی ساتھ لے چلیں گے۔"

اس بات چیت میں قدرو اور بدرو بھی کبھی کبھی اپنی تجویز پیش کرتی تھیں۔ مہرو کچے فرش پر پالتی مارے لہسن چھیلتی رہی۔ گلاب دین نے اپنے کان پر اڑی ہوئی پنسل کو اٹھا کر جیب میں رکھتے ہوئے آج پوچھ ہی لیا۔

" اتنا لہسن کیا کرتے ہیں آپ؟"

قدرو نے کہا" ہمارے گھروں میں سالن اچھا پکتا ہے اور بہت آدمیوں کے لیے پکتا ہے۔ اس میں

ڈالا جاتا ہے۔"

بدرو بولی "ہم دن بھر کیا کام کریں۔ اسی طرح اماں کا ہاتھ بٹاتی ہوں۔" مہرو اپنی اہمیت دکھانے کے لیے اور تیزی سے لہسن چھیلنے لگی۔

"اللہ خیر رکھے۔ اب اتوار کو دیکھ لینا" عبدالکریم گلاب دین کے کندھے تھپتھپاتے ہوئے بولا۔

انہوں نے باسمتی چاول' خالص گھی اور مسالے کی پوٹلیاں تانگے سے اتار کر ڈیوڑھی میں رکھیں تو گھر میں کوئی بھی نہیں تھا۔ عبدالکریم کے کہنے پر گنجا بازار سے چائے کا ایک سیٹ لے آیا۔ وہ چائے کی چسکیاں لے رہے تھے کہ بدرو قدرو اور مہرو تینوں بنیں ٹھنی سجائی بیٹھک میں داخل ہوئیں۔ بدرو ہنس کر بولی "ابا جی ہم تو بلاوے دے آئے ہیں۔"

آج بدرو معمول سے زیادہ چنچل اور جاذب نظر دکھائی دے رہی تھی۔ قدرو کا بدن گدرایا ہوا تھا۔ اس کی ناک کی کیل بار بار چمک رہی تھی۔ اور مہرو پر بہار شباب کی رنگینیاں لیے اس کے ہمرکاب اس طرح تھی جیسے دھلی نکھری بدلیوں کے ہمرکاب بجلی کی کڑک۔

پروگرام یہ تھا کہ اتوار کو دوپہر کا کھانا اور رات کو گانا۔ گلاب دین کی طرف سے جب ڈھل مل اظہار ہوا تو عبدالکریم نے کہا "منشی جی' آپ کوئی اوپرے تو نہیں۔ ہمارے گھر میں آپ کو کون نہیں جانتا۔ اول تو ہم نے زیادہ لوگوں کو بلایا نہیں۔ یہ اڑوس پڑوس کے چند گھروں کو بلایا ہے۔ باقی رہا گانا تو وہ آپ کی مرضی ہے۔"

"حافظ صاحب نے کیا فرمایا ہے' قدرو پتر؟"

قدرو نے کہا "بے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید۔ کیوں ابا جی"

"کچھ نہیں پتر' منشی جی کو سگریٹ دو۔"

قدرو نے سگریٹ کی ڈبیا منشی کے آگے کر دی جس میں گلاب دین نے ایک سگریٹ نکال کر سلگایا۔

"بس آپ ڈاک بانٹ کر سیدھے ادھر ہی آ جائیں۔"

ہفتے کی شام کو نائی نے چولہا گاڑ دیا اور اتوار کی صبح کو اس کے دو ساتھیوں نے آ کام سنبھال لیا۔ جاوتری' لونگ' دار چینی اور زعفران کی خوشبو چاروں طرف پھیل گئی اور دیگوں میں بڑا کفگیر گڑ گڑ بجنے لگا۔

گلاب دین پیدائشی منتظم تھا۔ عبدالکریم نے استاد نورالدین اور منشی گلاب دین کو دیگوں کی نگرانی پر بٹھا دیا۔

بدرو کے سازندوں نے دالانوں میں کرائے کی چاندنیاں بچھا دیں۔ قیم اور اس کے دوستوں نے گاؤ

تکیے بچھا دیے۔ پھر آتشدان پر گلاب پاشیاں رکھ دیں اور پوچھنے لگا "آپا بدرو ٹھیک ہے؟"

اس نے کہا "ہاں جیتے رہو ٹھیک ہے۔"

"آپا سگریٹ کے لیے کچھ پیسے تو دے دو۔" بدرو نے دس روپے کا نوٹ دے دیا۔ وہ ادھر غائب ہوئی یہ تدرو کو لے آیا اور بولا "بی بی ہمارا انتظام ٹھیک ہے نا؟"

اس نے کمروں کا جائزہ لے کر کہا "ٹھیک ہے۔"

دوپہر ہوئی تو طوائفوں کی ٹولیاں آنی شروع ہو گئیں۔ انگلیوں میں سگریٹ لیے ہوئے' چھالیہ چباتیں' سرگوشیاں کرتیں' رنگا رنگ آوازیں' رنگا رنگ لباس' گورے چہرے' سنولائے چہرے' بھرے سینے' پتلی کمریں' دلبری کی تمام ادائیں اور غمزے' ابریشم و کمخواب کے تھانوں میں لپٹے ہوئے کچھ جوان' کچھ سرشار' کچھ ادھیڑ' دالان جیسے قمریوں اور کبوتریوں کی غٹرغوں سے چہک اٹھا۔ نور پلاؤ' شیرمال اور قورمہ بٹتا گیا۔ ایک آتا ایک جاتا رہا۔ زیادہ قریبیوں کے گھر کھانا پہنچا دیا گیا۔ اس ہجوم دلبراں میں گھرے ہوئے گلاب دین کی نیچے کی سانس نیچے' اوپر کی اوپر۔

مہمانوں کا بھگتان ہو چکا تو برتانے والوں کی باری آئی۔ پھر یہ سب کھا پی کر دالان میں بچھی چاندنی پر لیٹ کر سگریٹ کا دھواں اڑانے لگے۔ نائی اپنی دیگیں اور مجوے سنبھالنے لگا "پتا نہیں اپنے چھنی رساں کو کچھ دیا ہے یا نہیں؟"

استاد نورالدین بولا "بی بی نے چاول دیے تھے۔"

برآمدے میں سے بدرو بولی "میں نے دیے تھے ابا جی۔"

"ہمارے لیے ہمیشہ اچھی خبریں لاتا ہے۔"

رات کو جب گلاب دین پہنچا' مجلس سج چکی تھی۔ فیروزہ نے سلمے کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ اس کی سڈول کلائیاں سونے کی چوڑیوں میں پھنسی ہوئی تھیں۔ زہرہ نے ساڑھی کے ساتھ برائے نام سی چولی پہن رکھی تھی۔ جب ساڑھی کا پلو سرک جاتا تو سامنے سے اس کا کسا کسا پیٹ اور پیچھے سے چکنی چکنی کمر دکھائی دینے لگتی۔ مگن نے چوڑی دار پاجامے پر گھیر دار قمیص پہن رکھی تھی جیسے اکبر کے زمانے کی مغنیہ۔ جب چلتی تو جوتی کے ستارے اور قمیص کی گوٹ کے بادلے جھلمل جھلمل کرتے۔ ریشمی غرارے میں مشتری کے سرین چکی کے دو پاٹوں کی طرح رگڑ کھا رہے تھے۔ غرارے کو انہوں نے اس طرح بھر دیا تھا جیسے اس میں انڈے بلے گئے ہیں۔ مشتری کی چھوٹی بہن جو چند مہینے ہوئے آجا کا سبق لے رہی تھی آج پہچانی نہیں جاتی تھی۔ اس نے ماتھے پر جھومر لٹکا رکھا تھا۔ پلکوں کے تناؤ میں کئی اشارے اور کئی لگاوٹیں پل رہی تھیں۔ شعلہ جوالہ بنی ادھر سے

ادھر اپنا آپ دکھاتی پھر رہی تھی۔ بلو پھلجھڑی بنی ہوئی تھی۔ اس نے سینے پر دو پٹاخے باندھ رکھے تھے۔ اس کے کئی روپ تھے۔ مہتابی انار' پوپٹ' گول۔ لیکن بجلیاں نہیں تھیں۔ تمام بجلیاں آج بدرو کے حصے میں آ گئی تھیں جس کی لم جھڑی آنکھوں پر دراز پلکیں جھکی ہوئی تھیں اور نسوانیت کے ابریشمی پرتو سے چہرہ دمک رہا تھا۔ وہ پان الائچی کی طشتری لیے چاروں طرف تواضع میں جتی ہوئی تھی۔ قدرو ہونٹ میچ میچ کر باتیں کرتی تو اس کے ہونٹوں کی یاقوتی تراش اور بھی غضب ڈھاتی۔ وہ اپنی انگلیوں کی خفیف سی حرکت سے اپنے کٹے ہوئے بالوں کو گردن سے ہٹاتی تو یوں لگتا جیسے انگلیوں کی پوروں سے بلوریں شبنم کی پھوار پڑ رہی ہے۔

مہرو' مہرو ہی نہیں لگتی تھی۔ اس کی دنبالہ دار آنکھوں میں اتنی گھلاوٹ کہاں سے آ گئی تھی۔ چوکڑیاں بھرتی پھر رہی تھی۔ تنگ لباس میں اس کا انگ انگ نظر آ رہا تھا۔ چھوٹی سی ننھی اس کے بڑے بڑے ارمانوں اور ان کہے خیالوں کی چغلی کھا رہی تھی۔ اتنے میں ایک جوڑا اندر آیا۔ سرو قد لڑکی' چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی' سمٹے ہوئے ریشم کی طرح محفل میں داخل ہوئی۔ بڑی نزاکت سے ہاتھ کو قوس بنا کر سب کو آداب کیا۔

دالان کی دہلیز پر بیٹھے گلاب دین نے پوچھا "قیم جی یہ لڑکی کون ہے؟"

وہ اینڈتے ہوئے بولا "شمو' میری پھوپھی کی لڑکی۔ خواجہ صاحب کے گھر میں ہے۔"

گلاب دین کے سینے میں جیسے بہت سی سانس رکی ہوئی تھی۔ اس نے ایک لمبی سانس لی۔ وہ خواجہ کی کوٹھی میں چٹھیاں بانٹ چکا تھا۔ وہ انہیں جانتا تھا۔

سر راہ کھلے ہوئے سارے پھول سامنے کے رخ اکٹھے ہو گئے تھے۔ رنگا رنگ ہنستے کھیلتے دمکتے چہرے پھولوں کا گلدستہ بنے دکھائی دے رہے تھے۔ خار' گل کے ساتھ کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ خواجہ صاحب ان صوفوں پر جا بیٹھے جدھر مرد مہمان بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک طرف کو بیٹھ کر حقے کا دھواں اڑانے والے سازندوں میں سے ایک آدھ نے انہیں سلام کیا اور اپنے ساز لے کر قالینوں پر آ بیٹھے۔ سب سے پہلے آئے ہوئے رم خوردہ مشتری کی چھوٹی بہن الماس کو پکڑ کر بٹھایا گیا۔ اس کے گانے کے بعد شور مچا "بدرو' بدرو"

بدرو نے اپنی گھنی پلکوں کو اوپر اٹھایا' مردوں کی طرف مسکرا کر دیکھا۔ پھر محفل کا ایک نظر سے جائزہ لیا اور اپنی ریشمی شلوار کی کریز کو چٹکیوں میں تھام کر پائچے سنبھالتی بیچ میں آ بیٹھی۔ گلاب دین دہلیز پر اور اونچا ہو گیا۔ اس نے بدرو کو اس رنگ میں کب دیکھا تھا۔ یا الٰہی! بدرو کی آواز کا لہرا تھا یا رم جھم۔ ایک مہمان نے نوٹ نکالا۔

گلاب دین نے ساتھ والے سے پوچھا "کتنے کا ہے؟"

"دس کا"

گلاب دین کے سینے سے پھر ایک لمبی سانس نکلی جو دیر سے رکی پڑی تھی۔ وہ سوچنے لگا بدرو کے اعضا میں یہ چکیلا پن کہاں سے اترا آ رہا ہے۔ اس کی آواز نکھرتی جا رہی تھی۔ ایک نوٹ، دو نوٹ، تین، چار، پانچ.........."

"یہ کون لوگ ہیں؟"

اب خواجہ صاحب نے نوٹ دیا، پھر شمو نے، پھر خواجہ صاحب نے، پھر شمو نے۔ سب ہنسنے لگے۔

بدرو دو غزلیں گا کر بڑی نزاکت کے ساتھ اٹھ بیٹھی۔ اب گگ جی سے فرمائش ہوئی۔ گگ نے پکے راگ سے آغاز کیا۔ جب گلا کھنگالا گیا تو ساقی نامہ شروع کیا۔ آواز کا جادو ملاقاتیوں کے سر چڑھ کر نوٹ پر نوٹ دلوانے لگا۔ گگ نے جوش میں آ کر گھنگرو باندھ لیے تو سارے لوگ خوشی سے تالیاں پیٹنے لگے۔ اس نے بتاوے دے دے کر کس کس حسن ادا بنگی سے زاہد و محتسب کے چٹکیاں لیں۔ کس کس شان دلربائی سے کمر کو لچکا دے دے کر میکدے کے دروازے پر دستک دی کہ محفل کی محفل تڑپ اٹھی۔ بدرو نے اٹھ کر سینے سے لگا لیا اور بولی "گگ جی، زندہ باد!"

ایک کونے سے آواز آئی "ڈھولک" بلو نے چونکتے ہو کر اس طرف دیکھا جدھر سے آواز آئی تھی۔ بلو کے ملاقاتی نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر جتایا، تیرا نیاز مند ادھر بیٹھا ہے۔ بلو مسکرا دی۔ مہرو نے ڈھولک لا کر بلو کے سامنے رکھ دی اور الماس کو لے کر خود بھی ساتھ بیٹھ گئی۔ ڈھولک کیا بجی، وضع داریوں کے بند ڈھیلے پڑ گئے۔ بعض مہمان صوفوں سے اتر کر قالینوں پر آ بیٹھے اور چٹکیاں بجانے لگے، تھاپ دینے لگے۔ رنگ محفل ہی بدل گیا۔ ایک صاحب پہلے نوٹ دیتے رہے، پھر کمر پر ہاتھ رکھ کر ناچنے لگے۔ چک پھیریاں لیتے لیتے قدرو کے پاس جا پہنچے اور ہنستے ہنستے اسے کھینچ کر اپنے ساتھ لے آئے۔ شور مچا "شاباش! ٹھیک ہے۔" ان صاحب نے قدرو کے گھنگھرو باندھ دیے اور استاد کو اشارہ کیا۔ طبلے پر ہاتھ پڑا، تھی۔ قدرو نے اپنے یاقوتی ہونٹوں کی پنکھڑیوں کو بھینچ کر کلائی پر کلائی سے گرہ باندھی۔ ایڑی ٹھٹکی۔ آنکھوں میں رس اترا۔ پلکوں کا ریشمی تناؤ ستاروں کی طرح ٹوٹ ٹوٹ کر چاندنی میں گھلنے لگا۔ کائنات گردش میں آ گئی اور قدرو رنگوں کا پیکر بن کر گھومنے لگی۔

گلاب دین کے سینے میں اب کوئی رکی پڑی سانس باقی نہ تھی۔ وہ مجسم حیرت بنا دیکھ رہا تھا۔ اللہ غنی! یہ قدرو تھی۔ اس کے پاؤں تھے یا خط چھانٹنے کی خودکار مشین۔ بھاپ نکل رہی تھی۔ اس نے غور سے

دیکھا' ملازم محفل میں گرم گرم کشمیری چائے کے پیالے سینیوں میں رکھے پھر رہے تھے۔ چاروں طرف سگریٹوں کا دھواں پھیل رہا تھا۔ وہ ان رنگا رنگ آوازوں میں ابھی کچھ فیصلہ کرنے نہ پایا تھا کہ عبدالکریم اس کے پاس سے گزرتے گزرتے کہہ گیا "ابھی جانا مت۔"

رات بہت بیت چکی تھی۔ اس نے دو چار جمائیاں بھی لی تھیں' مگر چائے کے گرم گرم پیالے نے بدن میں پھر چستی پیدا کر دی تھی۔ ابھی اس کا پیالہ ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ محفل میں سے کسی نے الاپ کیا۔ وہ پھر اپنی جگہ آ بیٹھا۔ شمو کی بلوری انگلیاں ہوا میں ایک دائرہ بنا رہی تھیں اور اس کے گلے میں سے نور کی آواز نکل رہی تھی۔ ایک مہک چاروں طرف پھیل رہی تھی۔ لفظوں کو انتہا پر لے جا کر وہ اس سُکی اور آہستگی سے انہیں لوٹا دیتی تھی کہ سینوں میں دل ڈول جاتے اور محفل میں واہ واہ ہونے لگتی۔

اس کے بعد مشتری آئی۔ چہرے پر اک سلونا پن اور ان کہے خیالوں کی جھلملاہٹ۔ ناک میں فیروزے کی کیل' ہاتھ میں فیروزے کی انگوٹھی۔ اونچی کرتی کے نیچے گول گول رانوں کو غرارے میں سمیٹ کے بیٹھ گئی۔ ایک کونے سے آواز اٹھی "پنجابی"۔ اس نے ہولے سے استاد سے کچھ کہا اور ماہیا گانے لگی۔ ایک کے بعد دوسرا' دوسرے کے بعد تیسرا پنجابی گیت کی فرمائشیں جب پوری ہو چکیں تو بدرو اور گگ نے کہا "آپا فیروزاں۔"

فیروزاں نے سگریٹ کا ایک کش لے کر اسے مسل ڈالا۔ پھر اپنے لب لعلیں پر زبان پھیر کر کنجر خونچکاں کو آب دی اور سڈول کلائیوں میں چوڑیوں کو سنوارتی اٹھ بیٹھی۔ اس کے چہرے نگاہ پر ایک خاص تمکنت' وقار اور اعتماد تھا۔ معلوم ہوتا تھا کسی وقت میں بڑی بانکی عورت رہی ہو گی۔

کسی نے کہا "مرزا صاحباں" اس نے اس طرف ایک نگاہ غلط انداز ڈال کر کہا "اچھا"

رات کے سناٹے میں اس کی کھرج دار آواز بلندیوں کی خبر لانے لگی۔ جب مرزا کے بول دہرانے لگی تو جوش میں اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس سے بھی مطمئن نہ ہوئی تو دوپٹہ اتار کر پھینک دیا اور ہاتھ اٹھا کر لمبی لمبی تانیں اڑانے لگی جیسے راوی کی لہریں بپھر کر کناروں سے اچھل جائیں۔ صاحباں کے بول گاتے وقت آواز کو اس طرح سمیٹ لیتی جیسے لہروں پر چاندنی رات میں چھوٹے چھوٹے پھول پڑنے لگیں۔ وہ ٹوٹ سمٹتی جاتی اور محفل پر اپنی لوچدار آواز کا سحر پھونکتی جاتی تھی۔

ایک عجب بہار تھی جو ستاروں کی جھلملاتی روشنیوں کے ہمرکاب گزر گئی۔ مولوی گلاب دین اذان ہوتے ہی شاہی مسجد کے ایک دالان میں سے اٹھا اور حوض کے ٹھنڈے پانی سے وضو کیا۔ آج نماز پڑھنے میں اسے بڑا لطف آیا۔ خدا کے اس وسیع و عریض گھر میں اور گلاب دین کی کشادگئی دل میں بڑی مماثلت تھی۔ اس

نے لمبے لمبے سجدے کیے اور روانہ ہو گیا۔

اس نے آس پاس کے علاقے کی ڈاک تو دوپہر کو بانٹ دی' دو چٹھیاں جو اس طرف کی تھیں ان کو رکھ لیا کہ سہ پہر کو سہی۔ جب سہ پہر کو اس نے عبدالکریم کے گھر جھانکا تو سب سوئے پڑے تھے۔ اگلے روز جب گلاب دین نے چق اٹھا کر دیکھا تو سب لوگ بیٹھک میں لیٹے ہوئے تھے۔

''آؤ منشی جی' کیا حال ہے؟''

''میں کل آیا تھا۔ آپ سب سوئے پڑے تھے۔''

''برا حال تھا ہمارا۔ لڑکیاں تھک گئی تھیں۔ کیوں' اچھی رونق رہی' منشی جی؟'' عبدالکریم نے کہا۔

''او جی رونق! کمال ہو گیا۔ گنگ جی نے تو حد کر دی۔''

''ابھی تمہارے آنے سے دو منٹ پہلے گئی ہے۔ چار سو ہو گیا ہے اسے۔ لڑکیوں کو اپنے ساتھ بری امام لے جانے کو کہہ رہی تھی۔ پچھلے سال گئی تھی۔ بہت کچھ لے کر آئی تھی۔''

''پھر؟''

''پھر یہ بھی تیار ہو گئی ہیں۔''

بدرو تاش پھینٹتے پھینٹتے بولی'' جو اللہ کو منظور۔''

پندرہ روز تک تینوں کی ہر وقت توجہ کپڑے سلوانے پر رہی۔ درزی آتا تھا' جاتا تھا۔ گنجے کو ڈانٹ پر ڈانٹ پڑ رہی تھی۔ آخر استادوں نے لچے باندھے اور تینوں بہنوں کو لے کر دس دن کے لیے بری امام کے میلے پر چلے گئے۔

عبدالکریم کو ان کے خط کا بڑا انتظار رہا۔ گلاب دین خط لایا تو عبدالکریم حقے کی نے منہ میں سے نکال کر بولا'' تم سے کون سا پردہ ہے۔ پڑھ کر بھی سنا دو۔''

بدرو نے خط میں لکھا تھا کہ پنڈی پہنچ کر خیریت کے ساتھ نور پور پہنچ گئے ہیں۔ جہاں دو کمروں کا اچھا ڈیرہ مل گیا ہے۔ رات کو چوکی دیں گے تو اندازہ لگ سکے گا کہ میلہ کیسا جائے گا۔ ویسے میلہ بہت بھر رہا ہے۔ چاروں طرف سے طرح طرح کی گانے والیاں آئی ہیں۔ کچھ ابھی آ رہی ہیں۔ سنا ہے یہ میلہ اگلے سال نہیں لگے گا۔ فقط آپ کی بیٹی بدر۔

دوسرا خط آیا جس میں لکھا تھا کہ خدا کے فضل و کرم سے میلے کے ساتھ ہم بھی بہت اچھے جا رہے ہیں۔ پانچ دن کی آمدنی چار ہزار ہوئی ہے جو استاد جی آج پنڈی جا کر روانہ کر رہے ہیں۔ ہم اٹھارہ انیس کو لاہور پہنچ جائیں گے۔ ہمارے آنے سے پہلے صوفوں کا کپڑا بدلوا لیں۔ صوفوں کے پیر رنگ بھی ڈھیلے ہو چکے

ہیں' وہ بھی ٹھیک کرالیں بلکہ صوفے ہی نئے خرید لیں۔ پردے بھی نئے ڈلوالیں۔ سستی نہ کریں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ مہرو پر ایک گنڈ پٹھان عاشق ہو گیا ہے۔ آپ نئے آتروائی اس سے جو مانگیں گے دے گا۔ میں نے اور قدرو نے کہا یہ پردیس ہے آپ لاہور آ کر ہمارے مہمان ہوں۔ وہاں ہم آپ کی خدمت کریں گے۔ کہتا ہے ہم کو کیا کھلائے پلائے گا۔ قدرو نے کہا جو آپ کہیں۔ بولا استاد جی ہم کو بس شربت وصال پلا دو۔ ہم بہت پیاسا ہے۔ استاد جی نے کہا' خان صاحب آپ آئیں تو ہم آپ کو شربت وصال کے کنویں میں ڈبکیاں دیں گے غوطے کھلائیں گے۔ مہرو کے سر پر ہمیشہ سو سو روپے کے نوٹ رکھتا ہے۔ صدقے اور قربان ہو ہو جاتا ہے۔ مہرو بھی اس سے بڑے نخرے کروا رہی ہے۔ گگ کے نوکر کو پولیس پکڑ کر لے گئی ہے کیونکہ اس نے چاقو مار کر کسی کی انتڑیاں نکال دی تھیں۔

عبدالکریم نے چار ہزار کے بنک ڈرافٹ کا رجسٹری لفافہ گلاب دین کے ہاتھ سے وصول پایا تو اگلے دن ہی قیم جا کر نئے ڈیزائن کے صوفے اور پردوں کا کپڑا لے آیا۔ بیٹھک میں سفیدی ہو گئی۔ شیشے والی دیوار گیریوں پر پالش پھر گیا۔ نئے شیشے لگ گئے۔ ڈبی بازار سے کاریگر بلوا کر مین چھت سے لٹکے ہوئے پرانے جھاڑ فانوس کی صفائی کرا دی گئی۔ سارا گھر اجلا ہو گیا۔

لڑکیاں دفتر کی صبح کو آ رہی تھیں اور دفتر کو ہی پوسٹ آفس کے پچھواڑے والی عمارت کے لمبے کمرے میں چہل پہل دکھائی دے رہی تھیں۔

سپروائزر نے پوسٹ ماسٹر سے کہا "گلاب دین کچھ عرض کرنا چاہتا ہے۔"

"کیا عرض کرنا چاہتا ہے۔ یہ ہر سال؟......بلا" پوسٹ ماسٹر نے چڑ کر سپروائزر سے کہا۔

دوسرے لمحے گلاب دین پوسٹ ماسٹر کے سامنے کھڑا تھا جو فائل پر نظریں جھکائے کہہ رہا تھا "یہ تمہاری پچھلے سال والی عرضی میرے سامنے پڑی ہے۔ تمہاری منشا کے مطابق تمہاری تبدیلی اب ہیرا منڈی سے واپس مصری شاہ کر دی گئی ہے۔ اب تم کیا عرض لے کر آئے ہو"

"حضور میری صرف اتنی عرض ہے کہ مجھے یہیں رہنے دیا جائے......"

پوسٹ ماسٹر نے فائل پر سے نظر اٹھا کر گلاب دین کو حیرت سے دیکھا اور بولا "کیا کہا؟"

گلاب دین کی ڈاڑھی غائب تھی لمبی سی ٹھوڑی نکلی ہوئی تھی اور موٹے موٹے ہونٹوں کے اوپر مونچھوں کا ہلکا ہلکا ابھار تھا

---

## احمد ندیم قاسمی

# کنجری

سرور گھر میں داخل ہوا تو ایک بہت بھاری خبر کے بوجھ سے اس کی کمر ٹوٹی جا رہی تھی' گلے کی رگیں پھول رہی تھیں' جیسے باتیں اس کے حلق میں آ کر اٹک گئی ہوں۔ اس کی بہت اندر تک دھنسی ہوئی آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔ ہونٹ کھلے تھے کیونکہ بات شروع کرنے سے پہلے بند ہونٹوں کا وقفہ خبر کے بھاری بھرکم پن میں حارج ہو سکتا تھا۔ "اماں" وہ چھپر تلے بیٹھی ہوئی بڑھیا کو دیکھ کر پکارا اور اس کے قریب پہنچنے تک بولتا ہی چلا گیا "وہ برساتی نالے سے پرے محلے میں جولڑکی رہتی تھی نا؟ بیگماں؟ جسے پہلی بار دیکھ کر تم نے بے ساختہ کہا تھا کہ چاہے تو بڑے ٹھاٹ کی کنجری بن سکتی ہے"۔ "ہاں ہاں' ہاں ہاں" بڑھیا پیڑھی سمیت اچھل کر ایک قدم آگے آ گئی اور سرور نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے اپنے بیان کو جاری رکھا۔ "وہ جو تمہارے خیال میں بیٹی کمال خاتون سے ہوبہو ملتی ہے"۔ اس نے کنکھیوں سے کمالاں کی طرف دیکھا جو چولھے کے پاس اپلوں کے دھوئیں میں لپٹی بالکل ایک پرچھائیں سی معلوم ہو رہی تھی اور بڑھیا نے خاموشی کے اس خلا کو پر کیا۔۔۔۔۔ "ہوبہو کہاں کہا تھا میں نے؟ ہماری کمال خاتون جیسی آنکھیں اس کے نصیبوں میں کہاں! یہ آنکھیں تو سمندر ہیں۔ شمشاد اور تو بہار کی آنکھیں سارے ملتان میں اپنا جواب نہیں رکھتیں' پر ہماری بیٹی کی آنکھوں کے سامنے وہ آنکھیں بھی پانی بھریں اور پھر ہماری کمالاں کے اوپر کے ہونٹ کی محراب اور نیچے کے ہونٹ کی کمان! میرا تو کئی بار جی چاہا کہ ہندو عورتوں کی طرح اپنی کمالاں کی ہر صبح آرتی اتارنے لگوں۔ بیگماں اچھی ہے۔ بات چیت' چال ڈھال میں قدرت نے بڑا نفیس اور بہت اونچے درجے کا رنڈی پنا بھر دیا ہے' پر ہماری کمالاں جیسا سجاؤ کہاں اس میں"۔۔۔۔۔۔ بڑھیا کی باتوں کے دوران میں سرور اسی طرح کنکھیوں سے کمالاں کو دیکھتا رہا اور کمالاں جلتے ہوئے اپلوں میں دستپنا ٹھونس ٹھونس کر ہر طرف پھوہڑ پنا سے آگ بکھیرتی رہی۔ اور جب بڑھیا ڈلی پھانکنے کے لیے رکی تو ٹوٹے تار کو سرور نے بڑی پھرتی سے جوڑا۔ "تو اماں وہی بیگماں رات کو اس مشہور تیز دہانز زمیندار کے ساتھ بھاگ گئی؟ جس کے۔۔۔۔۔" بڑھیا پیڑھی سمیت اچھل کر سرور کے گھٹنے سے آ ٹکرائی۔ "بھاگ گئی؟ اے سبحان اللہ میں نہیں کہتی تھی؟ شاباش ہے اس کے

دادے پردادے کو اور لعنت اس کے باپ پر جو سکول کے سوکھے سڑے ٹوٹے' جڑے منشی کی ہڈیوں سے باندھنے چلا تھا۔ واہ! کس کے ساتھ بھاگی؟۔۔۔۔" بڑھیا نے کمالاں کی طرف دیکھا جو بجھے بجھے چولہے میں برابر پھونکیں مارے جا رہی تھی اور کڑوا رلا دینے والا دھواں بہت گاڑھا ہو رہا تھا سرور بولا "اس زمیندار کے ساتھ جس کے بارے میں اماں تم نے ہی تو کہا تھا کہ تصویر اتارنے والی مشین کے سامنے بیٹھ کر آنکھ بھر کر دیکھے تو مشین کا شیشہ تڑ سے ہو جائے" اب کے بڑھیا پیڑھی پر سے اٹھ کھڑی ہوئی اور ٹہلتی ہوئی بولی "معلوم ہوتا ہے شیرنی کا دودھ پیا ہے بیٹا ماں نے بھی سرو بیٹے ایسی ہی لڑکیوں کے دم سے دنیا کی بہار قائم ہے ورنہ ان شریف زادیوں کا بس چلے تو دنوں میں گاتی گنگناتی دنیا کو قبرستان بنا کر رکھ دیں۔۔۔ بابا۔ لگتا ہے میں دس برس اور جیوں گی۔ رگوں میں خون ناچنے لگا ہے۔ جیو میرے سرو کیسی گھی میں تڑتڑاتی خبر لائے ہو تم۔۔۔۔ کیوں کمالاں بیٹی؟ تمہارا کیا خیال ہے؟"

اور کمالاں نے ہنڈیا کو چولہے پر سے کچھ ایسا جھٹکا دے کر اٹھایا کہ چلو بھر پتلی دال اچھل کر اپلوں پر گری اور سانپ کی طرح پھنکار کر رہ گئی۔ بڑھیا نے مسکرا کر سرور کو دیکھا اور سرور نے مسکرا کر کہا "کچی ہے ابھی"۔۔۔ کمالاں کو دروازے پر ٹھٹکتے دیکھ کر بڑھیا فوراً بولی "دال نا؟"۔ اور جب کمالاں ہنڈیا لیے اندر چلی گئی تو دونوں ماں بیٹا منہ پر ہاتھ رکھے ہنسنے لگے اور پھر سرور نے افیم کی ایک بڑی گولی کی دو گولیاں بنا کر ایک کو بڑھیا کی ہتھیلی پر رکھ دیا "ہاں" وہ بولی "آج ہی تو سانولی رانی کو چکھنے کا مزہ آئے گا"

یہ تڑتڑاتی ہوئی خبر کمالاں کے لیے نئی نہیں تھی' اس کا باپ اور دادی تقریباً روزانہ اسی قسم کی خبریں ڈھونڈ ڈھانڈ لاتے تھے اور انہیں کمالاں کے سامنے کچھ یوں مزے لے لے کر بیان کیا جاتا کہ بعض وقت تو کمالاں تک چونک کر پوچھ بیٹھتی تھی "پھر کیا ہوا بابا؟" اور سرور جواب میں کہتا "پھر کمال خاتون بیٹا! لڑکی نے گاؤں بھر کے سامنے اکڑ کر کہہ دیا کہ وہ اپنی یاری نہیں توڑے گی' بھائیوں کا حلقہ توڑ کے بھاگی اور اپنے یار سے چمٹ کر رہ گئی۔ ہیر کو تو وارث شاہ نے خواہ مخواہ اچھال دیا ہے میں اس نگری کا بادشاہ ہوتا تو اس لڑکی کا وظیفہ لگا دیتا۔ اماں کی قسم"۔۔۔۔ کمالاں یہ باتیں سن کر جھینپ جاتی' پھر سونے سے پہلے بستر پر کروٹوں کے درمیان سوچتی اور سوچتے سوچتے کبھی اس پر چھاج بھر ستارے برس پڑتے کبھی چولہا بھر انگارے۔

کمالاں کا دادا سہراب خاں گاؤں کا خاصا کھاتا پیتا دکاندار تھا کہتے ہیں پنجاب کا لاٹ سر میلکم ہیلی جب اس گاؤں میں ٹڈیوں کے انڈے دیکھنے آیا تھا تو سہراب خاں نے لاٹ صاحب کے سامنے گاؤں کے کنوئیں میں کھانڈ کی اکتیس بوریاں انڈیل دیں اور اگلے سال خاں صاحب کا خطاب پایا۔ مگر جانے اس پر کیا افتاد پڑی کہ یہ خاں صاحبی اسے بڑے بڑے شہروں میں لے گئی اور ایک روز گاؤں والے کیا دیکھتے ہیں

کہ خاں صاحب سہراب خاں پچاس برس کی عمر میں ایک نئی بیوی لیے گاؤں میں داخل ہو رہا ہے۔ کھسر پھسر ہوئی مگر سارے گاؤں کی ایک ٹھاٹ دار دعوت شکوک و شبہات کو بہا لے گئی۔ البتہ ایک برس کے بعد جب نئی بیوی کے بطن سے سرور پیدا ہوا تو دایہ نے ایک عجیب ہوائی اڑا دی۔ یہ دایہ بھی کسی زمانے میں ملتان ہی سے بیاہ کر آئی تھی۔ اس نے شوشہ چھوڑا کہ سہراب خاں کی نئی بیوی تو ملتان کی مشہور طوائف زرتاج ہے جو وہاں تاجی کے نام سے مشہور تھی اور بلوچستان کے کئی وڈیروں اور سندھ کے کئی جاگیرداروں کے پہلو گرما چکی تھی۔ ''میں نے تاجی کو نواب رن مست خاں کی حویلی میں ناچتے دیکھا ہے لوگو!'' دایہ جگہ جگہ یوں چلاتی پھری جیسے اس راز کو فاش نہ کیا تو اس کا دم گھٹ جائے گا۔ ''اپنی اولاد کی قسم کھاتی ہوں کہ یہ خاں صاحبنی وہی تاجی ہے کنجری''۔

اور یہ لفظ سارے گاؤں میں گونج گیا۔ ''کنجری۔ کنجری'' سہراب خاں کی دکان اجڑ گئی وہ دکان کا سامان اٹھوا کر گھر میں روپوش ہو گیا۔ پائی پائی تک کا محتاج ہو گیا تو رات کی رات گاؤں سے بھاگا اور کہتے ہیں کہ لائل پور میں کسی وکیل کا منشی ہو گیا۔ سرور ابھی دس برس ہی کا تھا کہ خاں صاحب سہراب خاں اپنے گاؤں والوں کو گالیاں دیتا چل بسا۔ تاجی سرور کی انگلی پکڑے پھر سے گاؤں میں آئی اور سیدھی بھری چوپال میں داخل ہو گئی کہتے ہیں کہ اس نے رو رو کر گاؤں کے سامنے تقریر کی اور قسمیں کھا کھا کر کہا کہ وہ کنجری ضرور تھی مگر اب برسوں سے توبہ کر چکی ہے اب وہ ایک دکھی بیوہ ہے اور خدا کے بعد یہ دس برس کا لڑکا اس کا سہارا ہے کیا یہ گاؤں جس پر اس لڑکے کے ابا کے بے شمار احسان ہیں انھیں اپنے گھر میں سر چھپانے کی اجازت نہیں دے گا؟ لوگوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور آنکھوں آنکھوں میں فیصلہ کیا کہ کوئی خاص ہرج نہیں ہے' گاؤں میں تاجی نے کوئی دس برس بڑے امن سے کاٹے اور وہ بڑے پر امن طریقے سے نوجوانوں اور نوعمر لڑکیوں کے درمیان یاریوں اور دوستیوں کے تانے بانے بنتی رہی اور اپنا پیٹ پالتی اور نشہ پورا کرتی رہی۔ پھر جب سرور جوان ہو گیا تو اس کے لیے کسی اور گاؤں میں ایک غریب سی لڑکی بھی چن لی بیاہ ہوا اور سال بھر کے بعد کمال خاتون پیدا ہوئی مگر زچگی کی حالت میں سرور کی بیوی مر گئی۔ وہ لنا سا رہنے لگا اور پھر نہ جانے اس کے من میں کیا سمائی کہ چند روز بعد ہی گاؤں چھوڑ کر ملتان بھاگ گیا۔ تاجی کمال خاتون کو مختلف ماؤں کے ہاں لیے پھری کہ وہ اسے چند مہینے دودھ پلا دیں اور اس کی دعائیں لیں۔ لیکن اس دوڑ دھوپ میں اسے معلوم ہو گیا کہ وہ تو اب تک کنجری ہے' ایک رات کمال خاتون کو ایک کپڑے میں لپیٹا' گاؤں کے مولوی صاحب کے دروازے پر رکھا اور گاؤں سے بھاگ گئی۔ پانچ چھ برس تک ماں بیٹا ملتان میں کوکین کی تجارت کرتے رہے۔ چنڈو خانے بھی کھول لیے اور ڈیرہ اسماعیل خاں سے چرس لا لا کر بھی بیچتے رہے مگر سرور

ایک بار چرس لاتے ہوئے پکڑا گیا اور ایک برس کے لیے جیل چلا گیا۔ تاجی سے کاروبار سنبھل نہ سکا اور جب سرور جیل سے رہا ہوا تو وہ اس نتیجے پر پہنچ چکی تھی کہ بہترین تجارت لڑکیوں کی ہے۔ ایک لڑکی بھی چکلے میں بٹھانے کو مل جائے تو اس کی آمدنی سے چاہو تو موٹر تک خرید لو۔ ایک سال تک سارے پنجاب میں کسی آوارہ لڑکی کی تلاش میں بھٹکتے پھرے مگر کوئی بھی اس کے ہتھے نہ چڑھی آخر ایک روز جلال پور جٹاں کے ایک ہوٹل میں کھانا کھاتے ہوئے تاجی کا نوالہ اس کے منہ تک جاتے جاتے رک گیا اور وہ بولی "سرو بیٹے! وہ ہماری کمال خاتون زندہ ہوئی تو اب کے برس کی ہوگی؟" سرور ہڈی سے گودا نکالنے کی کوشش میں تھا۔ چونک کر بولا "ارے! آخر تم نے پہلے کیوں یاد نہیں دلایا اماں؟ وہ تو اب یوں سمجھو کہ کوئی سات آٹھ برس کی ہو گی۔ پانچ چھ سال کے اندر اللہ نے چاہا تو۔۔۔" اور اس نے زور سے چٹکی بجائی' تاجی نے کھانا وہیں چھوڑ دیا۔ اٹھ کھڑی ہوئی اور کمالاں کی یاد میں رونے لگی۔ ماں بیٹا افیم کی کافی مقدار شہر بہ شہر تول تول کر کے خریدتے ہوئے اپنے گاؤں میں آئے تو مولوی صاحب نے خدا کا شکر ادا کر کے آٹھ برس کی کمالاں ان کے سپرد کر دی اور جب روتی چلاتی کمالاں گھر میں آتے ہی مصلے بچھا کر نماز پڑھنے لگی تو بڑھیا اور سرور مکان کے ایک گوشے میں جا کر منہ پر ہاتھ رکھے دیر تک تکتے رہے اور کہتے رہے "پیڑ کا رخ غلط ہے تنے میں رسہ ڈال کر اسے سیدھا کرنا پڑے گا!"

تنے میں بار بار رسہ ڈالا گیا مگر کچھ دیر بعد پیڑ جھک جاتا اور رسہ تڑ سے ٹوٹ جاتا پیڑ کا رخ معین ہو چکا تھا۔ کئی بار تو ماں بیٹا مایوس ہو کر کمالاں کو پھر سے مولوی صاحب کے حوالے کر کے ہمیشہ کے لیے ملتان جا بسنے کا فیصلہ کر لیتے مگر پھر کمالاں سر پر گھڑا رکھے آنگن میں داخل ہوتی اور بڑھیا کہتی "دیکھ دیکھ سرو بیٹے! ذرا دیکھ تو اس بڑھتی ہوئی قیامت کو قد کیسا سرو سا ہو رہا ہے اور چال میں کتنی مستی ہے ہونٹ دیکھو لگتا ہے اللہ نے اپنے ہی ہاتھ مبارک سے تراشے ہیں اور آنکھیں یہ تو سمندر ہیں۔ ملتان کا ملتان ڈوب مرے گا اس میں اس روز چکی پیس رہی تھی اور ساتھ ساتھ گا بھی رہی تھی اور تمہارے سر کی قسم میں کبھی گلگتے والی کو ہر جان بھر زندہ ہوگئی ہے۔ آواز میں وہ قدرتی مرکیاں اور تھرتھریاں ہیں کہ میں کہتی ہوں ہز ماسٹر وائس چالیس پچاس پچاس ہزار میں ایک ایک ریکارڈ بھر دائے گا اس سے اور وہ بھی ناک سے لکیریں کھود کر۔ میں تو نہیں جاؤں گی ملتان میں تو اس کو لے کے جاؤں گی وہاں۔"

کمالاں کا بلوغ بالکل عید کا چاند ہو کر رہ گیا تھا اگرچہ مصلے پھٹ جانے کے بعد دوسرا مصلے مہیا نہ ہو سکا مگر کمالاں دن میں ایک دو بار اپنی کسی دھلی ہوئی چادر یا چولے پر نماز پڑھ ہی لیتی تھی۔ پھر یہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ شروع شروع میں وہ دادی اور ابا کی باتیں سن سن کر یوں چلا اٹھتی تھی جیسے نیند میں ڈر گئی ہے۔ کئی بار

اس نے مولوی صاحب سے شکایت کر دینے کی بھی دھمکی دی مگر دادی نے اسے سمجھایا "تم نہیں جانتیں بیٹا۔ جب تم خود بھی بڑی ہو جاؤں گی نا تو ایسی ہی باتیں کرو گی۔ خود مولوی صاحب بھی ایسی ہی باتیں کرتے ہوں گے۔ بچپن میں تم گڑیا سے کھیلی ہو گی پر اب تو نہیں کھیلتی نا؟ آج سے دو سال پہلے تم کنویں سے ایک ذرا سی گگریا بھر کر لاسکتی تھی۔ آج دو گھڑے سر پر رکھے ہرنی کی سی قلانچیں بھرتی ہوئی لاتی ہو؟ تو یہ دنوں کا پھیر ہے میری جان۔ پھر اب بس چند مہینوں ہی میں تم دیکھو گی کہ تمہیں راتوں کو نیند نہیں آتی' جاگنے میں تمہیں مزا آئے گا اور اندھیرے میں تم کچھ ٹٹولنے کی کوشش کرو گی اور کچھ نہ پا کر اداس ہو جاؤ گی' سمجھ گئیں میری رانی؟ بس اب چند مہینوں کی بات ہے۔"

"بس اب چند مہینوں کی بات ہے!" بڑھیا سرور کو اطلاع دیتی۔

اور سرور ناک بھوں چڑھا کر کہتا "یہاں ایک ایک دن مہینہ ہو رہا ہے اور تم کہتی ہو کہ بس چند ہی مہینوں کی بات ہے تم بھی کمال کرتی ہو اماں ذرا سا افیم کا کاروبار چل رہا تھا پر یہ پولیس اور آبکاری والے بہت دور دور کی بو سونگھنے لگے ہیں۔ جس کے ہاتھ میں افیم بیچتا ہوں وہ پولیس کا مخبر لگتا ہے۔ مہینے میں کل پندرہ بیس کی بکری ہوتی ہے۔ اب بتاؤ ان پندرہ بیس میں ہم دونوں اپنا نشہ پورا کریں یا کھائیں پئیں اور اوڑھیں پہنیں۔ ویسے بھی دل کچھ ہولا یا سار ہتا ہے' سوچتا ہوں کمالو چکلے کے لائق نہیں' اس کی آنکھوں میں جو سادگی کی چمک ہے نا اماں وہ نہ میں نے تمہاری شمشاد میں دیکھی نہ نوبہار میں۔"

بڑھیا بیٹے کی باتیں سن کر ہنس دیتی "ارے پگلے کہیں تو بھی تو مولوی نہیں بنا جا رہا؟ یہ سادگی کی چمک کس کی آنکھوں میں نہیں ہوتی' ہوتی تو ہے پر غائب ہو جاتی ہے بجھے ہوئے چراغ کو دیکھ کر یہ بھی تو سوچا کہ یہ بھی کبھی جلا اور چمکا ہو گا۔ پگلا آج کی افیم لا۔"

دونوں کمالاں کی جوانی کی یوں راہ تک رہے تھے جیسے چائے کی کیتلی کو چولہے پر رکھ کر پانی کے ابلنے کا انتظار کیا جاتا ہے اور یہ پانی اس روز ابلا جب کنویں پر جاتی ہوئی کمالاں کو ایک کسان قادرے نے چھیڑ دیا۔ وہ اس کے پیچھے چلتا رہا اور جب کمالاں کا پاؤں کسی گڑھے میں یا کسی کنکر پر پڑتا تو وہ کہتا' حسبی اللہ حسبی اللہ" کمالاں بہت دیر کے بعد اس دعائیہ کلمے کی تکرار سے چونکی۔ پلٹ کر بولی' اپنی بہنوں کو جا کر چھیڑ" نوجوان مسکرا کر بولا "میرے تو سب بھائی ہی بھائی ہیں مہربان" کمالاں نے کڑک کر کہا "تو پھر اپنی ماں سے عشق لڑا" نوجوان ہنس کر بولا "وہ تو مر چکی ہے پیارو" کمالاں آپے سے باہر ہو گئی۔ قادرے کو وہ بے بھاؤ کی سنائیں کہ آن کی آن میں کنویں کی جگت خالی ہو گئی۔ لڑکیاں کٹک کو بھاگ گئی آئیں۔ قادرا ایک گرد دور نکل گیا اور وہاں سے پکارا "آخر کنجری ہو نا کنجری" ---- وہ لڑکیاں جو مارے ہمدردی کے کمالاں کے پاس جمع ہو گئی

تھیں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرائیں' ٹھٹکیں اور پھر زور سے قہقہے مارنے لگیں۔ کمالاں نے گھڑے زمین پر دے مارے اور روتی چلاتی واپس گھر آ گئی۔ پہلے تو دیر تک بلک بلک کر روتی رہی۔ پھر دادی اور ابا کی تسلیوں کے سہارے آنسو پونچھ کر بڑی رقت اور سوز سے سارے حادثے کی کیفیت بیان کی اور جب آخر میں غصے میں گھڑے توڑ دینے کا ذکر کیا تو دلاسہ پانے کی خاطر دادی کو دیکھا اور دادی کھلکھلا کر ہنس پڑی' حیران ہو کر ابا کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ذرا سا غصہ تھا جو آنکھیں ملتے ہی کافور ہو گیا اور جب بڑھیا نے اس سے مخاطب ہو کر کہا "چراغ بہت بری طرح بھڑک اٹھا ہے۔ سرو بیٹے" تو دونوں ایک ساتھ ہنس دیئے۔

اس روز سے کمالاں ایک دم سے بدل گئی' کنویں پر جا کر گھر میں سنی ہوئی باتیں ایسے جوش سے سناتی جیسے کسی سے انتقام لے رہی ہو۔ نو عمر لڑکیاں سنتیں لیکن جھینپ جھینپ جاتیں اور بڑی بوڑھیاں ایک دوسرے کے کانوں پر منہ رکھ کر کہتیں "آخر کنجری ہے نا کنجری" یہ سب کچھ سن کر بھی کمالاں کے تیور نہ بدلتے اور وہ اغوا اور آشنائیوں کی کہانیاں بڑے ٹھسے سے سناتی چلی جاتی۔ گھر آتی تو دادی اور ابا سے نئی خبر سنانے کا تقاضا کرتی اور منہ کھول کر بڑی بے حیا ہنسی ہنسنے کی کوشش کرتی' بڑھیا تاجی اور سرور یہ آثار دیکھ کر خوش ہوتے اور جب کمالاں سو جاتی تو بہت رات گئے تک مستقبل کے بارے میں باتیں کرتے رہتے "ہولے ہولے ایسی سدھائی ہے کہ ملتان پہنچے گی تو دوسری شاندار کنجریوں کے کلیجے دھک سے رہ جائیں گے' دیکھ لینا بیٹا" بڑھیا ہوائی قلعے تعمیر کرتی رہتی ان قلعوں کے دریچوں میں بیٹھی ہوئی بنی ٹھنی کمالاں اسے ہنستی مسکراتی اشارے کرتی اور آنکھیں مارتی نظر آتی اور پھر وہ بے قرار ہو کر اٹھتی' "اے ہے کیسا جی چاہ رہا ہے اپنی رانی بٹیا کو ایک نظر دیکھنے کے لیے" وہ سوئی ہوئی کمالاں کے پاس آ کر اسے مسکرا مسکرا کر بڑے غور سے دیکھتی۔ پھر اس کی ایک لٹ کو اس کے چہرے پر ڈال کر بیٹے کو پکارتی "ذرا ادھر تو آنا سرو بیٹے' دیکھنا تو اپنے بچی کو' تیری قسم اگر میں مرد ہوتی تو تیرے سامنے دس ہزار روپے رکھ کر اس کی مینڈھی کھلواتی" پھر وہ اس کی بلائیں لیتی اور رات بھر موٹروں' گدگدے بستروں اور کوکین کے نشوں کے خواب دیکھتی رہتی۔

لیکن کمالاں ایک روز پھر سے بدل گئی۔ کسی نے اسے بتایا کہ جس قادر نے اسے چھیڑا تھا وہ ایک نوجوان کے ہاتھوں پٹ گیا ہے۔ کمالاں پر اس خبر نے کوئی خاص اثر نہ چھوڑا مگر جب کہنے والی نے کہا کہ "تیرے نام پر لڑائی ہوئی۔ قادر تیرے بارے میں ننگی ننگی باتیں کر رہا تھا کہ ایک دم ابراہیم اس پر ٹوٹ پڑا اور دھنک کر ڈال دیا۔ ابراہیم کو تم جانتی ہو نا؟ اری یہی ابرو فوجی۔ تو کمالاں کو گھرکی سی آ گئی اور اس کے بعد وہ احساس جمال اور احساس محبت کی سنجیدگی میں لپٹی رہنے لگی۔ ماں بیٹا کمالاں کے کردار کی اس دھوپ

چھاؤں سے گھبرا سے گئے لیکن اپنی ریاضت میں کمی نہ آنے دی۔ افیم کی گولی ذرا سی موٹی ہو گئی اور جمائیوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا مگر کمالاں کی جوانی پر تکیہ لگائے رکھا۔ کمالاں اگر اب منہ پھاڑ کر نہیں ہنستی تھی اور ان سے لڑکی کی حرکتوں اور لڑکے کی صورت شکل کے بارے میں کرید کرید کر نہیں پوچھتی تھی تو گھی میں تر تراتی خبریں سن سن کر روتی اور جھلاتی بھی نہیں تھی۔ ایک روز ابراہیم فوجی کو گلی میں جاتے دیکھ لیا تو بغیر سوچے سمجھے مسکرانے لگی۔ جواب میں ابراہیم بھی مسکرا دیا تو وہ ایک دم سنجیدہ ہو کر گھر آ گئی۔ رات کو حالات کا جائزہ لینے کے بعد بڑھیا اور سرور سونے لگے تو انہوں نے مدتوں کے بعد کمالاں کو "رگی" میں گاتے سنا۔ دونوں ایک ساتھ بستروں پر اٹھ بیٹھے اور دم سادھے اس کا گیت سنتے رہے اور جب گیت ختم ہوا تو بڑھیا نے چپکے سے کہا' چوٹ لگی ہے' صاف چوٹ لگی ہے' تمہاری ہی قسم بیٹا' چوٹ نہ لگے تو آواز میں پینگوں کا سا یہ اتار چڑھاؤ مشکل ہی سے آپاتا ہے آہا! لطف آ گیا!" امیدوں کے پھول جنہوں نے اب تک سر نیہوڑا لیا تھا تر و تازہ ہو کر سر بلند ہو گئے اور کمالاں کی آواز کے ہلکوروں میں جھومنے لگے۔

ہولے ہولے جب تقریباً روزانہ کمالاں اور ابراہیم آپس میں مسکراہٹوں کا تبادلہ کرنے لگے تو اسی رفتار سے گھر کے معاملات میں کمالاں محتاط ہو گئی۔ یہ وہ دن تھے جب گھر میں پتلی دال پکنے لگی تھی' دادی سارا دن پیڑھی پر بیٹھی افیم کی پینگ میں گم رہتی تھی یا کبھی کبھار قصبے سے سرور کی لائی ہوئی چھالیا کترتی اور پھانکتی اور چباتی رہتی اور سرور موچیوں اور جلاہوں کی دکانوں پر بیٹھا افیم بیچتا اور نت نئی خبریں سن کر اور اکثر گھڑ کر گھر لاتا۔ ماں بیٹا صرف اس وقت باہر کی خبروں پر تبصرہ کرتے جب کمالاں بھی کہیں آس پاس موجود ہوتی۔ پھر بڑے جہاندیدہ بن کر کمالاں کے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھتے اور رات گئے تک اس کی پلکوں کے بار بار جھپکنے کے معانی اور سینے پر بار بار دوپٹے کو پھیلانے کے اسرار و غوامض پر مغز زنی کرتے سو جاتے۔ لیکن اب تک ان میں سے کسی کو یہ جرات نہ ہوئی تھی کہ کمالاں سے براہ راست اور دو ٹوک انداز میں عصمت فروشی کے لیے کہتے' بس جال بچھاتے رہے دانہ ڈالتے رہے اور انتظار کرتے رہے مگر چڑیا کو دانے کی ہوس ہوتی تو جال میں پھنستی' بعض وقت سرور تنگ آ کر کہتا "اماں اس حرامزادی کو اٹھا کر ملتان میں لے جائیں' ایک بار شمشاد اور نو بہار اور امیرو غیرہ کے حلقے میں بیٹھی تو سارے نشے ہرن ہو جائیں گے؟" مگر بڑھیا تاجی دور اندیشی سے کہتی' نہیں بیٹا! وہاں جا کر خود ہرن ہو گئی تو کیا کریں گے؟ ابھی کچی ہے نا' ایک جانے دو آپی ٹیکنے دو اور پھر تم پولیس کو نہیں جانتے تھانیدار آنکھوں آنکھوں میں ڈاکٹری کر لیتے ہیں۔ انہیں اگر پتہ چل گیا کہ کمالاں پورے چودے کی بھی نہیں تو میری تمہاری باقی عمریں جیل میں کٹ جائیں گی جہاں آٹھ دس برس انتظار میں گزارے ہیں وہاں چند مہینے اور سہی' آخر اپنی بیٹی ہے کوئی غیر تو ہے نہیں کہ کان سے پکڑ کر لے

جائیں۔ بیٹھے بیٹھے نہ بیٹھے' یہاں تو عمر بھر کا ساتھ ہے۔ نسلوں کا تعیبہ کھل جائے گا میرے لال ذرا سا اور دیکھ لو۔"

ایک روز سرور گھر میں آیا تو تھکا ماندہ سا بڑھیا کی پیڑھی کے پاس بیٹھ گیا اور بولا

"کچھ نہیں اماں لطف نہیں آیا۔"

بڑھیا بولی "میں پہلے سے سمجھ گئی تھی کہ سرو بیٹا خالی خالی سا آ رہا ہے۔"

سرور نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر کنپٹیاں دبائیں اور بولا "گلابی اور نواز میں بڑی مدت سے یارانہ چل رہا تھا' میں تو رفتار سے پہچان لیتا ہوں کہ کلیجے میں کتنا گھراگھاؤ ہے۔ لوگ یقین نہیں کرتے تھے' کہتے تھے نواز نمازی ہے اور آنکھیں جھکا کر چلتا ہے۔ میں کہتا تھا بھئی جو لوگ نظریں اٹھا کر چلتے ہیں ان پر تم شبہ کرتے ہو اور کہتے ہو کہ آنکھیں جھکا کر چلو' پر جو آنکھیں جھکا کے چلتا ہے اس پر ہم شبہ کیوں نہ کریں اور اس سے کیوں نہ کہیں کہ بھئی یہ نیچی نظر تو بڑی خطرناک ہے' نظریں اٹھا کر چلا کرو' سو آج میں کلے جولاہے کے ہاں افیم بیچ کر آ رہا تھا کہ سلطانے کے کھنڈر کے پاس مجھے گلابی نظر آئی۔ چھپنے کی کوشش میں تھی پر میں نے دیکھ لیا اور جو کھنڈر کی دیوار سے جھانکتا ہوں تو اندر یہ نمازی نواز دبکا بیٹھا ہے اور پھر پلٹ کے دیکھتا ہوں تو گلابی گاؤں میں داخل ہو رہی ہے۔ میں نے نواز سے صرف اتنا کہا "کیوں پیارے نماز پڑھ رہے ہو؟"۔ مجھے من بھر کی گالی دے کر چاقو نکال لیا اور بولا "یہ کوئی تیرے باپ سہرا بے کا کھنڈر ہے؟" پر اماں! جھینپ چھپانے سے چھپتی تو نہ ہیر بدنام ہوتی نہ سوہنی۔ خیر' میں نے واپس آ کر موچی کی دکان پر ذکر کیا تو سب نے مجھے جھوٹا قرار دیا۔ میں نے پیر دستگیر کی قسمیں کھا کھا کر کہا کہ میں نے بس ابھی ابھی دونوں کو اکٹھے دیکھا ہے کہ ایک دم جیسے دکان پر الو بول گیا۔ سامنے بھی گلابی ہاتھ میں جوتا لیے کھڑی ہے "اسے کل تک مرمت کر دو بھائی" اس نے موچی سے کہا اور جوتا پھینک کر چل دی۔ ایسی بھد ہوئی ہے اماں کہ جی چاہتا ہے زمین پھٹے اور اس میں سما جاؤں' بڑے آئے پکی یاری لگانے والے چھپ چھپ کر ملتے ہیں اور۔۔۔۔۔۔ حرامزادے!"

اور کملاں نے سوچا کہ آخر ابا کو ان کے چھپ چھپ کے ملنے سے کیا تکلیف ہوئی' وہ ملتے ہیں تو ابا کا کیا جاتا ہے؟ یہ تو نہیں کرتے تا کہ کمر سے چادر کھول کر سر پر رکھ لی اور عشق کا نام بدنام کیا۔ پھر اچانک وہ خیال ہی خیال میں گلابی کے روپ میں سلطانے کے کھنڈر میں جا پہنچی جہاں ابراہیم نواز کے روپ میں بیٹھا اس کی راہ تک رہا تھا اور پھر۔۔۔۔۔۔

بڑھیا کی آواز نے اسے چونکا دیا "جنگل میں مور ناچا کس نے دیکھا؟ عشق کماتے پھر رہے ہیں۔ ماں کے لاڈلے لڈھن ہو گئے ماں۔ جس نے بھائیوں کا حلقہ توڑ کر اپنے یار کے سینے پر سر رکھ دیا' دنیا بھر کے

سامنے مزا آیا نا عشق کرنے کا۔"

"دادی" کمالاں بولی اور وہ بہت مدت کے بعد اس نوعیت کی گفتگو میں حصہ لینے لگی تھی اس لیے دادی اور بابا دونوں "جی جی" کرتے ہوئے اس کی طرف گھوم گئے اور وہ بولی "آخر آپ ان کے چھپ چھپ کر ملنے پر اتنے دکھی کیوں ہیں؟"

بڑھیا اسے راہ راست پر لانے کے لیے واعظانہ لہجے میں بولی "دیکھ بیٹی رانی ۔۔ بن بات یہ۔۔۔۔"

مگر سرور نے بات کاٹ دی "ٹھہرو اماں! بی کمال خاتون سے میں بات کروں گا۔ یہ بتاؤ کمال خاتون بیٹا کہ کیا تم چھپ چھپ کر ملنے کو برا نہیں سمجھتیں؟"

"کس سے؟" کمالاں نے پوچھا۔

"کسی سے۔ جس سے میں کہوں یا جس سے تم چاہو ملوگی؟" سرور نے تن کر کہا۔

"خدا بھلا کرے!" بڑھیا نے سرور کو داد دی "کیا اس سے بات پیدا کی ہے اور وہ بھی سو بات کی ایک بات ہاں تو بتاؤ بیٹی جواب دو ملوگی!"

کمالاں تو جیسے طوفان میں گھر گئی تھی چکرا گئی اور پھر ایک ہی جست میں جیسے اسے کنارہ مل گیا۔ بولی "پر جس سے میرا اپنا جی چاہے گا!"

"ہاں ہاں جس سے تیرا اپنا جی چاہے گا" بڑھیا کی باچھیں کھل گئیں۔

"بالکل۔۔۔۔۔ اچھا تو کون ہے وہ؟" سرور نے پوچھا۔

جواب کے انتظار میں بڑھیا اور سرور نے سانسیں روک لیں اور پلکیں جھپکنا بھول گئے۔ کمالاں کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ سی آئی جو دیکھی نہیں جا سکتی تھی صرف محسوس کی جا سکتی تھی۔ بولی "ایسا تو کوئی نہیں۔"

بڑھیا کی باچھیں سمٹ گئیں۔

سرور ٹہلتا ہوا آنگن کے پرلے گوشے تک چلا گیا اور جیسے اپنے آپ سے سرگوشی کی "حرامزادی۔"

اس رات بڑھیا دیر تک روتی رہی۔ پھر ایکا ایکی اس کی سسکیاں رک گئیں اور ٹوٹی رات تک دونوں میں کھسر پھسر ہوتی رہی۔ اس رات کمالاں کو بھی بڑی پریشان نیند آئی آنکھیں کھلتیں تو اندھیری چھت کو گھورتی رہ جاتی اور پھر ایک دم آنکھیں بند کر کے سر کو تکیہ کی صورت میں استعمال ہونے والے میلے

چیتھڑوں میں یوں جما دیتی جیسے کسی بہت میٹھے خواب کے چاک کو رفو کرنے چلی ہے۔

دوسرے روز بڑھیا اور سرور کا طرزِ عمل بہت بدلا بدلا سا تھا۔ بڑھیا بے چین ہو ہو کر پیڑھی پر سے اٹھ بیٹھتی اور کھانستی کھنکارتی ادھر ادھر گھومنے لگتی۔ ٹوٹے ہوئے چھاج کی مرمت کرتے ہوئے کمالاں نے ایک بار پوچھا "کیا بات ہے دادی؟"

"ارے بیٹا! کوئی خاص بات نہیں" بڑھیا بولی "جوانی کمبخت یاد آ رہی ہے۔ ایسی ٹوٹ کر آئی تھی کہ جی چاہتا تھا پہاڑوں کو سینے سے بھینچ کر انہیں سرمہ بنا کر رکھ دوں۔ انگلیوں کی پوروں تک سے کوئی چیز پھٹ کر نکلنے کو دھڑکتی رہتی تھی۔ تمہیں دیکھ کر وہ گھڑیاں یاد آ گئیں اسی لیے ذرا اداس ہو رہی ہوں۔"

سرور بھی اس روز دن میں کتنی بار گھر کے چکر لگا گیا ایک مرتبہ کمالاں نے اس سے بھی پوچھا "کیا بات ہے بابا؟"۔

"آبکاری کا افسر دورے پر آیا ہے بیٹا" وہ بولا "ذرا سی افیم تھی اسے ادھر ادھر کیا ہے۔ کہیں چھاپہ نہ پڑ جائے' افیم ہاتھوں سے نکل گئی تو تینوں فاقوں مر جائیں گے بار بار آتا ہوں کہ دیکھوں کہیں سچ مچ چھاپہ پڑ تو نہیں گیا۔ لوگ ہمیں کنجر کہتے ہیں نا بڑی نیچ سمجھتے ہیں' ہمیں' اس لیے کچھ دور نہیں کہ کوئی افسر کے پاس شکایت جڑ دے خواہ مخواہ"۔

کمالاں کو رونا آ گیا۔ کتنا دکھی ہے بے چارا بابا۔ ابھی چالیس برس کا بھی نہیں ہوا پر کیسا نچڑا ہوا سا ہے۔ دھنسے ہوئے گلے' کہیں دور ہٹی ہوئی آنکھیں جیسے کنوئیں میں گر پڑی ہوں۔ ذرا سی آمدنی میں تین جانوں کو سہارے ہے۔ گندی گندی باتیں کرتا ہے تو کیا ہوا۔ نماز بھی پڑھے گا تو بیچے گا تو افیم کی گولیاں ہی' عبادت سے نصیبے بدلتے تو کیا گاؤں کے مولوی صاحب جیسا پرہیزگار اور نیک انسان آج اس نگری کا بادشاہ نہ ہوتا۔ بے چارا میرا بابا!...... وہ چپکے چپکے روتی اور آنسو پونچھتی رہی اور ماں بیٹے کو آنگن کے گوشوں میں سرگوشیاں کرتے دیکھتی رہی۔

اور شام کو کھانا کھاتے اچانک بڑھیا کا ایک نوالہ منہ میں اور دوسرا ہاتھ میں رہ گیا اور وہ پیڑھی پر سے یوں چکرا کر گری کہ ایک بار تو سرور اور کمالاں دونوں سناٹے میں آ گئے۔ پھر سرور نے لپک کر بڑھیا کو اٹھایا اور چلایا "اماں! اماں!"

"دادی' دادی" کمالاں چلائی

"بیٹی بیٹی" بڑھیا کراہی "درد سے پیٹ پھٹا جا رہا ہے۔ کچھ کر دو ورنہ میں گئی۔ اے بیٹا میں گئی۔ قلنج لگتی ہے اسے کسی سیانے کو بلواؤ۔ بیٹا کسی سیانے کو بلاؤ۔"

سرور نے بڑھیا کو اٹھا کر کھاٹ پر ڈال دیا" فکر نہ کر اماں، تیرا یقیناً ہے تو جیون بوٹی سے یوں چٹکی بجاتے میں آرام آ جائے گا۔ کہیں دیکھی تو ہے میں نے۔۔۔ جانے کہاں دیکھی ہے۔ دیکھی ضرور ہے۔ یہیں اسی گاؤں میں دیکھی ہے پر جانے کہاں دیکھی ہے۔"

"قبرستان میں؟" بڑھیا نے مارے درد کے سمٹتے ہوئے کہا۔

"نہیں اماں"۔

"مسجد میں؟" کمالاں نے پوچھا۔

"نہیں بیٹی۔ وہاں تو کنوار ہے۔ میں جیون بوٹی کی بات کر رہا ہوں"۔

"تو پھر کہاں دیکھی ہے؟" بڑھیا نے آنکھیں بند کر کے یہ الفاظ یوں ادا کیے جیسے اپنے سینے میں سے اپنے ہاتھوں سے خنجر نکال رہی ہے" جلدی سے یاد کرو ورنہ میں چلی۔ میں چلی میری بیٹی رانی۔"

اچانک بڑھیا بولی" سلطانے کے کھنڈر میں"۔

اور سرور نے تالی بجا دی" جیو اماں' کیا وقت پر یاد دلایا ہے۔ وہیں ہے جیون بوٹی۔ میں ابھی لایا" اور باہر جانے کے لیے اس نے پگڑی سر پر لپیٹنا شروع کر دی۔

بڑھیا کراہی" تم میرے پاس رکو بیٹا۔ جانے تمہارے پیچھے کیا ہو جائے۔ کمال خاتون چلی جائے گی"" میں چلوں جاؤں گی بابا" گھبرائی ہوئی کمالاں نے جوتا پہن لیا۔

اور سرور بولا" دیکھ بیٹا! ایک بڑے کوٹھے کا کھنڈر ہے ایک چھوٹی سی کوٹھری کا۔ چھوٹی کوٹھری کے کھنڈر کی دکھنی دیوار کی جڑ میں آک اگ رہے ہیں۔ ان کے نیچے مولی ایسے بڑے بڑے پتوں والی ایک بوٹی اگ رہی ہے۔ ایک پتہ بھی مل جائے تو اماں کے سارے دکھ دور ہو جائیں گے۔"

"اچھا بابا میں بس پلک جھپکنے میں آئی"۔ کمالاں نے باہر لپکتے ہوئے کہا۔

سلطانے کے کھنڈر کے پاس اندھیرے میں ایک کتا رو رہا تھا۔ تیزی سے آتی ہوئی کمالاں کو دیکھ کر اس نے پیٹ سے لگی ہوئی دم کو اٹھا کر بھونکنے کی کوشش کی مگر صرف" ٹیاؤں" کی آواز نکال پایا اور بھاگ کھڑا ہوا۔ اب تک کمالاں بہت جوش سے چلی آ رہی تھی۔ کتے کے رونے اور بھاگنے کی آواز سے وہ ہولا گئی اور ٹھٹھک کر رہ گئی۔ پھر چھوٹی کوٹھری کے کھنڈر میں قدم رکھا تو ٹوٹی پھوٹی دہلیز کے کسی سوراخ پر بیٹھے ہوئے جھینگر نے اچانک دم سادھ لیا اور اس سناٹے میں دور کے جھینگروں کی آواز بڑی ڈراؤنی معلوم ہونے لگی۔ خود کمالاں نے بھی جیسے اس لمحے کی ہیبت سے دم سادھ لیا اور گھسٹتے ہوئے تہبند کو دونوں ہاتھوں کی چٹکیوں سے اٹھائے آگے بڑھی۔ آک کے سوکھے پتوں کو چھوا تو وہ اپنی بھونڈی آواز میں بج اٹھے خاموشی میں ان کی آواز معمول

سے کہیں اونچی اور پھٹی پھٹی معلوم ہوئی۔ پھر وہ آک کے پاس بیٹھ کر اس کی جڑوں میں جیون بوٹی ڈھونڈنے ہی لگی تھی کہ یکا یک آک کے بہت سے پتوں کے کھڑکھڑانے کی آواز آئی اور آک کے پیچھے سے ایک سایہ جیسے کھنڈر کی دیوار سے بھی سر نکالتا ہوا اٹھا اور آواز آئی ''آ گئیں میری جان'' چیخ جیسے کمالاں کے حلق میں ہڈی کی طرح اٹک کر رہ گئی۔ ان گلابی جاڑوں میں بھی اس کا جسم تپ گیا اور جگہ جگہ سے پسینہ پھوٹ پڑا۔ ''میں جانتا تھا کہ تم بھی نہ کبھی ضرور آؤ گی اور آخر آج۔۔۔'' کمالاں اتنی قوت سے جست ہی لگا کر کوٹھری کے باہر آ رہی کہ بولنے والا اس قطعی غیر انسانی قوت سے بوکھلا سا گیا اور پھر کمالاں بھاگ اٹھی۔ اس وقت اس کے تمام حواس بہت تیز ہو رہے تھے وہ جانتی تھی کہ اس کا تعاقب ہو رہا ہے اور قدموں کی چاپ لحہ بہ لحہ اس کے قریب آ رہی ہے لیکن جب وہ گاؤں کی پہلی گلی میں داخل ہوئی تو کچھ سوچ کر رک گئی اور دیوار سے لگ لگ کر چلنے لگی۔ تعاقب کرنے والا بھی آبادی کے قریب آ جانے کے باعث کہیں رک گیا تھا۔ ہانپتی ہوئی کمالاں دیوار کو ٹٹول کر چلتی اپنے گھر تک پہنچ گئی اور وہاں اچانک اسے خیال آیا کہ اس کی دادی مر چکی ہے۔ گھر خاموش تھا۔ دادی کراہ نہیں رہی تھی اور کیسے کراہے؟ کمالاں نے سوچا۔ بابا! اس کی پاکتی سے لگا رو رہا ہوگا اور جیون بوٹی کا انتظار کر رہا ہوگا اور۔۔۔۔۔ کمالاں مارے دکھ اور شرمندگی کے آنگن میں دیر تک رکی رہی۔ پھر پنجوں کے بل دروازے تک آئی اور کان لگا کر سننے لگی۔ دادی زندہ تھی۔

دادی کہہ رہی تھی ''نصیبہ کھل بھی سکتا ہے اور چوپٹ بھی ہو سکتا ہے' قادرے کے بس میں آ گئی تو جانو اللہ نے روزی کا سامان کر دیا اور جو وہاں سے بھی پھڑ پھڑا کر بھاگتی ہے تو بیٹا! مجھے زہر کی چٹکی دے دینا۔ انتظار کرتے کرتے آنکھیں سفید ہو چکی ہیں۔ اب بھی چاند نہ ابھرا تو سمجھو رات ختم ہونے کی نہیں۔''

کمالاں کو جھرجھری آ گئی جیسے ایک دم بہت سی سرسریاں اس کی رگوں میں دوڑنے لگی ہوں۔

پھر سرور بولا قادرے سے وعدہ تو دس کا ہے پر کہتا تھا کہ اگر کمالو نے خوش کیا تو پندرہ دے دوں گا۔ روز کے دس پندرہ کمانے لگی تو حرامزادی خود بھی مزے میں رہے گی پر مجھے اس پر اعتبار نہیں اماں! بچپن میں مولوی کے پاس رہ کر جانے کمبخت نے رگوں میں برف بھر لی ہے کہ گرمی تو اسے چھو بھی نہیں گئی۔''

''پر بیٹا'' دادی نے کہا ''تم نے اسے کھنڈر میں بھیجنے کی ترکیب اچھی سوچی ہے۔''

کواڑوں کو جیسے کسی نے ڈھیلا دیا۔ بڑھیا اور سرور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگے اور ذرا سی دیر کے بعد انہوں نے دیے کی مدھم روشنی میں کمالاں کو پہچان لیا۔ بڑھیا فوراً کراہنے اور بل کھانے لگی لیکن سرور تو بت بن چکا تھا۔ بڑھیا نے بڑی مشکلوں سے ہمت باندھ کر کچھ عجیب سی غیر قدرتی آواز میں پوچھا ''بوٹی لائیں بیٹا؟''۔۔۔ کمالاں یوں اندر آئی جیسے بڑھیا کو دبوچنے کے لیے بڑھی اور سرور تک لرز گیا۔ مگر وہ دادی اور بابا

کو غصے سے دیکھتی اپنی کوٹھری میں چلی گئی اور بستر پر گر کر بلبلا کر رونے لگی۔ بڑھیا اور سرور بیٹھے ایک دوسرے کو بیوقوفوں کی طرح دیکھتے رہے اور جب ادھر سے کمالاں کے رونے کی آواز رکی تو ادھر بڑھیا نے رونا شروع کر دیا اور جب بڑھیا خاموش ہوئی تو سرور وہاں سے اٹھ کر اپنی کھاٹ پر آیا اور سر سے پاؤں تک چادر پھیلا کر لیٹ گیا۔

اس رات بڑھیا دیر تک جاگتی رہی۔ کوٹھے میں ٹہلتے ٹہلتے اکتا جاتی تو باہر آنگن میں نکل جاتی وہاں پالا کاٹتا تو اندر بھاگی آتی۔ سونے کی کوشش کرتی 'پھڑک کر اٹھ بیٹھتی اور پھر ٹہلنے لگتی اور جب صبح سرور اٹھا تو اس نے دیکھا کہ بڑھیا کراہ رہی ہے۔ وہ اٹھ کر اس کے پاس آیا اور جھک کر بولا "اماں سچ سچ کہ جھوٹ موٹ۔۔۔۔۔؟"

بڑھیا نے بڑے کرب سے اپنے بیٹے کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بولی "تم یوں نہ پوچھو گے تو اور کون پوچھے گا بیٹا؟"

سرور اس کے پاس بیٹھ گیا "نہیں ماں! معاف کر دو تو کیا سچ مچ بیمار ہو؟"

بڑھیا نے کہا "پسلی میں درد اٹھا ہے بیٹا! چھریاں چل رہی ہیں۔"

سرور حواس باختہ سا وہاں سے اٹھا اور بولا "میں ڈاکٹر سے کوئی دوا لے کر ابھی آیا۔"

سرور کے جانے کے بعد بڑھیا دیر تک کراہتی اور روتی رہی' کافی دیر کے بعد وہ پکاری "بیٹا کمال خاتون۔"

کمالاں دروازے پر نمودار ہوئی۔ اس کا چہرہ بری طرح زرد ہو رہا تھا۔ بال اجڑے اجڑے سے تھے اور ہونٹوں پر سفیدی سی جھلک رہی تھی۔

"بیٹا" بڑھیا نے فریاد کی۔

کمالاں وہیں کھڑی اسے ٹکر ٹکر دیکھتی رہی۔

"ایک پیالی چائے مل جائے گی؟" اس نے گداگروں کی سی لجاجت سے کہا۔

کمالاں پلٹ کر باہر چلی گئی۔

سرور کوئی دوا لے کر آیا تو بڑھیا چائے پی رہی تھی اور کمالاں چپ چاپ اس کے پاس کھڑی تھی۔ سرور کی دھنسی ہوئی آنکھیں چمک اٹھیں' "اپنی دادی کو چائے پلا رہی ہو بیٹی؟" وہ بولا اور کمالاں کو خاموش پا کر بڑھیا کے پاس بیٹھ گیا "یہ سفوف دیا ہے ڈاکٹر نے۔ کہتا تھا کہ یہ سفوف بھی اچھا ہے پر ایک انگریزی ٹیکہ نکلا ہے بڑے زور کا۔ پسلی کا درد آن کی آن میں غائب ہو جاتا ہے کہتا ہے دوا تم منگوا لو ٹیکہ میں لگا دوں گا تمیں

چالیس لگتے ہیں"۔

لیکن اس تیس چالیس کی الجھن میں ٹیکہ لانے کی بجائے بڑھیا کو ہوش میں لانے کی نوبت پہنچی۔ باقی ایم اور کمالاں کے چاندی کے دو بندے بیچ کر روپے ڈاکٹر کی نذر کیے' مگر شام کو جب یہ ڈاکٹر جو کمپاؤنڈری سے استعفیٰ دے کر ڈاکٹر بن کر آیا تھا مریضہ کو دیکھنے آیا تو بڑھیا کی نظریں چھت کے کسی نقطے پر جم چکی تھیں اور وہ پنڈلیوں میں اینٹھن کے باعث پاؤں کو بیچ بیچ دیتی تھی۔ ڈاکٹر خفا ہونے لگا کہ "تم لوگ اسی وقت سیانے بلواتے ہو جب زندگی کی آخری رمق تک بجھنے والی ہو۔ اب دوا سے کچھ نہیں ہوگا' خدا کا نام یاد ہو تو دعا کرو اور بس۔ اس وقت بات میرے بس سے نکل چکی ہے۔ قرآن مجید کے ختم کے لیے کسی کو بلوا سکتے ہو تو بلواؤ ورنہ مرنے والی کو تو مرنا ہی ہے"۔

سرور جاتے ہوئے ڈاکٹر کو دیر تک دیکھتا رہا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اپنی اماں کی طرف دیکھتے ہوئے ڈرتا ہے۔ پھر اچانک اس کے ہونٹ کانپنے لگے اور وہ اماں کی کھاٹ کی پٹی پر سر رکھ کر رونے لگا۔ اس کی پگڑی اور لمبے بھوسلے بال ادھر ادھر لٹک گئے۔ کمالاں بھی رونے لگی اور باپ بیٹی نے جب روتے روتے ایک دوسرے کی طرف دیکھا تو جیسے ایک دوسرے کی آنکھوں میں کچھ پڑھ کر دونوں نے ایک ساتھ بڑھیا کی طرف دیکھا سرور اچانک سنجیدہ ہو گیا۔ اس نے پگڑی اٹھا کر آنسو پونچھے اور اٹھ کر بڑھیا کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ پگڑی کا ایک پلو پھاڑ کر بڑھیا کی ٹھوڑی کے نیچے سے گزارا اور سر پر کس کر گرہ لگا دی اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا "تم یہیں اپنی دادی کے پاس بیٹھو بیٹی! کچھ یاد ہو تو پڑھتی رہو۔ میں کسی سوچی دھوبی سے قبر کے لیے کہہ آؤں۔ جلدی سے جنازہ ٹھکانے لگ جائے تو کہتے ہیں قبر حساب نہیں لیتی"۔۔۔۔۔ اس نے ایک بار پھر آنسو پونچھے' پگڑی بھدے پن سے لپیٹی اور باہر جاتے ہوئے دروازہ یوں کھولا اور بھیڑا جیسا سے مردے کے جاگ اٹھنے کا اندیشہ تھا۔

کمالاں نے زندگی میں پہلی بار کسی کو مرتے دیکھا تھا۔ ابا کے جانے کے بعد اس نے مری ہوئی دادی کی سمت ڈرتے ڈرتے ایک نظر ڈالی۔ نیم وا آنکھوں میں سفیدی کے سوا کچھ نہ تھا۔ میلی زرد رنگت کو چراغ کی میلی زرد روشنی نے نمایاں کر دیا تھا۔ پھر اسے کچھ ایسا لگا جیسے دادی کے لبوں میں حرکت ہوئی اور ہونٹ ذرا سے اوپر اٹھے ہیں۔ گھبرا کر وہ زمین کو دیکھنے لگی۔ پھر اٹھ کر دیوار کی طرف دیکھتے ہوئے دادی کا چہرہ ڈھانپ دیا۔ لیکن اس کا ہاتھ دادی کے ماتھے کو چھو گیا اور اس کے جسم میں کپکپی دوڑ گئی کتنا ٹھنڈا تھا دادی کا ماتھا۔ وہ زمین پر بیٹھ کر سورہ اخلاص پڑھنے لگی۔ پڑھتے پڑھتے اسے محسوس ہوا کہ دادی کے ہاتھ چادر کے نیچے ہلے ہیں۔

"دادی" وہ چیخ کی حد تک چلائی۔ "بابا" وہ دروازہ کھول کر پوری شدت سے پکاری۔ باہر گلیوں میں کتے

بھونک رہے تھے اور کہیں دور سے ڈھول اور شہنائی بجنے کی آواز آرہی تھی۔ آنگن میں دروازے کے قریب ہی دادی کی پیڑھی رکھی تھی۔ ایکا ایکی اس پر ایک سایہ سا آکر بیٹھ گیا۔ یہ بوڑھی دادی تھی۔ کمالاں نے اس زور سے کواڑ بند کیے کہ جھریوں میں سے سوکھے گارے کی قلمیں سی نکل کر گر پڑیں۔ وہ پسینے میں یوں شرابور ہو رہی تھی جیسے پگھلی جا رہی ہے۔ لپک کر اس نے دادی کے چہرے پر سے چادر نوچ لی۔۔۔ نیم وا آنکھوں کی سفیدی بڑھ رہی تھی اور پھر اسے یوں لگا کہ دادی نے آنکھیں جھپکی ہیں "دادی!" وہ ایک بار پھر اسی شدت سے چیخی اور دھڑام سے زمین پر گر کر بے ہوش ہو گئی۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو سرور اس پر جھکا ہوا تھا "اٹھو میری بیٹی جاگو آنکھیں کھولو اری پگلی تجھے کیا ہوا تھا؟"

"میں ڈر گئی تھی بابا" اس نے ادھر ادھر دیکھ کر کہا۔ سامنے دادی کے مردہ جسم کے پاس مولوی صاحب بیٹھے سورۂ یاسین پڑھ رہے تھے۔ کمالاں نے جھپٹ کر دوپٹہ اوڑھا اور مودبانہ بیٹھ گئی۔ مولوی صاحب نے پڑھتے پڑھتے اس کی طرف دیکھا مسکرائے اور اشارے سے اپنے پاس بلایا۔ وہ اٹھی اور دادی کی کھاٹ کی پرلی طرف مولوی صاحب کے مقابل بیٹھ گئی۔ انہوں نے اپنے ہونٹوں کو انگلیوں کی پوروں سے چھو کر اسے کچھ پڑھنے کے لیے کہا اور وہ ایک سعادت مند بچی کی طرح سورۂ اخلاص کا ورد کرنے لگی۔ پھر مولوی صاحب نے سرور کو بے فکر رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ اٹھا اور دروازے کو اسی احتیاط سے کھول کر باہر چلا گیا۔

سرور ساری رات قبر اور کفن وغیرہ کے سلسلے میں بھٹکتا پھرا۔ دوسرے دن بڑھیا کو دفن کر کے گھر میں آیا تو آنگن میں موچیوں جلاہوں کی چند عورتیں کمالاں کے پاس بیٹھی رو رہی تھیں چپکے سے کوٹھے میں چلا گیا' خوب خوب رویا اور پھر سو گیا۔ عورتیں چلی گئیں تو کمالاں کوٹھے میں آئی۔ بھرائی ہوئی آواز میں بولی "بابا"۔۔۔ اور پھر جواب نہ پا کر اس پر ٹوٹ پڑی' لیکن کھاٹ کی پٹی کے پاس جا کر رک گئی اور چہرے پر کچھ ایسے آثار نمودار ہوئے جیسے اب بس چیخنے ہی والی ہے۔ لرزتے ہوئے ہاتھ سے اس نے سرور کے ماتھے کو چھوا اور مسکرانے لگی۔ "بابا" وہ مارے خوشی کے پکار اٹھی۔ سرور نے آنکھیں کھول کر ادھر ادھر دیکھا۔

"میں تو ڈر گئی تھی بابا!" کمالاں اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی۔

"تو کیا مجھے بھی مردہ سمجھ لیا تھا تم نے؟" سرور بولا۔

کمالاں چپ چاپ اس کی طرف دیکھتی رہی اور بہت دیر کے بعد بڑے پیار سے بولی "بابا"!

سرور بے اختیار رونے لگا اور جب بہت سے آنسو اس کی آنکھوں کے گڑھوں میں بھر گئے تو وہ ایک مسلسل دھار کی طرح بہہ نکلے اور پھر وہ بڑی ملائم مگر بھرائی ہوئی آواز میں بولا "بیٹی! دیکھو مجھے معاف کر دو۔

میں بڑا کمینہ ہوں۔ بڑا کمینہ ہوں میں!" اس نے نچلے ہونٹ کو دانتوں میں دبا کر دونوں ہاتھوں سے اپنے بال نوچ لیے اور سر پیٹ لیا۔ "میں بڑا ذلیل' کتا خبیث' کمینہ ہوں کمالو! میں نے اپنی بیٹی کو ۔۔۔۔۔ اپنے کلیجے کے ٹکڑے کو کنجری بنانا چاہا۔ تم مجھے مار دو میری بیٹی! میرا گلا گھونٹ دو۔" پھر اس نے کمالاں کے ہاتھوں کو جکڑا اور انہیں اپنی گردن پر رکھ دیا۔ "میرا گلا گھونٹ دو کمالو بیٹی! مجھ پر احسان کرو۔ میں کتنا کمینہ باپ ہوں کتنا کمینہ' سچ مچ کا کنجر۔" وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

کمالاں نے اپنے ہاتھ کھینچ لیے مگر اسے اپنے بابا کو تسلی دینے کے لیے کوئی لفظ نہ سوجھا۔ بابا کے حق میں اسے کوئی بات مل ہی نہ رہی تھی کہ اسے بہلا پھسلا کر تھپکتی تو کیا اب وہ یہ کہتی کہ نہیں بابا! تم نے بہت اچھا کیا تم نے کون سی بری بات کی۔ بس وہ چپ چاپ بیٹھی روتی رہی اور پھر اس کا سر دبانے کے لیے دونوں ہاتھ بڑھائے بڑی نرمی اور پیار سے وہ اس کے ماتھے کی ہڈی دباتی رہی۔ پھر جیسے کچھ سوچنے لگی اور ماتھے پر سے ہاتھ اٹھا کر سرور کے گالوں پر رکھ دیے۔ تیزی سے جیسے چونک کر اس نے چادر کے اندر سے اس کا ہاتھ ڈھونڈ نکالا اور اس کی نبض دیکھنے لگی۔ پھر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے گھورنے لگی اور کچھ دیر کے بعد جیسے کہیں بہت دور سے بولی' "تمہیں تو بخار ہے بابا!"

"ہاں بیٹی!" وہ بولا "ادھر دونوں پسلیوں میں چبھن سی بھی ہے۔"

کمالاں سناٹے میں آ گئی۔ کھاٹ پر لیٹا ہوا بابا اچانک دادی میں بدل گیا۔ اس کی آنکھیں سفید ہو گئیں۔ چہرے پر میلی میلی زردی کھنڈ گئی اور اسے بابا کی ٹھوڑی تلے سے ایک پٹی بھی گزرتی دکھائی دے گئی! وہ ایک چیخ مار کر سرور سے لپٹ گئی۔ اس کے سر اور ماتھے پر اپنا چہرہ ملنے لگی اور رو رو کر پکارتی گئی "نہیں بابا تم نہیں مرو گے۔ تم نہیں مرو گے بابا۔ میں تمہیں نہیں مرنے دوں گی۔ نہیں بابا ۔۔۔۔۔ نہیں ۔۔۔۔۔ نہیں!" وہ بچوں کی طرح مچل گئی۔ سرور اس کے سر پر شفقت بھرے ہاتھ پھیرتا رہا اور ساتھ ساتھ روتے روتے کہتا رہا "نہیں نہیں بیٹی! میں مروں گا نہیں۔ تم مجھے بخش دو تو میں جیوں گا۔ پھر جینے پر حق ہوگا میرا۔"

کمالاں کے سوجے سوجے ہونٹوں اور سرخ سرخ گالوں پر آنسوؤں کی وجہ سے بال چمٹ گئے تھے۔ وہ انہیں بالوں میں سے اپنے بابا کو دیکھنے لگی اور دیکھتی رہی۔

"بخش دو بیٹا!" سرور نے چادر میں سے ہاتھ نکالے اور انہیں جوڑ لیا۔

اور آنسوؤں میں نہائی کمالاں مسکرا دی۔

سرور کھاٹ پر اٹھ بیٹھا' اب میں نہیں مر سکتا بیٹی! تم ڈاکٹر کے پاس جا کر ذرا سا وہ سفوف تو لیتی آؤ ۔۔۔ کہنا پسلی کا درد ہے' دونوں طرف' ٹیکے کا کہے تو کہنا ہم غریب آدمی ہیں۔ جاؤ میری بیٹی! ۔۔۔ پر

جانے سے پہلے مجھے ایک بار پھر اسی طرح دیکھ لو مسکرا کر۔"

کمالاں پھر مسکرائی "یوں" اس نے خوش ہو کر کہا اور پھر اوپر چھت کی طرف دیکھ کر بولا "الٰہی تیرا شکر ہے۔"

کمالاں نے باہر جا کر منہ دھویا اور ڈاکٹر کے ہاں چلی گئی۔ ڈاکٹر نے سفوف تو دے دیا مگر ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ "آج کل نمونیہ کے مریض تابڑ توڑ مر رہے ہیں پر جو مریض ٹیکا لگواتا ہے وہ بچ جاتا ہے۔ باپ کی زندگی چاہیے تو کہیں سے ٹیکا پیدا کرو سمجھیں؟"

"کتنے میں آئے گا ٹیکا؟" کمالاں نے پوچھا۔

"بس یہی کوئی چالیس پچاس میں۔" ڈاکٹر بولا "پنسلین نام ہے۔ قصبے میں مل جائے گا"

واپس گھر آ کر اس نے بابا کو پانی کے ساتھ سفوف تو کھلا دیا مگر ٹیکے کا خیال اس کے ذہن میں سوئیاں سی چبھوتا رہا۔ شام تک سرور کو اس زور کا بخار چڑھا کہ دور سے آنچ آنے لگی۔ کمالاں پھر ڈاکٹر کے پاس دوڑی گئی۔ سفوف تو لے آئی مگر ٹیکے کی رٹ جاری تھی۔

رات بھر بابا کے پاس بیٹھی رہی' سوئی بھی تو کھاٹ کی پٹی کے سہارے' سرور منتیں کرتا رہا کہ جا کر چارپائی پر سوئے مگر وہ رو دیتی اور بچوں کی طرح نفی میں سر ہلا ہلا کر انکار کر دیتی۔

صبح ہونے تک سرور بے حال ہو چکا تھا۔ کمالاں ڈاکٹر سے تیسری خوراک لینے نکلی تو لوگ اسے دیکھ کر ٹھٹک ٹھٹک گئے۔ سوجی سوجی' سرخ سرخ آنکھیں' اجڑے بال' خشک ہونٹ جیسے کہیں سے پٹ کر آ رہی ہے۔

ڈاکٹر اس کے ساتھ چلا آیا۔ سرور کی نبضیں دیکھیں اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کمالاں کو دیکھنے لگا۔ "تو کیا اپنے باپ کو مارنے کے ارادے ہیں تمہارے" وہ بڑے غصے سے بولا "ٹیکا لاؤ ٹیکا سمجھیں؟ اب کے ٹیکا لائے بغیر میرے پاس نہ آنا" اور وہ تھیلا اٹھا کر چلا گیا۔

سرور چیخنے لگا "ٹیکا!" وہ بولا اور پھر کراہتے ہوئے سست گیا۔

اور کمالاں چہرے کو دونوں ہاتھوں میں لیے کھاٹ کے پائے کا سہارا لیے باہر دھوپ میں کھیلتی ہوئی چڑیوں کو دیکھتی رہی۔

دن ڈھلے وہ اٹھی اور ایک گلی کا چکر لگا کر یوں واپس آ گئی جیسے محض ٹہلنے نکلی تھی وہ پھر اسی طرح کھاٹ سے لگ کر بیٹھ گئی۔

"ٹیکا!" سرور پھر سے ہنسا "کہتا ہے ٹیکا لاؤ' ڈاکٹر بنا پھرتا ہے' ٹیکے بغیر ٹھیک کر دے تو مانوں۔ اور بیٹی

دیکھو میری طرف دیکھو میں مروں وروں گا نہیں۔"

"میں تمہیں نہیں مرنے دوں گی بابا" کمالاں نے جیسے سرور سے کوئی راز کی بات کی۔

شام سے پہلے وہ سرور کو چائے پلا رہی تھی کہ اچانک باہر چلی گئی۔ گاؤں بھر کی گلیوں میں وحشت زدہ گھومتی رہی اور جب گاؤں کی مسجد میں شام کی نماز پڑھی گئی تو اسے گلی میں مسجد کی باہر نکلی ہوئی محراب کے پیچھے ابراہیم مل گیا اور وہ یوں بولی جیسے غیر ارادی طور پر یہ الفاظ اس کے منہ سے برس پڑے۔ "تم تو ہم سے دور دور رہتے ہو، ملتے ہی نہیں!"

ابراہیم جیسے ہوا میں معلق ہو کر رہ گیا۔ بڑی دیر کے بعد ادھر ادھر دیکھ کر سرگوشی میں بولا "تمہارے حکم کا انتظار تھا۔"

"تو پھر آج ملو" وہ اسی سپاٹ لہجے میں بولی۔

"کہاں؟"

"میرے گھر ہی میں" پھر ذرا سا رک کر بولی "دادی تو مر گئی ہے نا۔"

"کب آؤں؟"

"بس لوگ سوتے آ جاؤ۔ میں گھڑیاں گنوں گی تمہارے لیے۔ بے دھڑک آنا، بابا بیمار ہے، بے ہوش پڑا ہے۔"

ابراہیم کے تو جیسے پر لگ گئے، ادھر کمالاں بھی اڑتی ہوئی گھر پہنچی۔ چائے کی پیالی سرور کے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ چکی تھی اور وہ "پانی پانی" پکار رہا تھا۔

پانی کے چند گھونٹ پی کر وہ بڑے دکھ سے بولا "اتنی دیر تک مجھے اکیلا نہ چھوڑ دیا کرو بیٹی، ڈر لگتا ہے۔"

کمالاں کچھ نہ بولی۔ اس کا سر دابنے لگی اور جب اس پر غنودگی سی چھا گئی تو پنجوں کے بل چلتی ہوئی دوسری کوٹھری میں آئی اور وہاں چیتھڑوں کو میلے گدے کے نیچے چھپا کر تکیے کی شکل پیدا کر لی۔ گدے پر اپنا دوپٹہ بچھا دیا اور آنگن میں کھلتا ہوا دروازہ کھول کر وہاں چہرے کو دونوں ہاتھوں میں رکھ کر بیٹھ گئی اور لوگ سوتے تک بیٹھی رہی۔

ابراہیم دبے پاؤں آیا تو جب بھی وہ اسی طرح بیٹھی رہی۔ قریب آ کر اس نے آہستہ سے کہا "کمالی!" "ایں!" وہ چونکی اور پھر اٹھ کھڑی ہوئی "ارے تم آ گئے" وہ اسے ہاتھ سے پکڑ کر اندر لے آئی۔

اور پھر سرور "پانی پانی" کراہنے لگا۔ پھر چلانے لگا۔ پھر رونے تک لگا اور ادھر بہت دیر کے بعد جب ابراہیم اٹھ کر جانے لگا تو کمالاں لپک کر آئی اور دروازے سے چٹ کر کھڑی ہو گئی۔

"پانی"! سرور دوسرے کوٹھے میں رویا۔

ابراہیم کچھ دیر کھڑا کمالاں کی وحشت کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر بولا "اب چلیں پیاری!"

لیکن کمالاں اپنی جگہ سے نہ ہلی۔

"پانی" سرور ادھر سے چلایا۔

ابراہیم نے ہاتھ بڑھا کر کنڈی کھولنے کی کوشش کی۔ "کل پھر ملیں گے میری جان!"

اور آخر کمالاں بولی "کل تو خیر ملیں گے پر آج کی اجرت کہاں ہے؟"

"اجرت؟" ابراہیم غصے میں بولا "اجرت مانگتی ہے؟ عاشق کی اجرت مانگتی ہے شرم نہیں آتی؟ آخر کنجری ہے نا کنجری!"

اس نے کمالاں کو بازو سے پکڑ کر ایک طرف پھینک دیا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

---

بانو قدسیہ

# مجازی خدا

ننھی بسم اللہ رات بھر سے بھوکی تھی۔

تابی نے جو بچی کو گود میں لیا تو ایک بار ہمک کر اس نے ماں کی چھاتیوں پر ہاتھ مارا اور بچ سا دودھ چھل چھل رسنے لگا۔ اس وقت ننھی کو دودھ پلاتی تابی عجیب سی لگ رہی تھی جیسے پانچ کیوبک فٹ کے فریج میں کسی نے دال کی لبالب بھری ہانڈی رکھ دی ہو۔ انگیا کے جنگلے بانکڑی سے بنے تھے اور پان پر کرن کی جھالر تھی۔ بروکیڈ کی کٹوری پر ساری سیون صراحی دار موتیوں سے جگمگا رہی تھی۔ ململ کے کرتے تلے ایسی جگر جگر کرتی انگیا بھی عجیب سی لگ رہی تھی۔ ایک تو ویسے ہی یوں پورے میک اپ کے ساتھ تابی کا دودھ پلانا اچنبھے کی بات تھی لیکن یہ کس کو گمان تھا کہ تابی دودھ پلانے سے پہلے وضو بھی کرے گی؟ آگے نہ پیچھے کبھی وضو کا پانی کہنیوں تک گیا ہی نہ تھا۔ یہ اچانک کایا پلٹ ہوئی تو کیسے؟

تالڑاں سے تابی لوٹی تو گلی میں پہنچتے ہی سب سے پہلے اس کے کانوں میں بسو کی آواز آئی۔ خدا جانے یہ عرس کی کرامت تھی کہ بسو کی آواز کا جادو تابی کے بھانویں صور اسرافیل پھونکی گئی۔ اپنے اعمال نامے دکھانے کا وقت آ پہنچا۔ وہ تھر تھر کانپتی اوپر پہنچی۔ بچی نہایت ہی بے سرے پن سے پورا گلا پھاڑے چیخ رہی تھی۔ کپڑے تبدیل کرنے کا وقت نہ تھا۔ ساڑھی اتارتے ہی اس نے جلدی سے ململ کا کرتا پیٹی کوٹ پر پہن لیا اور وضو کرنے بھاگ گئی۔

اس سے پہلے تو تابی نے کبھی وضو کر کے بچی کو دودھ نہ پلایا تھا۔ پھر یہ کایا پلٹ ہوئی تو کیسے؟

وہ جھلنگی چارپائی پر پیٹی کوٹ کرتے میں ملبوس بڑے پیار سے بچی کو گود میں لیے بیٹھی تھی اور اس کے چہرے پر وہی ملکوتی معصومیت تھی جو مائیکل انجلو کی میڈونا کے چہرے پر ہوا کرتی ہے۔ سامنے اچاری آموں سے لدا ٹرے اور بالٹی بھر چوسی پڑی تھی۔ یہ وقت تخلیے کا تھا لیکن نادر بغیر کھانسے' بنا دستک دیے مستول کی طرح آ کھڑا ہوا۔

دراصل رات کو تابی کا ارادہ تالڑاں جانے کا نہ تھا۔ ننھی بسم اللہ سے اسے واقعی بہت پیار تھا اور وہ

اسے ساری رات چھوڑنے کے لیے رضامند نہ تھی۔ کچھ اس کی اپنی طبیعت بھی اداس تھی۔ لیکن نادر شاہ کی لچھے دار باتوں کے دام میں وہ آ ہی گئی۔ کئی سالوں سے وہ شریف شاہ کے عرس پر مجرا کرنے جا رہی تھی۔ اور اسے ایسا لگتا تھا جیسے یہ گھر بار، بسم اللہ، عزت، دولت سب شاہ جی کی دعاؤں کے طفیل ہو۔

نادر نے ٹسر کا فیروزی تہمد باندھ رکھا تھا۔ گلے میں موتیے کا لمبا سا ہار تھا۔ وہ پردہ اٹھائے سیمرغ بنا کچھ دیر کھڑا رہا۔ کمرے میں رات بھر کی گرمی نل سپیڈ پنکھے کے تھپیڑے کھا رہی تھی۔ تابی کو نادر کی آمد کا احساس اس وقت ہوا جب وہ بڑی بے تکلفی کے ساتھ تابی کے پاس بیٹھ گیا۔ سارے کمرے میں نادر کی مردانہ خوشبو پھیل گئی تابی نے کرتے سے بچی کا منہ ڈھانپ لیا اور نادر کی جانب پیٹھ کر لی۔ نہ جانے آج اس سلطے پر تابی کو کیوں شدید غصہ آ گیا۔ تابی کو یوں بچی کا منہ ڈھانپتے دیکھ کر نادر بڑے کھردرے پن سے ہنسنے لگا۔

نہ جانے یہ شریف شاہ کے عرس کی برکت تھی؟

خدا جانے یہ نادر کے نالائم قہقہے کا اثر تھا؟

کون کہہ سکتا ہے کہ ننھی بسو کے دودھ میں بھیگے ہونٹ تھے جنہیں دیکھ کر تابی کو اپنے آپ سے شدید نفرت ہو گئی۔

نادر کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ تابی سیخ پر لگے کباب کی طرح بھن رہی ہے۔ کتھئی رنگ کے ہاتھ بڑھا کر انگیا کے بچھوا پر کسا وٹ کھولی اور آہستہ آہستہ ڈوری یوں کھولنے لگا جیسے تلے دانی ڈھیلی کر رہا ہو۔

"دودھ پینے دو بچی کو۔۔۔ رات بھر سے بھوکی ہے۔"

"ہم بھی رات بھر کے بھوکے ہیں" وہ بے شرمی سے ہنسنے لگا۔

اپنے خلاف، نادر کے خلاف اور نہ جانے کس کس کے خلاف لمحہ بھر میں دیوار چین تعمیر ہو گئی۔ نعل در آتش تابی نے کیوٹکس لگی انگلیوں کا بھرپور ہاتھ اس زنائے سے نادر کے مارا کہ وہ اپنا ٹسر کا تہمد سنبھالتا اٹھ کھڑا ہوا۔

بات کیا ہے؟" اس نے خفت اور غصے کے ملے جلے جذبات سے پوچھا۔

"کوئی بات نہیں ہے۔ بس جاؤ اور پھر کبھی نہ آنا"

"نشہ تو نہیں ہو گیا تجھے؟

"ہو گیا ہے تو جا!"

"دیکھ لے پچھتائے گی۔ شہر کے سارے دل پھینک میری مٹھی میں ہیں۔" نادر نے بالوں بھری مٹھی اسے دکھا کر کہا۔

"بھاڑ میں جائیں تیرے دل پھینک اور تو!"

نادر نفرین بھرے قہقہے لگاتا سیڑھیاں اتر گیا۔

اس وقت تک نہ تو تابی کو علم تھا اور نہ ہی نادر کو شبہ ہوا تھا کہ تابی اپنی پچھلی زندگی کو تیاگ رہی ہے لیکن جوں جوں دن گزرتے گئے تابی کے کچے زخم پر کھرنڈ نہ بندھا بلکہ اور دن پر دن پیپ پڑنے لگی۔ جو بات یونہی دل کو چھو گئی تھی اب پختہ خانگی بنا کر اس نے دل کے سیف میں رکھ لی۔

نادر کا خیال تھا کہ تابی گیلا بارود ہے چند دن فراق کی کڑی دھوپ میں سینکی گئی تو آپ سلگ اٹھے گی۔ کوئی گوارا چند ادا تو ہی نہیں کہ مرد کی شناسائی کے بغیر رہ سکتا۔ لیکن جب کافی دن گزر گئے اور تابی کا کوئی پیغام نہ ملا تو وہ خود ہی چہرہ منہ ویکھے محبوب کچھ مشتاق سا کوٹھے پر گیا۔

تابی کو دیکھ کر نادر کا دل تڑاق کھا گیا۔ نہ بالوں میں پیچ تھے نہ کپڑوں میں دھنک کی سی کیفیت تھی۔ نقلی اصلی سب تہیں غائب۔ رانڈوں کی طرح بال کھینچ کر جوڑا کسا ہوا نہ وہ پھندنے دار سینڈلیں نہ ناخنوں پر رنگ برنگی کیوٹکس۔ نہ کانوں میں بالیاں نہ ہاتھوں میں آرسی انگوٹھیاں نہ گلے میں رانی ہار بلکہ کان سے ننگی بوچی۔۔۔ تابی کی جگہ وہ ایک خستی بکرا نظر آتی تھی۔

نادر نے بہت سر مارا۔ منتیں کیں، سمجھایا، واسطے دیئے، دھمکیاں دائیں۔ لیکن اس کی باتیں سن کر وہ اور بھی بپھر گئی۔ تابی کو ایسی ضد چڑھی تھی کہ قسم کھالی برتن مانجھنے منظور روزی کوٹنے کا پیشہ سر آنکھوں پر جھاڑو بہارو پھیرنا قبول لیکن پھر حرامکاری کا دھندا نہ کرے گی۔ ادھر تابی نے سونا سوگند کھائی ادھر سارے ہیرا منڈی میں جیسے تھوتھی باتوں کے غبارے اڑنے لگے۔ پنگلی کی خورشید جہاں نے چوری چوری دیگ چڑھائی اور در یار بھجوا دی۔ عرصے سے اس کے سارے گاہک کسی چور راستے سے تابی کے کوٹھے ایسے چڑھتے کہ پھر وہیں کے ہو رہتے۔ چوکی والی نازو نے برقعہ اوڑھا اور محلے محلے وہ تو گئے جوڑتی پھری کہ افواہ کو جیٹ طیارہ کی اڑان لگ گئی۔۔۔۔۔۔

جتنے منہ اتنی باتیں۔۔۔۔ کوئی کچھ کہتا کوئی کچھ۔۔۔۔۔!

پنکھے کی تیز ہوا میں جاپانی عورت والا کیلنڈر آنچل کی طرح لہرا رہا تھا۔

حمیدہ کے گریبان میں منہ دیئے ننھا سا جاوید چسر چسر دودھ پیے جا رہا تھا۔ حمیدہ کی گردن پر پسینے کے قطرے سونف کے گچھوں کی طرح ابھر آئے تھے۔ اس نے جاوید کی پیٹھ میں دھموکا مار کر اسے پرے کیا اور شیخ جی کے ہاتھ پر انگلی بجا کر بولی۔ "سنیئے ذرا۔۔۔۔! اس کے پیٹ میں کیڑے ہیں۔ ڈاکٹر سے ضرور کوئی دوا لے کر آئیں کل۔۔"

"اتنے سے بچے کے پیٹ میں کیڑے! ناصر اور جمیلہ کے پیٹ میں ہوں تو ہوں۔"

"سارا دن میری جان نہیں چھوڑتا۔ نہ دن کو آرام ہے نہ رات کو اس کے پیٹ میں کیڑے ہیں ورنہ رات کو تو سو مر جاتا!"

جاوید بڑی ڈھٹائی سے اب حمیدہ کی پشت سے چمٹا ننھے ننھے ہاتھوں سے اس کی چوٹی کو پکڑے ہو رہا تھا۔

"میں تو جب تک اس کے پاس لیٹی رہوں گی۔ یہ میری بوٹیاں نوچتا رہے گا۔"

"ادھر آ جاؤ میرے پلنگ پر.........." شیخ جی نے لجاجت سے التجا کی۔

لیکن حمیدہ اٹھ کر ناصر کے ساتھ لیٹ گئی۔ نہ جانے کیوں اسے شیخ جی کے تھل تھل وجود سے گھن آتی تھی۔ گہری نیند میں جب ان کا منہ کھل جاتا اور خراٹوں کی ڈاک بیٹھ جاتی تو حمیدہ کو ان سے بڑی نفرت پیدا ہو جاتی تو قدرت کی ستم ظریفی سے حمیدہ کے نان و نفقہ کے کفیل نہ تھے ورنہ حمیدہ کبھی اس پلنگ کا کنارہ بھی نہ چھوتی۔ اللہ ماں! باپ نے بھی کیا دیکھ کر بیاہ دیا تھا۔

جب حمیدہ ناصر کے پلنگ پر چلی گئی تو ننھے جاوید نے پہلے زقند بھری پھر چیخ ماری اور تھوڑی دیر منہ کھول کر روتا رہا۔ شیخ جی نے اپنا بھاری ہاتھ اس کی پشت پر رکھ دیا اور بڑی دیر تک تھپکتے رہے۔ جب نیند کا پورا تسلط ہو گیا تو جاوید ناف کے کونے پوتا آہستہ آہستہ سو گیا۔

ناصر کے ساتھ سر جوڑ کر حمیدہ بولی.........."اس بار پھر آپ ہمیں شریف شاہ کے عرس پر نہیں لے گئے.........ہاں!"

"جاوید چھوٹا ہے اگلے سال سہی۔"

"ہر سال آپ یہی کہتے ہیں۔"

"خدا قسم صرف جاوید کی وجہ سے نہ لے گیا ورنہ اس بار تو شاہ صاحب بھی تمہارا پوچھتے تھے۔"

عرس کی ایک ایک بات ایک ایک لمحہ شیخ جی کی نظروں میں گھومنے لگا۔ بازو اٹھا اٹھا کر گاتی اور گاتے ہوئے پلٹ پلٹ کر دیکھتی عیارتابی بے طور انہیں یاد آنے لگی۔ ایسی دبنگ منہ زور جوانی.........اللہ اللہ اللہ!

---

تابی کو پیشہ کرتے صرف پانچ سال ہوئے تھے لیکن اس تھوڑے سے عرصے میں ایک لکھنؤ قیامت کی شہرت مہمیز کھائے ہوئے گھوڑے کی طرح بہت دور نکل چکی تھی۔ شہرت کو چھوڑیئے وہ تو ہوئی سو ہوئی لیکن

اتنی نامور طوائف نے جب پیشہ چھوڑنے کی ٹھانی تو کوئی بھی عاشق منصۂ شہود پر نہ ابھرا جو اس کے ماتھے کا سیس پھول بن کر باعزت زندگی گزارنے کے لیے ساتھ دیتا۔ ہولے ہولے جہاں پہلے مجیرا بجتا تھا اب وہاں بالا پڑ گیا۔ سارا دن ننھی بسو کو گود میں لیے پہاڑ سے دن کاٹنے لگی۔ کہاں تو شام کے وقت دیدار کے طالب پرے سے پرے ملائے بیٹھے ہوتے تھے کہاں اب بیٹھک میں سوائے گاؤ تکیوں کے اور کوئی بیٹھنے والا نہ رہا۔

اپنی بستی والیوں سے قطع تعلق کرنے کے بعد کچھ روز کو یہ سکون ملا کہ نت نئے قصوں اور بھانت بھانت کی نصیحتوں سے چھٹکارا ہو گیا لیکن جب تابی مکمل ٹاپو بن گئی تو دن کی بے مصرف طوالت سے اس کا جی گھبرانے لگا۔ جب سے تابی نے تیج چڑھنا چھوڑ دیا تھا آپو نے چپ سادھ لی تھی۔ اب دونوں میں مختصر رسمی سی گفتگو ہوتی اور تابی کے دل پر ہر بار چوٹ سی پڑتی۔ اس کا جی کہتا کہ لو صاحب اچھی نیکی کی راہ پکڑی سب نے ٹکسال باہر کر دیا کہاں تو لوگ آنکھوں پر بٹھاتے تھے کہاں اب منہ پر بھی تھک نہیں جھولتی۔

جس دن خورشید علی پروانہ اس سے ملنے آیا وہ اداسی اور خاموشی کے دباؤ سے مجبور ہو چکی تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ کوئی اس کے اس فعل کی تعریف کرے کوئی تو کہے شاباش تابی چاہے بدیر یہ راہ اختیار کی لیکن جزاک اللہ بہت خوب کیا۔ پروانہ صاحب زندگی میں بڑی اونچی باتیں کرتے تھے۔ تابی ان سے داد تحسین وصول کرنے کے لیے نیچے اتری اور بیٹھک میں انہیں بلا لیا۔ پروانہ اس کے کوٹھے پر ہمیشہ مہمان خصوصی بن کر آتا تھا رخصتی کے وقت دامن چوم کر خدا حافظ کہتا۔ اس نے طوائف کے عنوان سے تابی پر ایک سہ غزلہ بھی لکھا تھا جس میں اس نے طوائف کو ہمالہ کی برف' سیپ کے موتی' اچھوتے خواب اور بہشت کی حور سے تشبیہ دی تھی۔ اس سہ غزلہ کے چیدہ چیدہ اشعار وہ عموماً مجروں میں گاتی بھی رہی تھی اور پروانہ صاحب اسے اپنے لیے باعث عزت بھی سمجھتے رہے تھے۔ پروانہ صاحب کو دیکھ کر تابی کا دل رقت' انفعال اور دکھ سے بھر گیا۔ اسے اپنے آپ پر اس شدت سے ترس آیا کہ سلام کا جواب دیتے ہی اس نے پروانہ صاحب کے پاؤں پکڑ لیے اور گڑگڑا کر بولی۔ "پروانہ صاحب مجھے بچا لیجیے۔۔۔ خدا کے لیے مجھے بچا لیجیے۔۔۔۔۔"

پروانہ صاحب آدمی لچلپے تھے۔ تابی کو دونوں ہاتھوں سے اٹھاتے ہوئے بولے "صاحب ہم آپ کو کیا بچائیں گے۔ کیا بدی کیا بدی کا شور با؟" تابی پر نیک باعزت بیوی بننے کا بھوت سوار تھا۔ اپنے مدعا کو ثلاثی صورت میں پیش کرنے کا صبر کہاں' جھٹ کہہ بیٹھی۔ "پروانہ صاحب آپ مجھ سے نکاح کر لیجیے۔ خدا قسم حج اکبر کا ثواب ہوگا۔"

پروانہ صاحب کنی کھا کر دور جا بیٹھے اور گاؤ تکیے کے پھندنے ادھیڑنے لگے۔ جب بہت دیر تک وہ یونہی بیٹھے کنیاتے رہے اور منہ سے کوئی بات نہ نکلی تو تابی ایک بار پھر ہمت کر کے ان کے پاس جا بیٹھی اور

بڑی چارگی سے بولی ۔۔۔۔۔"کیوں پروانہ صاحب' میری بات کا کیا جواب ہے؟۔۔۔۔"

کہاں تو چپ چاپ بیٹھے پھند نے ادھیڑ رہے تھے اور کہاں یک دم کسی منبر سے پھٹ پڑے۔

"کاش تم نے صبر کیا ہوتا۔ یہی بات میں خود تم سے کہنے والا تھا۔ لیکن تم نے سب کچھ چھوڑا' کسبیوں والی بے شرمی نہ چھوڑی' تف ہے ایسی عورت پر جو زیور حیا سے آراستہ نہ ہو۔۔۔۔"

تابی کو اپنی جلد بازی اور بے حیائی پر بہت غصہ آیا۔ تلملا کر بولی۔۔"کیوں پروانہ صاحب میں نے کونسی بے شرمی کی ہے بھلا؟ آپ سے نکاح کی درخواست کی ہے کوئی رات گزارنے کے پیسے تو طلب نہیں کیے۔"

"اور یوں نکاح کا خواستگار ہونا کیا یہ بے شرمی نہیں بے حیائی نہیں۔۔۔ استغفر اللہ!۔۔۔۔"

پہلے ہی چہرے پر جو گال کاٹا گیا تو پھر تابی میں کسی سے عرض مدعا کی ہمت ہی باقی نہ رہی۔ آپو سے بول چال پہلے ہی بند تھی۔ محلے والیوں نے اسے اصل کی نہ پا کر ویسے ہی ترک کر رکھا تھا۔ نادر سے معاملہ یوں ہی چوپٹ ہو چکا تھا۔ زندگی گرمیوں کی دوپہر ہو گئی۔ اٹھتے بیٹھتے خیال آتا کہ یہ پارسائی کی چادر کب تک گرمی دے گی' اگر کسی کا ساتھ نہ ملا تو ٹھٹھر ٹھٹھر کر جوانی کی سرد رات کب تک کٹے گی؟ پھر بچی پر نگاہ پڑتی تو دل دھک سے رہ جاتا۔ اللہ میں تو پارسا بن گئی یہ بن باپ کی بچی کس کی کہلائے گی۔ جوان ہو کر کہاں جائے گی کہاں سے کھائے گی؟ خود میری زندگی کا کیا بنے گا؟ جس رفتار سے وہ بنک کے چیک کاٹ کاٹ کر دے رہی تھی اس رفتار سے تو سارا اثاثہ دنوں کی کھیل تھا۔

اللہ آمدنی کی صورت نہیں اور اخراجات حمل کی صورت ہر دن چند ے دونے ہوئے جاتے ہیں۔

ایسی ہی باتوں نے جب تابی کی زندگی کو کرکرا کر دیا تو ایک شام وہ اٹھی اپنا نیلا پیڈ نکالا' اس پر فرانسیسی خوشبو چھڑکی نادر کو پشیمانی بھرا محبت نامہ لکھا اور نیچے اتری۔ حویلی نما مکان کی نچلی منزل میں تین دکانیں تھیں ایک کمرہ تابی نے طبلچی فتح دین کو دے رکھا تھا۔ فتح دین طبلہ بجانے کے علاوہ سودا سلف لانے اور گھر کے چھوٹے موٹے کاموں میں ہاتھ بٹانے کے کام بھی آتا تھا۔ جب وہ فتح دین کو خط پکڑانے جا رہی تھی تو سامنے شیخ جی نظر آ گئے۔

تابی نے پچھلی مروت کے مارے سلام کو ہاتھ اٹھایا۔ شیخ جی مسکراتے مسکراتے آگے آ گئے۔ اخلاقی جرات کی تابی میں کمی تھی ورنہ انہیں ڈیوڑھی سے نکال دیتی۔ ہنس کر ایک طرف ہو گئی اور شیخ جی اندر آ گئے۔

اور۔۔۔تابی کی زندگی کا ایک نیا باب شروع ہوا۔

---

حمیدہ نے دھموکا مار کر جاوید کو یوں دھکا دیا کہ چھوہے برابر بچہ نالی میں گرتے گرتے بچا۔ خالہ اصغری نے ناک پر انگلی رکھ کر اسے فوراً ٹانسا۔۔۔۔ "کیوں اپنا غصہ اس بے زبان پر نکالتی ہو۔ میں تمہاری جگہ ہوتی تو اس بدبخت تائی کی آنکھیں نوچ لیتی۔ پر تم کو تو تمہاری نیکی نے مارا۔۔۔ہاں"

حمیدہ کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی کیٹنی میں بڑھنے والی چھاؤں کی طرح آ کر بیٹھ گئی۔ خالہ اصغری نے پیڑھی کو چوتڑوں سے گھسیٹ کر اس کے قریب کر لیا اور رازداری سے بولیں "بھئی تم نام خدا معصوم ہو دین دار ہو تمھے خاندان کی ہو تم کو مرد ہتھیانے کہاں آئیں۔ یہ طوائفیں تو سارے موئی منتر جانتی ہیں۔ جانے کیا تعویذ گنڈا کر دیا ہے اس چلتر باز نے شیخ جی پر!"

کیٹنی کی چھاؤں ساون کے بادلوں میں بدل گئی اور بوندا باندی ہونے لگی۔

"یہ کام تو سفلی ہیں' سفلی کام انہی لوگوں کو آتے ہیں۔ گھر کی شریف بیبیاں ان باتوں کو کیا جانیں۔ لیکن بھئی میں ضرور کہوں گی خبردار رہو وہ شیخ جی نکاح ہی پڑھوا لیں اس کنجی کے ساتھ!"

حمیدہ دانتوں میں تنکا لیے ٹھہری بیٹھی تھی۔ نکاح کے نام پر کسمسائی۔ ایک روز شیخ جی کا اس سے بھی نکاح ہوا تھا۔ آج بھی اس دن کے تصور سے اسے ابکائیاں سی آنے لگیں۔ اللہ اسے تو پہلے دن سے شیخ جی برے لگے تھے موٹے سے بھدے سے' ازبک سے! کہیں جوان سے رزق کی ڈوری نہ بندھی ہوتی تو' لیکن اب تو بندھی تھی اسی لیے وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی' "اللہ نہ کرے خالہ جو کہیں نکاح ہی پڑھوا لیا تو پھر میں یہاں کیوں رہوں گی؟"

خالہ اصغری سے عطر پھلیل کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔ کانوں میں موتیا کے پھول۔ ہونٹوں پر لاکھا رنگ دنداسے کی رنگت۔ بڑی طرحداری سے کلیوں کا ہار کنتی پر تھما کر بولیں "تمہاری رہتی ہے جوتی! ان کو کیسی پیاری ہے تو پھر تم کیوں دین ہاتھ سے جانے دو۔ کل کو اس چنڈالنی کی اولاد تمہاری اولاد کی بہن بھائی ہی تو کہلائے گی۔"

برستے بادلوں میں سے بجلی کڑکی۔۔۔۔ "ہائے اللہ نہ کرے ہائے اللہ نہ کرے تو پہ خالہ بیت منہ سے کچھ تو بھلی بات نکالا کرو۔۔۔۔"

"بھئی میں تو کشمیری بازار جا رہی ہوں۔۔۔۔ کلیجہ پھٹا جا رہا تھا تمہارے دکھ سے' دل میں سوچا حمیدہ کو ملتی جاؤں کہو کچھ منگوانا تو نہیں کشمیری بازار سے؟"

خالہ اصغری گئیں تو پھوپھی جمال آرا آ گئیں۔

دو گھنٹے وہ بیٹھی باز پرس کرتی رہیں اور حمیدہ کم نظری بنی گم سم بیٹھی رہی۔ دراصل یوں تو شیخ جی

سے ہیرا منڈی کا تعلق پرانا تھا۔ لیکن اس رابطے کو سوائے حمیدہ کے اور کوئی نہ جانتا تھا۔ بلکہ حمیدہ کو تو الٹا سکھ تھا۔ گند سنبھالنے کو کوٹھے والیاں اور سکھ پانے کو حمیدہ۔۔۔۔ لیکن کچھ عرصے سے وہ تابی کے ہاں بڑے تواتر سے آنے جانے لگے تھے۔ جیسے تیز گام وقت مقررہ پر آتی ہے۔ ادھر دودھ والے کا ریڑھا گلی میں داخل ہوتا ادھر شیخ جی سیاہ اچکن' جناح کیپ' پشاوری چپل پہنے نکڑ پر پہنچتے۔ دودھ والا سلام کرتا۔ ادھر سے سر کے اشارے سے جواب ملتا علیک سلیک ہوتی۔ لیکن اتنی صبح وہ کدھر سے آتے ہیں اس بات کا بھید کچھ زیادہ عرصہ قائم نہ رہ سکا۔ لوگوں نے بہت جلد خطوط وحدانی میں چھپے ہوئے راز کو پا لیا۔ بات کا نکلنا تھا کہ حمیدہ کے لیے ہمدردی کا ایک انوکھا باب کھل گیا۔ ہائے ہائے تف تف بیچاری ماری گئی اوئی اللہ ہائے توبہ نوج۔۔۔۔ کی بوچھاڑ سے حمیدہ کے دل کا آنگن بالکل بھیگ گیا۔

---

سانپ تو نکل گیا مگر راستہ برا پڑ گیا۔ تابی نے بازار حسن بھی چھوڑا اور شیخ صاحب کی بیوی بھی نہ بن سکی۔ بیٹھے بیٹھے جی میں خیال آتا کہ وہ نہ سو جوتیاں بھی کھانا پڑیں اور سو پیازیں بھی زہر مار کرنا ہوں۔

شیخ جی چالیس کے پیٹے میں تھے اور تابی کی عمر بیس سال سے زیادہ تھی ایک تو عمر میں بیس برس کا فرق تھا۔ دوسرے شیخ کی صحت بالو کا ڈھیر تھی۔ تو تھیبو کر کے گھر بناتے ادھر دو بوند پانی کے پڑتے اور اَرا اَرا اَرا دھم ساری عمارت زمین پر۔ چھینک کیا آتی سارا سینہ بلغمی ہو جاتا۔ ذرا سی سردی پڑتی اور جوڑ جوڑ میں ورم آ جاتا۔ بند بند دکھنے لگتا۔ کبھی سانس اکھڑا ہوا ہے۔ کبھی نسیں کھینچی چلی جاتی ہیں کا ٹھی اچھی تھی شکل وصورت بھی بھولی بھالی تھی پر ایسے تنا ور درخت کو اندر ہی اندر دیمک نے چاٹ لیا تھا۔ تال کھانے جیسی رنگت اور عناب کے ہونٹوں والی تابی ان کی پوتی لگتی۔

عجیب سی بات تھی کہ نہ تو شیخ جی کی صحت پر تابی کو کوئی اعتراض تھا نہ ان کی عمر پر۔۔۔۔ اسے تو الٹا یہی ان کی خوبیاں لگتی تھیں۔ ایسے بیمار شخص کو کسی ساتھی کی ضرورت تھی لیکن مشکل یہ تھی کہ شیخ جی تابی کو ساتھی تو بنائے ہوئے تھے پر نکاح کی بات دو سال سے کھٹائی میں پڑی تھی۔ نکاح کا وعدہ تو شیخ صاحب نے بڑی فراخدلی سے کیا تھا لیکن آج کل کرتے دو سال بیت گئے۔ کبھی تابی کے منہ سے نکاح کا نام سن لیتے تو فوراً کھوں کھوں کرنے لگتے۔ فوراً یا تو سردی لگ جاتی یا جوڑوں کا درد ابھر آتا۔

شیخ جی کچھ ایسے بدنیت بھی نہ تھے پر فی الحال اپنے آپ کو پابند بھی نہ کرنا چاہتے تھے۔ ہر طرح سے تابی کا خیال رکھتے۔ ننھی بسو سے باپ کی سی محبت برتتے۔ خرچ اخراجات کے وہی کفیل تھے۔ پر جس کو مفت دودھ ملے وہ بھینس کا جھنجھٹ کیوں پالے؟؟ ادھر تابی کو کھونٹے سے بندھنے کا ایسا سودا ہوا تھا کہ دن

رات یہی دکھ کھائے جاتا کہ یہ زندگی پہلے سے بھی پلید ہے۔ رہ رہ کے سوچتی کہ شیخ جی کے ٹکڑوں پر پلنے سے تو بہتر تھا کہ اپنی جوانی پر اعتبار کیا ہوتا۔ وادی سم وادی سروں کی سمجھ تھی۔ گلے میں قدرتی سرتیاں بھری تھیں شکل وصورت بھی کشمیرنوں جیسی گوری چٹی ۔۔۔ کچھ دیر اور لیلا وتی بنی رہتی تو کم از کم کچھ اثاثہ ہی جمع ہو جاتا۔ پھر یہ اطمینان ہوتا کہ جو ظاہر ہے وہی باطن ۔۔۔ جیسی باتیں ہیں ویسے ہی اعمال۔

بیچاری تابی کی تو وہی حالت ہو چکی تھی کہ کبھوں تو ماں ماری جائے نہ کبھوں تو باؤلا کتا کھائے۔ ادھر شیخ جی سے اسے ستی ساوتری جیسی محبت ہو چکی تھی۔ شیخ جی کو دیکھ کر سارے پاپ کٹ جاتے' سارے گلے بھول جاتے لیکن جب اکیلی ہوتی تو ضمیر دستایوں داشتہ بنی رہنا اس کے ضمیر کے منافی تھا ادھر آپو سارا دن اسے طعنوں سے گانستی رہتیں۔ اس رسہ کشی کو تابی اندر ہی اندر برداشت کرتی رہی۔ لیکن ایک روز اس کا کلیجہ شق ہو گیا۔

اس روز تابی کو بلبلا کر بخار چڑھا۔

بسو ماں کو پلنگ پر بے سدھ لیٹے دیکھ کر بات بے بات ضد کرنے لگی۔ کبھی یہ دو کبھی وہ لے دو۔ نوکرانی پل پل باہر لے جاتی لیکن ہر بار بسو کہتی۔ ٹیں ٹیں ٹیں ۔۔۔ آخر پتہ چلا کہ کہیں ہمسائے میں نئی گڑیا دیکھ لی ہے کسی کی وہ مانگتی ہے۔ شیخ صاحب تابی کی کلائی پکڑے کرسی پر بیٹھے تھے تھک ہار کر تابی بولی ۔۔۔ "اللہ! شیخ جی انار کلی لے جایئے اور ویسی گڑیا دلوا دیجیے۔ اس کا رونا سن سن کر تو سر پھٹنے لگا ہے۔"

انار کلی بازار کا سنتے ہی بسو لپک کر شیخ جی کے کندھے سے چمٹ گئی اور تب تک چمٹی رہی جب تک گال پر کارکی لکیریں نہ پڑ گئیں۔ تابی تو حکم لگا کر نچنت ہو گئی لیکن شیخ جی کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ تابی یا بسو کو لے کر وہ آج تک باہر نہ گئے تھے۔ کھنگار کھنگار کر بہانے بناتے رہے۔ کبھی کہتے اس حال میں تمہیں چھوڑ کر کیسے جاؤں؟ کبھی کہتے اب تو شام ہو رہی ہے۔ ابھی بچی سو جائے گی۔ شیخ جی نے بہت پینترے مارے مگر تابی کو آج بسم اللہ کی ضد بہت پیاری تھی۔ بال ہٹ میں تریا ہٹ بھی شامل ہو گئی۔

بخار میں تپی ہوئی آنکھیں کھول کر تابی نے پوچھا "ہیں بات کیا ہے آپ بچی کو لے جاتے کیوں نہیں؟ ۔۔۔۔"

پوکھر کے تھرے پانیوں میں انگارے دہکتے دیکھ کر شیخ جی بدک گئے اور اٹھ کر کھڑکی کی طرف چلنے لگے۔

"آپ سچ سچ اصلی وجہ بتا دیں شیخ صاحب ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہو گا۔"

شیخ صاحب کو سچ بولنے کی عادت نہ تھی مگر تابی کے مزاج سے بھی خوب واقف تھے۔ سہمے سہمے

لہجے میں بولے۔" بھلا میں اسے کیسے انارکلی لے جاؤں؟ کوئی واقف ہی مل گیا اگر؟ ساری بات کھل جائے گی۔۔۔۔۔"

اب تک تابی نے عطر کے پھوئے کی طرح شیخ جی کے ساتھ محض خوشبو بھری باتیں کی تھیں یہ جواب سنتے ہی وہ کٹ گئی۔ کچھ بخار سے تمتمائی بیٹھی تھی کچھ غصے نے آنچ دی شعلہ جوالا بن کر پلنگ سے نکل آئی۔

شیخ جی اس بپھری ہوئی پلنگ زادی کو دیکھ کر دس قدم پیچھے ہٹ گئے اور کھڑکی کے شیشے کو ٹکا ٹکا کر بینڈ بجانے لگے۔ ان کا خیال تھا ننھی بسو کو یوں بہلاتے دیکھ کر تابی کا دل پسیج جائے گا۔ لیکن جوار بھاٹا بڑھا چلا آرہا تھا۔

"کیا بات کھل جائے گی شیخ جی؟۔۔۔۔۔"

شیخ جی نے سنی پھر ان سنی کر دی اور شادو کو گانا سنانے لگے۔

"میری طرف دیکھیے شیخ صاحب میری طرف۔۔۔۔۔"

"تم کو بخار ہے خواہ مخواہ بستر سے نکل آئی ہو۔۔۔۔۔۔"

"آپ بخار وخار رہنے دیجیے۔ ایسی ہمدردیاں بہت ہو چکیں۔ میری طرف دیکھیے۔"

بڑے تردد سے شیخ جی نے تابی سے نظریں ملائیں۔

"آپ کا بسم اللہ سے رشتہ کیا ہے؟۔۔۔" تابی ترشول کی طرح تنی کھڑی تھی۔

"بیٹی ہے۔۔۔ کمال ہے یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے!"

تابی غصے میں کانپ رہی تھی سنگار میز کا سہارا لے کر بولی۔" اور مجھ سے آپ کا رشتہ کیا ہے شیخ صاحب؟"

"یہ آج تمہارے سر پر سینچر کیوں سوار ہو گیا ہے۔۔۔؟" شیخ صاحب اصل موضوع پر چپ جمائے رکھنا چاہتے تھے۔

"میرا آپ کا رشتہ کیا ہے؟۔۔۔۔۔" تابی اب ان کے بالکل سامنے کھڑی تھی۔

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔۔۔۔"

"آپ کے نزدیک تو بالکل اہم بات نہیں لیکن میری تو جان پر بن آئی ہے۔"

تابی چیخ کر بولی۔

"میں۔۔۔ تم۔۔۔۔۔ میری بیوی ہو تابندہ! آج تمہیں ہو کیا گیا ہے خدا کے لیے لیٹ جاؤ ہوا

لگ جائے گی۔"

چراغ پا تابی بولی۔۔۔" بیوی تو ہوں شیخ صاحب لیکن بغیر نکاح نامے کے۔۔ میں نے تو کبھی پن چھوڑ کر بھی پیشہ ہی کیا۔ لیکن آپ کو شرم نہیں آتی آپ تو بڑے دین دار وضع دار معزز شہری ہیں۔"

شیخ جی بسم اللہ کو کندھے سے لگائے کھڑکی کے پاس بیٹھ گئے اور یہ موٹے موٹے آنسو گرانے لگے کہاں تو تابی بپھری لہر بن کر اٹھی تھی اور کہاں دیسی صابن کی جھاگ بن کر بیٹھ گئی۔ موٹے موٹے آنسو اور وہ بھی شیخ جی کی فربہ گالوں پر۔ تابی انہیں کھدر کرنے کا سوچ رہی تھی لیکن بھاگ کر ان کے پاس جا بیٹھی اور آنچل سے آنسو پونچھنے لگی۔

"شیخ جی کیا بات ہے؟ طبیعت تو ٹھیک ہے ناں۔ لائیے بسم اللہ کو مجھے دے دیجئے۔"

شیخ جی نے بسو کو اور بھی بھینچ کر سینے سے لگا لیا اور ناک سے شنک شنک کی آوازیں نکال کر رونے لگے۔ تابی بے تاب ہو کر کمرے میں پھرنے لگی۔ اسے سمجھ نہ آ رہی تھی کہ اپنے سے بیس برس بڑے مرد کو کیسے چپ کراتے ہیں۔ ویسے بھی اسے اب شیخ جی اتنے اچھے لگنے لگے تھے کہ ان کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر پشیمان نہ ہونا اس کے اختیار کی بات نہ رہی تھی۔ ادھر شیخ جی گلے کا گھنگھرو بجا بجا کر کہہ رہے تھے۔" خدا قسم میری نیت نیک ہے۔ مجھے تمہاری قسم تابی نکاح میں ضرور پڑھوالوں گا اور پڑھواؤں گا بھی لیکن جس علاقے میں تم رہتی ہو۔۔۔ وہاں ۔۔۔۔۔ وہاں رہ کر ایسے کیونکر ہو سکتا ہے۔ اگر کہیں تم باہر مکان لے لو تو۔۔۔ تو کیا مجال جو میں رتی بھر حیل و حجت کروں۔۔۔۔ خدا قسم تابی۔۔۔۔۔۔"

تابی واپس پلنگ پر چلی گئی۔ جیسے ایک سوچھ بخار میں برف کا غسل لے چکی ہو آہستہ سے بولی۔۔۔" شیخ جی آپ نے پہلے ہی کیوں نہ کہا۔ میں آج ہی سیدو دلال کو بلا کر گلبرگ میں کوٹھی لوں گی۔ خرچ ورچ آپ کے ذمے نہیں ہوگا۔ جب نہ ہوں گے آپ ہی سے لینے ہیں ناں!۔۔۔ لائیے بسو کو میرے پاس ڈال دیجئے۔ ہائے بیچاری روتے روتے سو گئی۔"

---

تابی کو گلبرگ میں آئے دو مہینے ہو چکے تھے لیکن کسی دن تو وثیقہ نویس نہ ملتا تھا کسی دن نکاح پڑھوانے والے مولوی کے گردے میں درد ہونے لگتا۔ یہ دونوں مل جاتے تو گواہ کچہریاں بھگتنے چلے جاتے۔ غرضیکہ شاہی مسجد کے پچھواڑے سے اٹھ کر آنے کا فقط ایک نفع ہوا۔ وہاں سارا محلہ جانتا تھا۔ سارے کام گھر بیٹھے ہوتے۔ گلبرگ میں اکنی کی جگہ روپیہ خرچ ہونے لگا۔ پھر تابی کے لیے اس نئے ماحول میں ایک اور بڑی مشکل در پیش تھی۔ اپنے محلے میں ان کی پرانی ساکھ تھی حیثیت عرفی سے سب واقف تھے۔ یہاں محل نما کوٹھی

میں رہت سہت تو تمام بیگموں کی سی تھی۔ لیکن جی کا پور جینے نہ دیتا تھا۔ ہر وقت لوگوں سے چھپی رہتی تھی۔ یہی سوچ کر کسی سے نہ ملتی کہ اپنا تعارف کس نام سے کراؤں؟ خیال تو تھا کہ کوٹھی لیتے ہی پاسہ پلٹ جائے گا لیکن ہوایوں کہ بچاری اور دبدھا میں پڑ گئی۔ گلبرگ کی کوٹھی تابی کو کڑی نظر آنے لگی لیکن شیخ جی سے کہی ہوئی بات کا بھرم رکھنے کے لیے چپکی بیٹھی رہی۔۔۔۔۔۔

اور سب سے بڑی بات یہ بھی تھی کہ خدا جانے کیوں اور کیسے اسے شیخ جی سے عشق ہو گیا تھا۔ اس خیال سے ہی جی لرزا اٹھتا کہ وہ جو کہیں شیخ جی نے بالکل چھوڑ دیا تو کیا بنے گا؟ ویسے بھی تابی میں نخاس والیوں جیسی بے لحاظی نہ تھی۔

ہر بات کا الزام گھوم پھر کر نہ جانے کیسے اپنے سر منڈھنے کی عادی تھی۔ دو مہینے گزر گئے اور شیخ جی پر دباؤ ڈالنے کی ہمت نہ پڑی ادھر شیخ جی تابی کو گلبرگ پہنچا کر نچنت ہو گئے۔ روز ہیرا منڈی جانے کا کھٹکا کم ہوا تو نسل دار لوگوں کی طرح فوراً اپنا وعدہ بھول ناک میں نسوار لے خاموش ہو رہے۔ شاید اسی طرح کچھ برس اور گزر جاتے لیکن حالات نے یکدم کروٹ لی۔

برسات کا موسم تھا۔ کینال پارک کی جانب سے آندھی تیز تھی۔ گھنٹوں ہوا نشہ پانی کیے کھڑکیاں دروازے توڑتی رہی۔ شام کوٹھی کی تیس موزیک کے فرش پر سے دھلواتی ہوئی تابی نے دیکھا کہ ٹیکسی میں سے شیخ صاحب اتر رہے ہیں۔ ساتھ دو کھانچے آم کے اور ایک کھوکھا آلو بخارے کا چلا آ رہا ہے۔ ابھی وہ سب بیٹھے برف لگے آلو بخارے کھا ہی رہے تھے کہ شیخ جی کو دو چھینکیں آ گئیں۔ ساتھ ہی سر میں ایسا شدید درد اٹھا جیسے کوئی پھاوڑے سے بھیجا نکال رہا ہو۔ تابی نے اسپرو پلائی تو انہیں تے آئی کہ آنتیں الٹ گئیں۔

شیخ جی چارپائی پر پڑ گئے۔

بیس دن تابی نے شیخ جی کی وہ خدمت کی کہ پتی ورتا ساوتریوں کے تمام ریکارڈ توڑ دیے۔ کچھ تو شیخ جی تابی کے حسن سلوک سے متاثر ہوئے کچھ اپنے بچنے کی امید نہ تھی۔ دل میں رہ رہ کر یہ خوف ابھرتا کہ قبر تک سانسوں کا فاصلہ ہے۔ اس عورت سے جھوٹا وعدہ کر کے گیا تو مشتبہ شکل ساتھ لے کے جانا ہوگا اور پھر جانے کیا ہو؟

ایک روز نیم بے ہوشی کے عالم میں شیخ جی نے آپو کو بلایا اور مولوی صاحب کو بلوا بھیجنے کی تاکید کر دی۔ رات کو جس وقت سفید کپڑوں میں ملبوس رانڈوں کی طرح چونڈا کسے ننگی بوچی تابی کا نکاح پڑھوانے تین آدمی آئے وہ ہاتھ میں شیخ جی کا استعمال شدہ بیڈ پین لیے غسل خانے کی طرف جا رہی تھی۔

---------------------------

سارے محلے کی زبان پر اس کے لیے ہمدردی کے بول تھے۔

پہلے خالہ اصغری آئیں۔ عطر پھلیل سے آنگن مہک گیا۔ کلیوں والے ریشمی برقعے کو چارپائی پر قرینے سے رکھ کر وہ بھائیں بھائیں رونے لگیں۔ خالہ کے جاتے ہی پھوپی جمال آرا آگئیں۔ ان کے ساتھ ان کی دونوں کم عمر نیدی بھتیجیاں بھی تھیں۔ بڑی دیر تک شیخ جی کا کیریکٹر زیر بحث رہا۔ پھوپھی گئیں تو منہ بولی بہن زاہدہ کا تانگہ بمع سات بچوں کے آگیا۔

دو کریٹ کوکا کولا کے ختم ہو گئے۔ ساتھ ہی ساتھ اتنے آنسو بہائے گئے کہ کوکا کولا کا سارا کھارا پن ختم ہو گیا۔

سارا دن ہمدردیوں کی ڈاک بندھی رہی۔ ہرکارے پر ہرکارہ آتا رہا۔ رات آئی تو حمیدہ کا بند بند دکھنے لگا یوں محسوس ہوتا تھا جیسے پچھی مار مار کر کسی نے ادھ موا کر دیا ہو۔ بڑی دیر بیٹھی سوچتی رہی اب کیا کرنا چاہیئے؟ غیرت برتوں اور گھر چلی جاؤں یا چپ چاپ روٹی کپڑا حلال کیے جاؤں اور اپنے بچوں کا بھلا چاہوں۔؟ شیخ صاحب کے ساتھ محبت یا مروت کا سوال تو پیدا ہی نہ ہوتا تھا۔ اسے تو ان کا تھل تھل وجود دیکھ کر ہی وحشت ہونے لگتی تھی۔ پھر سوتے میں ان کے نرخرے سے جو آوازیں نکلتی تھیں ان سے حمیدہ کو بڑی وحشت تھی۔ صحت ان کی بالو کا ڈھیر تھی۔ دبانے 'سینک دینے' مزاج پرسی کرنے کا نہ تو حمیدہ کا شوق تھا نہ وقت۔ ویسے بھی وہ ہمیشہ سے کہتی آئی تھی کہ وہ بیوی ہے نرس نہیں۔ لیکن اب تو ایک کسبی سے مقابلہ آ پڑا تھا۔ ڈوم ڈھاڑیوں کے آگے وہ ہار ماننے والی تھوڑی تھی۔ وہ تو اودبا کر میکے چلی جاتی۔ لیکن کار بنگلہ قالین فریج سب سے ہاتھ دھونا پڑتے تھے۔ اور پھر کون جانے شیخ جی نان نفقہ کے بھی پیسے دیں نہ دیں۔ یہ خوف جان کالا گو ہو رہا تھا۔ ادھر جس طرح تابی نے اڑنگا دے کر پچھاڑا اس پینترے کی تو یہی شرط تھی کہ ایسی روٹھ کر میکے جائے کہ شیخ جی یا تو تابی کو طلاق دے دیں یا ہمیشہ کے لیے حمیدہ سے کٹا پٹی ہو جائے۔

محلے والیوں کی ہمدردی بھرے جملے ٹپکے کے آنسوؤں کی طرح تھوڑی تھوڑی دیر بعد کانوں میں بھد بھد گرتے تھے۔۔۔۔۔۔ "ارے یہ طوائفیں مردوں کو مٹھی میں لینا جانتی ہیں' تم یہ فن کیا جانو۔۔۔"

"دیکھا میں نہ کہتی تھی حمیدہ۔۔۔۔۔۔ کوئی مردوں کو بھی یوں آزاد چھوڑ دیتا ہے؟"

"تم کو کیا معلوم؟ کیا کیا کرتی ہیں یہ کوٹھے والیاں۔۔۔۔۔۔"

"اللہ جی! اب رنگ لائی ٹھہری۔۔۔۔۔۔ ہم بھی کہیں یہ شیخ جی روز روز کہاں جاتے ہیں۔"

بڑی دیر حمیدہ بیٹھی سوچتی رہی۔ پھر اٹھی صندل کا شربت' دو گھونٹ حلق میں ٹپکایا۔ نائیلون کے دوپٹے سے آنکھ کے کونے کو پونچھا اور جی کو پچکار کر بولی۔۔۔۔۔۔

"چلو ہمیں کیا؟ نکاح پڑھوالیا تو اچھا کیا۔ ہماری جان چھوٹ گئی۔ روز ہماری بوٹیاں توڑ توڑ کر کھاتے تھے۔ لیکن ہم اپنا گھر کیوں چھوڑیں۔ آپی خرچا دیں گے۔ جب دوہری چپا پڑے گی تب عقل ٹھکانے آئے گی۔"

ساری فکر حمیدہ کو اپنے ماہانے کی تھی۔ بار بار سوچتی کہ وہ جو کہیں اس مال زادی نے خرچ بند کروا دیا تو کیا ہوگا؟ رفتہ رفتہ اپنی کم نصیبی کی عظمت سے وہ کچھ اس طرح متاثر ہوئی کہ اٹھ کر ململ کا سفید دوپٹہ کانوں کے دونوں طرف اڑس لیا اور تکیے پر یوں آلیٹی جیسے حنوط شدہ قدیم مصر کی کوئی شہزادی ہو۔

آنسو آہستہ آہستہ کانوں کی طرف بڑھنے لگے۔

ٹپ ٹپ۔۔۔ بوند بوند

تکیہ بھیگنے لگا۔۔۔۔ لیکن عجیب سی بات تھی اتنے سارے آنسوؤں میں ایک آنسو بھی شیخ جی کی یاد میں نہ تھا۔ سب اپنی بدنصیبی، اپنے بچوں کی بدنصیبی، اپنے مستقبل کے اندھیرے پن پر مچل رہے تھے۔

---

بارش آہستہ آہستہ برس رہی تھی۔

تابی کی نگاہیں بار بار پلنگ کا طواف کرتی تھیں۔ کھڑکی میں بیٹھے اسے لگ رہا تھا جیسے وہ صندوقی ہودج میں بیٹھی تسخیر آفتاب کا منتر پڑھتی کسی مہم سے لوٹ رہی ہے۔ سارے گھر میں سکھ شانتی کا پھریرا لہرا رہا تھا۔ گو باہر بوندیں برس رہی تھیں لیکن گھر کے اندر باہر سردیوں کی گرم گرم دھوپ کا سماں تھا۔ آج بادلوں میں مایوسی، تھکان اور آنسو نہ تھے۔ بلکہ آج تو اودے اودے دوپٹے اوڑھے کندھوں پر برنجی گاگریں اٹھائے رادھا نگری سے گوپیاں قطار در قطار پانی لا رہی تھیں۔

تابی کی چنگاسی نگاہیں سوئے ہوئے شیخ جی پر منڈلا رہی تھیں۔

یہی مرد کل تک شیخ صاحب تھا۔ اس سے اسے محبت تھی لیکن اس کے وجود سے تابی کے انگ انگ میں گناہ کی خارش اٹھتی تھی۔ ضمیر کے تازیانے کسی گھڑی اپنی کارگزاری بند نہ کرتے تھے۔ تابی کا سب کچھ پہلے بھی شیخ صاحب کے لیے تھا۔ لیکن نکاح کے دو بول اس گھر میں کیا سر ہوئے سارے گھر میں اس شخص کے وجود سے بہار آ گئی۔ تابی کو شیخ جی کی ہر بات اچھی لگتی تھی۔ بلاوجہ۔ احمق پن کی حد تک۔

آپو کو یہ اعتراض تھا کہ شیخ جی موٹے بہت ہیں اور عمر میں تابی سے بڑے بھی بہت ہیں۔ آپو کے سامنے تابی چپ رہتی لیکن اکیلے میں تابی سوچتی موٹے ہیں تو کیا ہوا؟ شوہر موٹا نہ ہو تو رعب والا نہیں لگتا۔ عمر مرد کی عورت سے بڑی ہی ہونی چاہیے ورنہ شادی کے دسویں سال میاں بیوی کا رشتہ ماں بیٹے کا نظر آتا ہے۔ ان کی بیماری سے بھی تابی کو مریضانہ لگاؤ ہو گیا تھا۔ سوچتی وہ تو شیخ جی قسمت سے بیمار رہتے ہیں ورنہ ان

ہاتھوں کو ان کی خدمت کا موقع ہی کب ملتا؟

شادی سے پہلے محض ایک وعدے کی بنا پر تائی شیخ جی کی ہو چکی تھی۔ تن من دھن سے ان کی نام تھی۔ اب تو ہر پل احسان مندی سے بھی دل ڈوبا چلا جاتا تھا۔ اس کا جی چاہتا اٹھ کر شیخ جی کے پاؤں چوم لے۔ اپنے چمڑے کے سلیپر بنوا کر شیخ جی کے گدگدے پیروں میں پہنا دے۔۔۔ اللہ مجھ راندی ہوئی سے شیخ جی نے نکاح پڑھوایا۔ مجھ بازار والی کو یہ عزت بخشی۔ کوڑے کی ٹوکری کو سر پر اٹھایا۔ جب یہ باتیں اس کے ذہن میں آتیں تو شیخ جی کی محبت کا سوتا جسم پر آبشار بن کر گرتا اور روح تک کو سرشار کر جاتا۔ اس محبت میں اندھیرے بادلوں کی سی ستر پوشی تھی۔ حضرت بلال کی سی عبودیت تھی۔ رام رام سمرن کرتی چتا کے گرد چکر لگاتی پدمنی کی لگن تھی۔

تائی آہستہ سے صندوقی ہوونج سے اٹھی اور سوئے ہوئے شیخ صاحب کے پیروں پر سر رکھ کر ہولے ہولے رونے لگی۔

---

حمیدہ اٹھی تو طوفان بن کر لیکن نصیب برگشتہ کی طرح پھر ڈھیر ہو کر چوکی پر بیٹھ گئی۔

ماموں نے چھٹی مرتبہ وہی بات کہی۔۔۔۔۔۔ ''لیکن اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ شیخ صاحب دوسرے نکاح کے بعد بھی حمیدہ کی کفالت کرتے رہیں گے؟۔۔۔۔۔۔ اس سارے معاملے کا تو بس ایک ہی حل ہے کہ کسی طرح شیخ صاحب اس بدمعاش کو چھوڑ دیں۔''

جہاں تک حمیدہ کا تعلق تھا وہ یہ چاہتی تھی کہ شیخ صاحب چاہے جسمانی طور پر تائی کو چھوڑیں نہ چھوڑیں لیکن چلتے لکھ دیں کہ اس کا ہزار روپیہ ہر ماہ ٹھہرا رہے گا۔ ایک طرح سے تو وہ خوش تھی کہ گناہ میٹنے کو ایک دوسری آ گئی لیکن مشکل یہ آن پڑی کہ بقول ماموں تائی کیسی تھی رنڈی تھی روپے پیسے کی لوبھی وہ کب تک برداشت کرتی رہے گی کہ حمیدہ کو ہزار روپیہ ماہوار مفت کا ملتا رہے۔

''ارے تم نہ ڈرو حمیدہ ہم تمہاری پشت پر ہیں۔ ادھر تو کارخانے کو انڈسٹری کے ڈائریکٹر سے کہہ کر بند کروا دیں گے ادھر پٹرول پمپ سے نہ نکلوا دیا تو کہنا۔ جب بزنس کا دریچہ بند ہوا تو یہ ساری محبت آپ ہی آپ دم بخت ہو جائے گی۔''

حمیدہ ڈر گئی۔ محبت کو دم بخت کرنے کا یہ طریقہ اسے ایک آنکھ نہ بھایا۔ اللہ وہ جو کہتیں ہے ایسا علاج ہو کہ سانپ بھی مر جائے اور بزنس کی لاٹھی بھی سلامت رہے تو ہی لطف ہے۔

خالہ اصغری ریشمی بدھنے کو اٹھا کر بولیں ''بھائی جی ہماری حمیدہ تو سیدھی سادی ہیں آپ خود جا

کر اس کل موہی سے ملیے ۔۔۔۔۔۔اس رنڈی کے ہتھکنڈے بیچاری یہ کیا جانے ۔۔۔۔۔۔"

"مشکل تو یہی ہے اگر شیخ صاحب نان ونفقہ کے ضامن بھی بن گئے تو کوٹھے والی کیسی کب کفیل رہنے دے گی۔ شیخ صاحب کو تو واپس ہی لانا پڑے گا۔۔۔۔۔ ہر قیمت پر۔۔۔"

اپنے ساتھ والے پلنگ پر تھل تھل کرتے ہوئے نرخرے سے بھیانک آوازیں نکالتے شیخ جی کے تصور سے ہی حمیدہ لرز گئی۔ اس کے دل کے آنگن میں پرانی آسی پر شیخ جی کی وہ ساری باتیں افسوس کرنے آ بیٹھی تھیں جن کا شیخ جی کی محبت سے کوئی رشتہ نہ تھا۔ رنڈی کے ہاتھوں خرچ بند ہو جانے کا خدشہ تو تھا ہی دوبجے یہ واہمہ ستاتا تھا کہ سارے میں تھک گئی ہوگی ہماری توپ کو کیسی انجک چاٹ گئی کہ شیخ جی جیسا کو دن شکار ہاتھ سے جاتا رہا۔

جب ماموں نے گلبرگ جانے کا قصد کیا تو خالہ اصغری نے بچوں کو گندے میلے کپڑے پہنا کر یتیموں کی ساری خوبیاں پیدا کر کے ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر لا بٹھایا۔ پہلے تو حمیدہ ساتھ جانے پر رضامند نہ ہوتی تھی لیکن جب اٹھارویں مرتبہ چلتے چلتے ماموں بولے۔" دیکھ لو حمیدہ! وہ حرفہ باز بے مات دے گی تمہیں یہ مت سمجھنا کہ ایسی عورتوں کے وعدے اعتبار کے قابل ہوتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ سامنے ضرور مان جائے گی لیکن ایسی عورتوں کا کیا اعتبار۔ بہتر تو یہی تھا کہ تم ساتھ چلتیں اور کسی طرح شیخ جی کو لوا لاتیں ورنہ ان کے چلتر تم کیا سمجھو آنکھوں میں مٹھیاں دے دے کر رو دو گی۔"

حمیدہ خوفزدہ ہو کر پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔

ادھ کھلی کھڑکی سے سر اندر ڈال کر خالہ اصغری بولیں۔۔۔۔" اے حمیدہ! جب ماموں دیکھ چکیں تو پھر دلار سے کام لینا کہیں پھانسا ہوا شکار نہ بدکا دینا۔ وہ تو ایسے سب گن پڑھی ہیں۔ میں تم کو تاکید کرتی ہوں لگاوٹ کی باتیں کرنا لگاوٹ کی۔۔۔۔۔۔ وہ نہ ہو کہیں شیخ صاحب کی ہر شے کی وہی مالک بن بیٹھے۔۔۔۔۔"

---

کینال پارک کی جانب سے اٹھنے والا وفقل مست بادل گلبرگ پر بے جان لیٹا تھا ٹیکسی کی پچلی چھت پر شبنم جیسی بوندیں پھوار بن کر پڑ رہی تھیں اور میٹر دم بدم بڑھ رہا تھا۔

تابی شکست خوردہ راجپوت رانی کی طرح ستدوقی ہودے میں سر جھکائے بیٹھی تھی۔

پہلے ماموں نے پون گھنٹہ اس کی۔ اس کے پیشے کی اس کے آباؤ اجداد کی بے غیرت زندگی کی پچھے وار گالیوں سے ضیافت کی۔ اس اثنا میں حمیدہ چارپائی کے سرہانے یوں کھڑی رہی جیسے اس کمرے کی ہر چیز میں پھول ماتا کے جراثیم ہوں جب اپنے بھانویں ماموں تابی سے نپٹ چکے تو غصے کی گاڑی شنٹ کرتے

ہوئے شیخ جی سے بولے ۔۔۔۔ "تم جانتے ہو کہ ڈائریکٹر آف انڈسٹریز سے میرے کیسے تعلقات ہیں پل بھر میں ساری فیکٹری پر تالا نہ ڈلوا دیا تو شیخ الٰہی بخش نام نہیں۔ جس دولت کے مان پر تمہیں یا للّے تللّے سوجھے ہیں اس دولت کا پرنالہ ہی بند کردوں گا انشاء اللہ!"

شیخ جی کچی نیند سے جاگے تھے۔ چہرے پر پیلاہٹ جسم میں لرزاہٹ اور دل میں وسوسے تھے۔ پھر نگاہ جو کھلی تو سامنے حمیدہ اور ماموں کی شکل نظر آئی۔ بیماری نے پہلے ہی قوت مدافعت چھین لی تھی۔ پلنگ پر عادی مجرموں کی طرح بیٹھ گئے۔

"تم کچھ بولتے کیوں نہیں ۔۔۔۔ لیکن اس آوارہ سے نکاح پڑھوا کر اب بولو بھی ۔۔۔۔۔ بے شرم کار تو گھر پر ہی رہنے دیتے۔ یہ لوگ تو سارا مال ہتھیا کر بھی اپنی نہیں بنتیں۔"

"یہ میری ویسی ہی بیوی ہے جیسی حمیدہ ۔۔۔ آپ آپ" انہوں نے تابی کے لیے آواز کو بلند کرنا چاہا لیکن آواز کہیں حلق ہی میں سوکھ گئی۔

برآمدے میں حمیدہ کے بچوں نے بلڑ مچا رکھا تھا۔ ننھی بسم اللہ کی سائیکل کو وہ ادھر ادھر دوڑا رہے تھے۔ آسمان پر گھرے سرمئی بادلوں میں خوفناک سی چمک کوڑیالے سانپ بن کر بار بار لہرا رہی تھی اور مینہ دم بدم بڑھتا جارہا تھا۔

تابی آہستہ سے ہودج میں سے اتری۔ حمیدہ کے بچوں کی آوازیں اس کا کان میں گرم سیسہ بن کر اتر رہی تھیں۔ آخر ان معصوم روحوں کا کیا قصور تھا؟ جس قدر ببو کو ایک والد کی ضرورت تھی اسی قدر ان بچوں کو بھی تو سہارے درکار تھے؟ وہ آہستہ آہستہ الماری تک آئی اور ہینگر پر ٹنگی ہوئی اچکن اتارنے لگی۔

شیخ جی نے تابی کی طرف دیکھنا چاہا لیکن اسی وقت آگے بڑھ کر حمیدہ نے ان کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ دیا اور جوتیاں پیروں سے کھسکا کر ان کے برابر کردیں۔ جاتے ہوئے نہ تو شیخ جی نے پلٹ کر دیکھا اور نہ ہی طوائف انہیں ٹیکسی تک چھوڑنے گئی۔

کینال پارک سے آنے والے بادل کی قناتیں پھٹ گئیں اور کاجل بھری پھوار گلبرگ کی کوٹھی پر پڑنے لگی۔

تابی نے سارے کمرے پر نگاہ دوڑائی اور شیخ جی کے خالی پلنگ کی پائنتی جا بیٹھی۔ اس کی آنکھوں میں سے گرم گرم آنسو بہہ رہے تھے اور ایک ایک آنسو میں شیخ جی کی شبیہ ٹوٹ رہی تھی نکھر رہی تھی۔ اس کے سر کا سیس پھول پتی پتی سارے گھر میں بکھرا پڑا تھا۔

---

## راجندر سنگھ بیدی

# کلیانی

اب اسے ان کالی بھوری راہوں پر چلنے سے کوئی ڈر نہ آتا تھا' جہاں بے شمار گڑھے تھے' جن میں کالا پانی' بمبئی کے اس صنعتی شہر کی میل ہمیشہ جمع رہتی تھی اور کبھی نہ پٹتی تھی' بے شکل سے پتھر ادھر سے ادھر جیسے شوقیہ پڑے تھے۔ بے کار آخری روڑا ہونے کے لیے۔ اور وہ شروع کے دن جب ٹانگیں کانپتی تھیں اور تھک کے بھی رو کنے میں کامیاب ہو جاتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گلی کے موڑ پہ دیسی صابن کے بڑے بڑے چاک بنانے والا اور اس کے پڑوس میں کا حجام دیکھ رہے ہیں' اور برابر ہنس رہے ہیں۔ کم سے کم رو بھی نہیں رہے ہیں۔ پھر راجو کا کوئیلے والا' جو آپ تو شاید اس چکلے میں کبھی نہ گیا تھا' اس پہ بھی اس کا منہ کالا تھا۔۔۔۔۔

بغل میں پہلے مالے پہ کلب تھی' جہاں چوری کی رم چلتی تھی اور یاری کی ری۔ اس کی کھڑکیاں کسی یوگی آنکھوں کی طرح سے باہر کی بجائے اندر من کے چکلے میں کھلتی تھیں اور ان میں سگریٹوں کے دھوئیں کی صورت میں آہیں نکلتی تھیں۔ لوگ یوں تو جوئے میں سینکڑوں کے ہاتھ دیتے تھے مگر سگریٹ ہمیشہ گھٹیا پیتے تھے۔۔۔۔ بلکہ بیڑی' صرف بیڑی' جس کا جوئے کے ساتھ وہی تعلق ہوتا ہے جو پنسلین کا آتشک سے۔۔۔۔ یہ کھڑکیاں اندر کی طرف کیوں کھلتی تھیں؟ نہ معلوم کیوں؟ مگر کوئی خاص فرق نہ پڑتا تھا کیونکہ اندر کے صحن میں آنے والے مرد کی صرف چھایا ہی نظر آتی' جس سے معاملہ پٹائی ہوئی لڑکی اسے اندر لے جاتی' بٹھاتی اور ایک بار ضرور باہر آتی۔ نل پر سے پانی کی بالٹی لینے' جو صحن کے عین بیچوں بیچ لگا ہوا تھا اور دونوں طرف کی کھولیوں کی طرح طرح کی ضرورتوں کے لیے کافی تھا۔ پانی کی بالٹی اٹھانے سے پہلے لڑکی ہمیشہ ہمیشہ اپنی دھوتی یا ساری کو کمر میں کستی اور گاہک لگ جانے کی اکڑ میں کوئی نہ کوئی بات اپنی ہم پیشہ بہن سے ضرور کہتی۔۔۔۔ "اے گرجا! جرا چاول دیکھ لینا' میرے کو گاہک لگا ہے"۔۔۔۔ پھر وہ اندر جا کر دروازہ بند کر لیتی۔ تبھی گرجا سندری سے کہتی۔۔۔ "کلیانی میں کیا ہے ری' آج اسے دوسرا کسٹمر لگا ہے؟" لیکن سندری کے بجائے جاڑی یا کھرسید' جواب دیتی۔۔۔ "اپنی اپنی قسمت ہے نا؟"۔۔۔ تبھی کلیانی والے کمرے سے زنجیر لگنے کی آواز آتی اور بس۔ سندری ایک نظر بند دروازے کی طرف دیکھتی اور اپنے سے

ہوئے بالوں کو چھانٹتی' تولیے سے پونچھتی ہوئی گنگنانے لگتی۔۔۔" رات جاگی رے بلم' رات جاگی"۔۔۔ 'اور پھر اکیا اکیلی گرجا سے مخاطب ہو اٹھتی۔۔۔۔" اے گرجا! کلیانی کے چاول ابل رہے ہیں۔ دیکھتی نہیں کیسی گڑگڑ کی آواز آ رہی ہے۔ اس کے برتن سے؟" اور پھر تینوں چاروں لڑکیاں مل کر ہنستیں اور ایک دوسری کے کولھے میں چپے دینے لگتیں۔ تبھی گرجا بلبلا اٹھتی اور کہتی۔۔۔" اکیا جور سے کیوں مارا' رنڈی! جانتی ہے' ابھی تک دکھ رہا ہے میرا پھول؟ کان کو ہاتھ لگایا' بابا! میں تو کیا میری آل اولاد بھی کبھی کسی پنجابی کے ساتھ نہ بیٹھے گی۔" پھر گرجا بغل کی کھولی میں کسی چھوکری کو آواز دیتی۔

"گنگی تیرا اوپٹ کیا بولتا۔۔۔؟"

گنگی کی شکل تو نہ دکھائی دیتی' صرف آواز آتی۔۔۔" میرا اوپٹ بولتا' بھج من رام' بھج من رام۔۔۔۔۔۔"

مطلب گنگی کو یا تو سریل ہے اور یا پھر کوئی کسٹمر نہیں لگا۔

مہی پت لال اب کے مہینوں کے بعد ادھر آیا ہے۔ بیچ میں منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے وہ یہاں سے کچھ ہی فرلانگ دور ایک نیپالی لڑکی چونی لا کے پاس چلا گیا تھا اور اس کے بعد چھیانوے نمبر کی ایک کرسچین چھوکری میں پھنس گیا جس کا اصلی نام تو کچھ اور تھا لیکن وہاں کی دوسری لڑکیاں اور دلال اسے اونگا کے نام سے پکارتے تھے۔ ادھر کلیانی کو کچھ پتہ بھی نہ تھا کیونکہ اس دھندے میں تو دو چار مکانوں کا فاصلہ بھی سینکڑوں میل کا ہوتا ہے۔ لڑکیاں زیادہ سے زیادہ پکچر دیکھنے کو نکلتی تھیں اور پھر واپس۔۔۔۔۔۔ جس منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے مہی پت دوسری لڑکیوں کے پاس چلا گیا تھا اسی کے لیے اس اڈے پر لوٹ آیا۔ لیکن یہ بات طے تھی کہ اتنے مہینوں کے بعد وہ کلیانی کو بھول چکا تھا۔ حالانکہ ملک جانے کے لیے اس نے کلیانی کو دو سو روپے بھی دیے تھے تب شاید نشے کا عالم تھا جیسا کہ اب تھا۔ بیئر کا پورا پیگ پی جانے کے کارن مہی پت لال کے دماغ میں کسی اور ہی عورت کی تصویر تھی اور وہ بھی نامکمل۔ کیونکہ اسے مکمل تو مہی پت ہی کو کرنا تھا۔۔۔۔ ایک مصور کی طرح سے جو کہ مرد ہوتا ہے اور تصویر جو کہ عورت ہوتی ہے۔۔۔۔

اندر آتے ہی مہی پت نے صحن کے پہلے بیرا ہٹ کو پھلانگا۔ تین چار سیڑھیاں نیچے اترا۔ لوگ سمجھتے ہیں پاتال نرک کہیں دور دھرتی کے اندر ہیں۔ لیکن نہیں جانتے کہ وہ صرف دو تین سیڑھیاں نیچے ہیں۔ وہاں کوئی آگ جل رہی ہے اور نہ ابلتے' کھولتے ہوئے کنڈ ہیں۔ ہو سکتا ہے سیڑھیاں اترنے کے بعد پھر اسے کسی اوپر کے تجربے پہ جانا پڑے' جہاں سامنے دوزخ ہے' جس میں ایسی ایسی اذیتیں دی جاتی ہیں کہ انسان اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

سیڑھیاں اترنے کے بعد، صحن میں پاؤں رکھنے کے بجائے مہی پت لال کھولیوں کے سامنے والے تھڑے پہ چلا گیا کیونکہ پکا ہونے کے باوجود صحن میں ایک گڑھا تھا، جس میں ہمیشہ ہمیشہ پانی جمع رہتا تھا۔ برس ڈیڑھ برس پہلے بھی یہ گڑھا ایسا تھا اور اب بھی ایسا ہی۔ لیکن گڑھے کے بارے میں اتنا ہی کافی ہے کہ اس کا پتہ ہو۔ اوپر صحن کے کھلے ہونے کی وجہ سے دشمی کا چاند گڑھے کے پانی میں جھلملا رہا تھا جیسے اسے میل نرمیل ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ البتہ نل سے پانی کا چھینٹا اس پر پڑتا تو چاند کی چھبی کانپنے لگتی، پوری کی پوری۔۔۔۔۔

کچھ گاہک لوگ گرجا، سندری اور جاڑی کو یوں ٹھونک بجا کے دیکھ رہے تھے جیسے وہ کچے پکے گھڑے ہوں۔ ان میں سے کچھ اپنی جیبیں ٹٹول رہے تھے۔ مستری جاڑی کے ساتھ جانا چاہتا تھا کیونکہ وہ گرجا، سندری، گھر سیدے سے زیادہ بدصورت تھی مگر تھی آٹھ اینٹ کی دیوار۔ حیرانی تو یہ تھی کہ لڑکیوں میں سے کسی کو حیرانی نہ ہو رہی تھی۔ وہ مرد اور اس کے پاگل پن کو اچھی طرح سے جانتی تھیں۔ مہی پت نے سندری کو دیکھا جو ویسے تو کالی تھی، مگر عام کوکنی عورتوں کی طرح تیکھے نقش نینوں والی۔ پھر کمر سے نیچے اس کا جسم۔ باپ رے، ہو جاتا تھا تبھی مہی پت کے کرتے کو کھینچ پڑی۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو سامنے کلیانی کھڑی تھی اور ہنستے ہوئے اپنے دانتوں کے موتی رول رہی تھی۔ مگر وہ دبلی ہو گئی تھی۔ کیوں؟ نہ معلوم کیوں؟ چہرہ یوں لگ رہا تھا جیسے دو آنکھوں کے لیے جگہ چھوڑ کر کسی نے ڈھولک پہ چمڑا مڑھ دیا ہو چونکہ عورت اور تقدیر ایک ہی بات ہے، اس لیے مہی پت کلیانی کے ساتھ تیسری کھولی میں چلا گیا۔

کلب گھر کی کھڑکی میں سے کسی نے جھانکا اور اوبھ کر بساط الٹ دی۔ کلیانی نے باہر آ کر نل پہ بالٹی بھری، دھوتی کو کمر میں کسا اور آواز دی۔۔۔۔ "او گرجا، تھوڑا اہار گٹھری سنبھالنا اور پھر وہ پانی لے کر کھولی میں چلی گئی۔۔۔۔۔"

پاس کی کھولی سے میڈم کی آواز آئی۔۔۔ "ایک ٹیم کا دو ٹیم کا؟؟"

اندر کلیانی نے مہی پت کو آنکھ ماری اور میڈم والی کھولی کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔ "ایک ٹیم" اور پھر اس نے پیسوں کے لیے مہی پت کے سامنے ہاتھ پھیلا دیا، جسے پکڑ کر مہی پت اسے اپنی طرف کھینچنے لگا۔ پھر اٹھ کر اس نے پان سے پٹی لال مہری کلیانی کے ہونٹوں پہ لگا دی جسے دھوتی کے پلو سے پونچھتی ہوئی وہ ہنسی۔۔۔ اتنے بے صبر؟

اور پھر ہاتھ پھیلا کر کہنے لگی۔۔ "تم ہم کو تیس روپے دے گا پر ہم میڈم کو ایک ہی ٹیم کا بولے گا۔ تم بھی اس کو نہیں بولنے کا۔۔ آں؟؟"

مہی پت نے ایسے ہی سر ہلا دیا۔۔۔۔ "آں"

بدستور ہاتھ پھیلائے ہوئے کلیانی بولی۔۔۔۔۔ "چلی نکال۔"

"پیسے؟"۔۔۔ مہی پت بولا۔

کلیانی نے اب کے رسم نہیں ادا کی وہ سچ مچ ہنس دی۔ "نہیں" وہ شرما گئی۔ ہاں وہ دھندا کرتی تھی۔ اور شرماتی بھی تھی۔ کون کہتا ہے وہاں عورت عورت نہیں رہتی؟ وہاں بھی حیا اس کا زیور ہوتا ہے اور حربہ۔۔۔ جس سے وہ مرتی ہے اور مارتی بھی۔ مہی پت نے تیس روپے نکال کر کلیانی کی ہتھیلی پر رکھ دیے۔ کلیانی نے ٹھیک سے گنا بھی نہیں۔ اس نے تو بس پیسوں کو چوما' سر اور آنکھوں سے لگایا' بھگوان کی تصویر کے سامنے ہاتھ جوڑے اور میڈم کو ایک ٹائم کے پیسے دیئے اور اپنے حصے کے پانچ لے کر رکھے' اندر کے دروازے کی طرف سے اور بھی اندر چلی گئی۔ مہی پت کو جلدی تھی۔ وہ بے صبری سے درگا مہا کی تصویر کو دیکھ رہا تھا جو شیر پہ بیٹھی تھی اور جس کے پاؤں میں راکھشش مرا پڑا تھا۔ درگا کی درجنوں بانہیں تھیں جن میں سے کسی میں تلوار تھی اور کسی میں برچھی اور کسی میں ڈھال۔ ایک ہاتھ میں کٹا ہوا سر تھا' بالوں سے تھاما ہوا اور مہی پت کو معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ اس کا اپنا سر ہے۔ لیکن درگا کی چھاتیاں اس کے کولھے اور رانیں بنانے میں مصور نے بڑے جبر سے کام لیا تھا۔ دیواریں ٹوٹی ہوئی تھیں۔ وہ کوئی بات نہ تھی لیکن ان پر ٹپکتی ہوئی سیل اور اس میں گندہ کائی نے عجیب بھیانک سی شکلیں بنا دی تھیں' جن سے طبیعت بیٹھ بیٹھ جاتی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ دیواریں نہیں تھی اسکول ہیں' جن پر نرک اور سورگ کے نقشے بنے ہیں۔ گنہگاروں کو اژدہے ڈس رہے ہیں اور شعلوں کی لپلپاتی ہوئی زبانیں انہیں چاٹ رہی ہیں۔ پھر اسنسار کال کے بڑے بڑے دانتوں اور اس کے کھوہ ایسے منہ میں پڑا ہے۔

وہ ضرور نرک میں جائے گا۔۔۔ مہی پت۔۔۔۔۔۔ جانے دو!

کلیانی لوٹی اور لوٹتے ہی اس نے اپنے کپڑے اتارنے شروع کر دیے۔

یہ کھیل مرد اور عورت کا۔۔۔ جس میں عورت کو اذیت نہ بھی ہو تو بھی اس کا ثبوت دینا پڑتا ہے اور اگر ہو تو مرد اسے نہیں مانتا۔

مہی پت پہلے تو ایسے ہی کلیانی کو نوچتا کاٹتا رہا۔ پھر وہ کود کر پلنگ سے نیچے اتر گیا۔ وہ کلیانی کو نہیں' کائنات کی عورت کو دیکھنا چاہتا تھا' کیونکہ کلیانیاں تو آتی ہیں اور چلی جاتی ہیں۔ مہی پت بھی آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں' لیکن عورت وہیں رہتی ہے اور مرد بھی۔

کیوں؟ یہ سب کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ حالانکہ اس میں سمجھ کی کوئی بات ہی نہیں۔

ایک بات ہے۔ ست جگ' دواپر اور تریتا جگو میں تو پورا نیائے تھا۔ پھر بھی عورتیں محبت میں کیوں چوری کر جاتی تھیں؟ جب گنگا' دیشیا کیوں تھیں؟ آج تو انیائے ہے۔۔۔ پگ پگ پہ انیائے ہے۔ پھر انہیں کیوں روکا جاتا ہے؟ کیوں ان پر قانون لگائے جاتے ہیں؟ جو روپیہ ٹکسال سے آتا ہے اس کی قیمت آٹھ آنے رہ جاتی ہے۔ افلاس اور وافر پیسے کے میل جول کی جتنی ضرورت آج ہے تاریخ میں کبھی ہوئی ہے؟۔۔۔۔۔۔ دبالیں اسے تاکہ گھر کی لکشمی باہر نہ جائے مگر دولت' پیسہ تو Goddess bitch ہے وہ کتیا جو آئے گی تو جائے گی ہی۔۔۔۔۔۔۔

مہی پت کو الجھاوے کی ضرورت تھی اسی لیے اسے کائنات کی عورت کے پیچ وخم کھا گئے۔ اس نے ایک تبیر کے لیے کہا' لیکن اس سے پہلے کہ کلیانی کا کالا وجود اٹھ کر لڑکے کو آواز دے' وہ خود ہی بول اٹھا ۔۔۔۔ "رہنے دو" اور اس نظارے کو دیکھنے لگا جو نشے سے بھی زیادہ تھا۔ پھر جانے کیا ہوا' مہی پت نے جھپٹ کر اتنے زور سے کلیانی کی ٹانگیں الگ کیں کہ وہ بلبلا اٹھی۔ اپنی بربریت سے گھبرا کر مہی پت نے خود ہی اپنی گرفت ڈھیلی کر دی۔ اب کلیانی پلنگ پر پڑی تھی اور مہی پت گھٹنوں کے بل نیچے فرش پہ بیٹھا ہوا تھا اور اپنے منہ میں زبان کی نوک بنا رہا تھا۔۔۔ کلیانی لیٹی ہوئی اوپر چھت کو دیکھ رہی تھی' جہاں پنکھا جالے میں لپٹا ہوا' ایک آہستہ رفتار سے چل رہا تھا۔ پھر ایکا ایکی کلیانی کو کچھ ہونے لگا۔ اس کے پورے بدن میں مہی پت اور اس کی زبان کے کارن ایک جھرجھری سی دوڑ گئی۔ اور وہ اس چیونٹے کی طرح سے تلملانے لگی' جس کے سامنے بے رحم بچے جلتی ہوئی ماچس رکھ دیتے ہیں۔۔۔۔۔۔

جبھی اپنے آپ سے گھبرا کر مہی پت اوپر چلا آیا۔ اس کے بدن میں بے حد تناؤ تھا اور بجلیاں تھیں جنہیں وہ کیسے بھی جھٹک دینا چاہتا تھا۔ اس کے ہاتھوں کی پکڑ اس قدر مضبوط تھی کہ جابرے جابر آدمی اس سے نہ نکل سکتا تھا۔ اس نے ہانپتی ہوئی کلیانی کی طرف دیکھا۔ اسے یقین ہی نہ آ رہا تھا کہ ایک پیشہ ور عورت کی چھاتیوں کا وزن بھی ایکا ایکی بڑھ سکتا ہے اور ان کے حلقے اور دانے پھیل کر اپنے مرکز' ابھرے ہوئے مرکز کو بھی معدوم کر سکتے ہیں۔ ان کے اردگرد اور کولھوں اور رانوں پر ستیلا کے داغ سے ابھر سکتے ہیں۔ اپنی وحشت میں وہ اس وقت کائنات کی عورت کو بھی بھول گیا۔ اور مرد کو بھی۔ اسے اس بات کا احساس بھی نہ رہا کہ وہ خود کہاں ہے اور کلیانی کہاں؟ وہ کہاں ختم ہوتا ہے اور کلیانی کہاں سے شروع ہوتی ہے؟ وہ اس قاتل کی طرح سے تھا جو چھت پر سے کسی کو دھکیل دیتا ہے۔ اسے یقین ہوتا ہے کہ اتنی بلندی سے گر کر وہ بیان دینے کے لیے بھی زندہ نہ رہے گا' اور وہ اس پہ خودکشی کا الزام لگا کر خود بچ نکلے گا۔ ایک جست کے ساتھ اس نے اپنا پورا بدن کلیانی پہ پھینکنا شروع کر دیا۔

ایک ولدوزسی چیخ نکلی اور بلبلاہٹ سنائی دی۔ سیل اور کائی سے پٹی دیواروں پہ پنکھوں کے پر اپنی بڑی بڑی پرچھائیاں ڈال رہے تھے۔ جانے کس نے پنکھے کو تیز کر دیا تھا؟ مہی پت پسینے سے شرابور تھا اور شرمندہ بھی' کیونکہ کلیانی رو رہی تھی' کراہ رہی تھی۔ یا وہ ایک عام کسبی کی طرح سے گاہک کو لات مارنا جانتی تھی اور یا پھر وہ اتنے اچھے گاہک کو کھو دینے کے لیے تیار نہ تھی۔

سرہانے میں منہ چھپائے' کلیانی الٹی لیٹی ہوئی تھی اور اس کے شانے پھڑکتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ تبھی مہی پت ایک لمحے کے لیے ٹھٹک گیا۔ پھر آگے بڑھ کر اس نے کلیانی کے چہرے کو ہاتھوں میں لینے کی کوشش کی' مگر کلیانی نے اسے جھٹک دیا۔ وہ سچ مچ رو رہی تھی۔ اس کے چہرے کو تھامنے میں مہی پت کے اپنے ہاتھ بھی گیلے ہو گئے تھے۔ آنسو تو اپنے آپ نہیں نکل آتے۔ جب جبر اور بے بسی خون کی ہولی کھیلتے ہیں تبھی آنکھیں چھان پھٹک کر اس لہو کو صاف کرتی ہوئیں چہرے پہ لے آتی ہیں۔ اگر اسے اپنے ہی رنگ میں لے آئیں تو دنیا میں مرد دکھائی دے' نہ عورت۔

کلیانی نے پھر اپنا چہرہ چھڑا لیا۔

مہی پت پہلے صرف شرمندہ' پھر سچ مچ شرمندہ تھا۔ اس نے کلیانی سے معافی مانگی اور مانگتا ہی چلا گیا۔ کلیانی نے پلنگ کی چادر سے آنکھیں پونچھیں اور بے بسی سے مہی پت کی طرف دیکھا۔ پھر وہ اٹھ کر دونوں بازو پھیلاتے ہوئے اس سے لپٹ گئی۔ اس کی چوڑی چکلی چھاتی پر اپنے گھنگھریالے بالوں والا کنگی سر رکھ دیا۔ پھر اس کی گھگھی بندھ گئی۔ جس سے نکلنے میں مہی پت کو اور بھی تلذذ کا احساس ہوا۔۔۔۔اور کلیانی کو بھی۔ اس نے اپنے گھاتک ہی کی پناہ ڈھونڈلی' مرد تو مرد ہوگا ہی' باپ بھی تو ہے' بھائی بھی تو ہے۔۔۔۔ عورت عورت ہی سہی' مگر وہ بیٹی بھی تو ہے' بہن بھی تو ہے۔۔۔۔۔۔

اور ماں۔۔۔۔۔

مہی پت کی آنکھوں میں سچ مچ کے پچھتاوے کو دیکھتے ہی تصویر الٹ گئی۔ اب اس کا سر کلیانی کی چھاتی پر تھا اور وہ اسے پیار کر رہی تھی مہی پت چاہتا تھا کہ وہ اس عمل کو انجام پہ پہنچائے بغیر ہی وہاں سے چلا جائے لیکن کلیانی اس توہین کو برداشت نہ کر سکتی تھی۔

کلیانی نے پھر اپنے آپ کو اذیت ہونے دی۔ بیچ میں ایک دو بار وہ درد سے کراہی بھی اور پھر بولی۔۔۔۔ "ہائے میرا پھول۔۔۔ بھگوان کے لیے۔۔۔ میرے کو سوئی لگوانا پڑتا۔" پھر آہستہ آہستہ آہستہ اس نے دکھ اور سکھ سہتے ہوئے کائنات کے مرد کو ختم کر دیا اور اسے بچہ بنا کر گود میں لے لیا۔ مہی پت کے ہر لمبے سانس کے ساتھ کلیانی بڑی تری' بڑی ملائمیت اور بڑی ہی ممتا کے ساتھ اس کا منہ چوم لیتی تھی۔

جس سے سگریٹ اور شراب کا تعفن لپک رہا تھا۔

دھونے دھلانے کے بعد مہی پت نے اپنا ہاتھ کپڑوں کی طرف بڑھایا مگر کلیانی نے تھام لیا اور بولی۔ ''میرے کو بیس روپیہ جیاستی دو۔''

''بیس روپیہ؟''

''ہاں'' کلیانی نے کہا۔ ''ہم تمہارا گن گائے گا۔ ہم بھولا نہیں اور دن جب ہم ملک گیا تھا تو تم ہم کو دو سو روپیہ روکڑا دیا۔۔۔ ہم کاروار کا بڑا مندر میں ایک ٹانگ سے کھڑا ہو کے تمہارے واسطے پرارتھنا کیا اور بولا۔۔۔ میرا بھی کار کھشا کرنا بھگوان۔۔۔ اس کو لمبا جندگی دینا' پیسہ دینا۔۔۔''

اور کلیانی امید بھری نظروں سے پہلی اور ابکی پرارتھنا کا اثر دیکھنے لگی۔

مہی پت کے نتھنے نفرت سے پھولنے لگے۔۔۔ پیشہ ور عورت! پچھلی بار دو سو روپے لینے سے پہلے بھی ایسے ہی آنسو بہائے تھے اس نے۔۔۔ یوں روئی چلائی تھی جیسے میں کوئی انسان نہیں جانور ہوں' وحشی ہوں۔۔۔ مگر اور بیس روپے؟ پھر رونے کی کیا ضرورت تھی آنسو بہانے کی؟ ویسے ہی مانگ لیتی تو کیا میں انکار کر دیتا؟۔۔۔۔ جانتی بھی ہے۔ میں پیسے سے انکار نہیں کرتا۔ دراصل انکار مجھے آتا ہی نہیں۔ اسی لیے تو بھگوان کا سو شکر کرتا ہوں کہ میں عورت پیدا نہیں ہوا ورنہ۔۔۔ میں تو یہاں منہ مانگے دینے کا قائل ہوں' جس سے پھر گناہ کا احساس نہیں ہوتا۔ ایسے ہی آدمی کا تو انتظار کیا کرتی ہیں یہ۔۔۔ اور جب وہ آتا ہے تو اس سے جھوٹ بولنے' اس کے کپڑے اتارنے سے بھی نہیں چوکتیں۔۔۔ کہتی ہیں' میں نے سوچا تھا تم منگل کو جرور آؤ گے۔۔۔ منگل کو کیا ہے بھائی؟۔۔۔ منگل کو میں نے بھگوان سے پرارتھنا کی تھی!۔۔۔۔ یہ رونا۔۔۔ شاید سچی روئی ہو۔۔۔ میں نے بھی تو ایک اندھے کی طرح سے کہیں بھی چلنے دیا اپنے آپ کو۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ تاؤ کتنا اچھا تھا!۔۔۔ مگر میں نے جو اذیت دی ہے اسے' اس سے نجات پانے کا ایک ہی طریقہ ہے۔۔۔ دے دو روپے۔۔۔ مگر کیوں؟ پہلے ہی میں نے اسے دو نیم کے پیسے دیے اور ایک ہی نیم بیٹھا۔

مہی پت کے حیص بیص کو دیکھ کر کلیانی نے کہا۔۔۔ ''کیا سوچنے کو لگ گیا؟ دے دو نا۔۔۔ میرا بچہ تم کو دعا دے گا۔۔۔۔''

''تیرا بچہ؟!''

''ہاں۔۔۔ تم نے نہیں دیکھا؟''

''نہیں۔۔۔ کہاں' کس سے لیا؟''

کلیانی ہنس دی۔ پھر وہ لجا گئی۔ اس پہ بھی بولی۔ ''کیا مالم کس کا؟ میرے کو سکل تھوڑا دھیان میں رہتا؟ کیا کھبر تمہارا ہو۔''

مہی پت نے گھبرا کر کرتے کی جیب میں سے بیس روپے نکال کر کلیانی کے ہاتھ پر رکھ دیے جو ابھی تک برہنہ کھڑی تھی اور جس کی کمر اور کولھوں پہ پڑا ہوا چاندنی کا پٹکا چمک رہا تھا۔ ایک ہلکا سا ہاتھ کلیانی کے پیچھے تھپتھپاتے ہوئے مہی پت نے کچھ اور سوچ لیا۔ کلیانی نے ساری پکڑ کر لپیٹی ہی تھی کہ وہ بولا۔۔۔ ''اگر ایک ملائیم اور بیٹھ جاؤں تو؟ (پیسے دے دیے ہیں)''

''بیٹھو۔۔۔'' کلیانی نے بنا کسی جھجک کے کہا اور اپنی ساری اتار کر پلنگ پر پھینک دی۔ چلوں چلوں کرتا ہوا اس کا گوشت سب مار بھول چکا تھا۔ عقل حیوانی سے بھی تجاوز کر چکا تھا۔۔۔ لیکن مہی پت نے سر ہلایا۔۔۔۔ ''اب دم نہیں رہا!''

''ہوں'' ۔۔۔ کلیانی نے کہا۔۔۔ ''بہت جن آتا میرے ادھر پر تم سا کڑک ہم نہیں دیکھا' جی۔۔۔ تم جاتا تو بہت دن یہ (ناف) ٹھکانے پہ نہیں آتا۔''

۔۔۔۔۔۔ چاند گڑھے پر سے سرک گیا تھا۔ کوئی بالکل ہی لیٹ جاوے تو اسے دیکھ پائے تبھی کلیانی مہی پت کا ہاتھ پکڑ کر اس کمرے میں لے آئی۔ جہاں گرجا' سندری' جاڑی وغیرہ تھیں۔ جاڑی مستری اور اس کے بعد ایک بوہرے کو بھی بھگتا چکی تھی۔ ایک سردار سے جھگڑا کر چکی تھی۔ جب مہی پت آیا تو اس نے کھرسید کے کہنی ماری اور بولی۔۔۔۔۔ ''آیا' کلیانی کا مرد!'' ۔۔۔۔اس لیے کہ پہلے جب بھی مہی پت ادھر آیا تھا تو ہمیشہ کلیانی ہی کے پاس۔۔۔۔۔۔

کلیانی کے ساتھ کھولی میں آتے ہوئے' مہی پت نے باتھ روم کے پاس پڑی ہوئی گٹھری کو دیکھا جس کے پاس بیٹھی ہوئی گرجا اپنے پلو سے اسے ہوا کر رہی تھی۔ کلیانی نے گٹھری کو اٹھا لیا اور مہی پت کے پاس لاتے ہوئے بولی۔

''دیکھو' دیکھو میرا بچہ۔۔۔۔۔''

مہی پت نے اس تھلجے چار پانچ مہینے کے بچے کی طرف دیکھا' جسے گود میں اٹھائے ہوئے کلیانی کہہ رہی تھی۔۔۔ ''اسی ہلکٹ کو پیدا کرنے' دودھ پلانے سے ہم یہ ہو گیا۔ کھانے کو کچھ ملتا نہیں نا۔۔۔ اس پہ تم آتا تو۔۔۔۔۔''

پھر ایکا ایکی مہی پت کے کان کے پاس منہ لاتے ہوئے کلیانی بولی۔۔۔ ''سندری کو دیکھا؟ تم بولے گا تو ہم اگلے نیم سندری کو لادے گا۔۔۔ نہیں نہیں۔ پرسوں ہم آپی اچھا ہو جائے گا یہ سب جگہ بھر

جائے گا نا۔۔۔۔۔" اور کلیانی نے اپنی چھاتی اور اپنے کولھوں کو چھوتے ہوئے کہا۔۔" یہ سب جتن ہے تم اپنا ہاتھ بھرتا' اپنا پا جو بھرتا۔۔۔۔ٹھیک ہے۔ کچھ ہاتھ میں بھی تو آنا مانگتا۔۔۔سندری کو لینا ہوئیں گا تو میرے کو بولنا۔ ہم سب ٹھیک کردے گا۔ پر تم کو آنے کا میرے پاس۔ گر جا کے پاس نہیں آنے کا۔ او جھا اوں آں بوت کرتا۔ بوت نکھرا اس کا۔۔۔۔۔" اور پھر بچے کو اپنے بازوؤں میں جھلاتے ہوئے کلیانی بولی۔۔۔" ہم اس کا نام اچھی رکھا۔"

"اچھی۔ اچھی کیا؟"

"یہ تو ہم کو نہیں مالم۔۔۔" کلیانی نے جواب دیا اور پھر تھوڑا ہنسی۔۔۔۔" کوئی آیا تھا کسٹمر بولا۔۔۔ میرا تیرے کو ٹھہر گیا تو اس کا نام اچھی رکھنے کا۔ یہ ہم نہیں بولنے سکتا' اسی کا ٹھہرا کہ کس کا' پر نام یاد رہ گیا میرے کو۔ اد تو پھر ایا چ نہیں اور تم بھی کوچھ نہیں بولا۔۔" اور پھر اور ہنستے ہوئے بولی۔۔۔" اچھا۔ اگلے ٹیم دیکھیں گا۔۔۔۔۔"

مہی پت نے ایک نظر اچھی کی طرف دیکھا اور پھر ارد گرد کے ماحول کی طرف۔ یہاں پلے گا یہ بچہ! بچہ۔۔۔۔۔ میں تو سمجھتا تھا' ان لڑکیوں کے پاس آتا ہوں تو میں کوئی پاپ نہیں کرتا۔ یہ دس کی آشا رکھتی ہیں تو میں بیس دیتا ہوں۔۔۔۔ یہ بچہ؟!

یہاں تو دم گھٹتا ہے۔۔۔ جاتے سے تو گھٹتا ہی ہے۔۔۔۔۔

مہی پت نے جیب سے پانچ کا نوٹ نکالا اور اسے بچے پر رکھ دیا۔

"یہ اس دنیا میں آیا ہے' اس لیے یہ اس کی دکھشنا۔"

"نہیں نہیں۔ یہ ہم نہیں لیں گا۔"

"لینا پڑے گی' تم انکار نہیں کر سکتیں۔"

پھر واقعی کلیانی انکار نہ کر سکی بچے کی خاطر؟ مہی پت نے کلیانی کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔۔۔۔" مجھے معاف کردو کلیانی۔ میں نے سچ مچ آج تم سے جانوروں کا سلوک کیا ہے۔" لیکن مہی پت کی بات سے یہ بالکل پتہ نہ چلتا تھا کہ اب وہ ایسا نہ کرے گا۔ ضرور کرے گا وہ۔ اس بات کا تو نشہ تھا اسے، بیر تو فالتو سی بات تھی۔

کلیانی نے جواب دیا۔۔۔" کوئی بات نہیں۔ پر تم آج کھلاس کر دیا' مار دیا میرے کو۔" اور وہ یہ شکایت کچھ اس ڈھب سے کر رہی تھی' جیسے مرنا ہی تو چاہتی تھی وہ۔ کیا اس لیے کہ پیسے ملتے ہیں' پیٹ پلتا ہے؟ ۔۔۔ نہیں ۔۔۔۔ ہاں' جب بھوک سے پیٹ دکھتا ہے تو معلوم ہوتا ہے دنیا میں سارے مرد ختم ہو گئے۔

عورتیں مرگئیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔

مہی پت نے پوچھا۔۔۔۔۔۔ "کیا اچھی لڑکا ہے یا لڑکی؟"

ایک عجیب سی کرن نے کلیانی کے پٹ مار کھائے ہوئے چہرے کو منور کر دیا اور وہ چہرے کی پنکھڑیاں کھولتے ہوئے بولی۔۔۔۔ "چھوکرا!"

پھر کلیانی نے جلدی اچھی کا لنگوٹ کھولا اور دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر اچھی کے لڑکے پن کو مہی پت کے سامنے کرتی اتراتی ہوئی بولی۔۔۔ "دیکھو دیکھو۔۔۔۔۔۔۔۔"

مہی پت کے منہ موڑتے ہی کلیانی نے پوچھا۔۔۔۔۔ "اب کبھی آئیں گا؟"

"جلدی۔۔۔۔۔" مہی پت نے گھبرا کر جواب دیا اور پھر وہ باہر کہیں روشنیوں میں منہ چھپانے کے لیے نکل گیا۔

---

## رحمان مذنب

# پُتلی جان

تالیوں کی گونج میں ایک گھر آباد ہوا دوسرا برباد ہوا۔

پتلی جان کا آنا تھا کہ جانی کے یہاں صف ماتم بچھ گئی۔ ذرا کشائش پیدا ہونے کو آئی تھی کہ پٹ بند ہو گئے۔ پہلے ہی وہ کب نہال تھا کہ آفت کا نیا پہاڑ سر پر آن گرا غریب نے جو سنہرے خواب دیکھے کھنڈر ہوئے' جو سوچا وہ دھرے کا دھرا رہ گیا۔

اس کے چوبارے کا حال خستہ تھا۔ کڑیاں ایک تو دھوئیں کی کالونچ سے اتنی بھیانک ہو رہی تھیں جیسے چڑیلوں نے اپنی ننگی بانہیں پھیلا دی ہوں' دوسرے جگہ جگہ سے تڑخ گئی تھیں۔ ان کے کڑاکے بول رہے تھے۔ پوری چھت سن رسیدگی کے باعث دم توڑ رہی تھی اور وہ جوانی ہی میں دم توڑنے لگا تھا لیکن امید کب اسے دم توڑنے دیتی تھی۔

جو حال چھت کا سو دیواروں اور فرش کا۔ ہر روز کنستر بھر پلستر جھڑتا۔ فرش کی ٹیپ تو ٹیپ اینٹیں تک اکھڑ چکی تھیں۔ اور اب جانی کی چولیں اکھڑ رہی تھیں۔ گھر اچھا خاصا چوبچہ بن گیا تھا اور اسے دیکھ دیکھ کر کبھی کبھی سوچتا کہیں چلو بھر پانی میں ڈوب مروں' اس کے چوبارے کی مرمت ہونے والی تھی' راج مزدور سے بات کر لی تھی گچ گارے کا حساب لگا لیا تھا اینٹوں کا سودا کر لیا تھا کہ ہوا کا رخ پلٹ گیا۔ امید ہی نہ رہی کہ اس کے چوبارے کی بھی سنی جائے گی۔ پھر بھی جانی کی بڑی کری تھی۔ ہمت ہارنے والی آسامی نہ تھا۔ کوئی دوسرا ہوتا تو پتلی جان کی شکل دیکھتے ہی زہر پھانک لیتا۔

جانی کھڑکی کے پاس آ کھڑا ہوا۔ اس نے بکھرے بالوں میں اطمینان سے کنگھی پھیری اور پھر وہیں بیٹھ گیا اور "سجن گھر آ جا" والا مخصوص گیت گانے لگ گیا۔ نیچے بازار میں چائے والے نے ریڈیو اونچا کر کے جانی کی آواز دبا دی لیکن جانی نے پرواہ کی' وہ کسی کو سنانے کے لیے تھوڑی گا رہا تھا یہ تو اس کے اندر کی آواز تھی جو دل سے دل تک تھی۔

حاجی تنکا پر کسے بھروسہ رہا؟ جانی کا سہارا تو ٹوٹ ہی گیا۔ اس خود غرضی کی کوئی حد تھی؟ چکی جان کا برابر کے چوبارے میں آنا تھا کہ جانی اس سے کٹ کر الگ ہو گیا۔

جانی نے نئے کپڑے پہن اور لپ سٹک لگا کر آرسی میں چھب دیکھی۔ چہرے پر گلاب کی ہلکی ہلکی رنگت تھی' لانبا قد' لانبا چہرہ' ستواں ناک' بڑی بڑی آنکھیں۔ اسے وہ دن یاد آیا جب اس کا چوبارہ میلا اور خستہ تھا۔ یہاں نئی دری بچھی تھی اس پر اجلی چاندنی تھی' پورے کمرے میں چمک دمک تھی' اجلاہٹ تھی اور وہ لمحہ کتنا فرحت انگیز تھا اور ناسول تھا جب حاجی تنکا نے اچانک آ کر اس زور سے بھینچا کہ وہ چیخ کر رہ گیا' اس دن حاجی تنکا نے موچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے کہا تھا "جانی پیارے بٹیرے کو کنگنی دی ہے۔ جی توڑ کر لڑے گا۔ تیری قسم! سب کو جنگل کر دے گا' ہمارے بٹیرے کی دنیا عاشق ہے بتا! تیری رضا کیا ہے؟"

پھر وہ بٹیر کو تو بھول گیا اور شراب کے گرد ہو گیا۔ دیسی کی پوری بوتل چڑھا گیا اس نے نشے میں آ کر جانی کا برا حال کر دیا۔ جیسے کسی نے نئی روئی دھنک کر رکھ دی ہو۔

جوانی میں تیز تیز سوئیاں چبھیں' دیر تک جانی کے بدن میں میٹھی میٹھی ٹیسیں اٹھتی رہیں' کوئی اسے تند اور جلادانہ وحشت سے نوچ لے تو وہ اف نہ کرے۔ اسے تو مزا ہی تب آئے' جب نرم نرم رگوں میں میٹھے میٹھے مگر تیکھے تیکھے کانٹے رینگنے لگیں لیکن کوئی اس کا اپنا ہے تبھی تو حاجی تنکا کا بٹیر بڑا جی دار نکلا' اس نے سب بٹیروں کو میدان سے بھگا دیا' جانی اس کا ہو گیا' فتح یابی کی خوشی میں چوبارے پر تمام رات گانا بجانا ہوتا اور شراب کا دور چلتا رہا' پھر نہایت وسیع پیمانے پر حرب و ضرب کی محفل گرم رہی۔

پھر زمانہ بدلا' نیت بدلی' نئی دری رہی' نئی چاندنی رہی نہ چوبارے کا اجلا پن وہ شب بیداری' وہ گرم بازاری جاتی رہی' یہ سب کچھ ہوا تو جانی کی جان پر ہوا' اجڑا تو اس کا چوبارہ اجڑا۔ برابر والا چوبارہ رشک جنت بن گیا۔ اس سے جانی کے سینے پر سانپ نہ لوٹتے تو کیا ہوتا؟

برابر والے چوبارے کو کوئی پوچھتا نہ تھا۔ جب سے موتی شاہ پکڑا گیا اور جوئے کا اڈہ بند ہوا تب سے یہ اجڑا پڑا تھا۔ یوں تو جانی کا چوبارہ بھی کوڑے کرکٹ کا ڈھیر بن کر رہ گیا تھا تاہم یہ آس تھی کہ ایک نہ ایک دن مولا مشکل کشا کے یہاں اس کی سنی جائے گی بلکہ قریب قریب سنی ہی گئی تھی پھر جانے کس کی دعا کا الٹا اثر ہوا کہ جانی کا چوبارہ کھٹائی میں پڑ گیا اور برابر والے چوبارے پر ہن برس پڑا۔ صابر شاہ کی خانقاہ پر تو وہ روز ہی ننگے پاؤں جاتا لیکن شاہ جی کی نظر چوک گئی اور دھوکے میں ہمسائے پر جا پڑی۔

موتی شاہ کا بوسیدہ چوبارہ پھر سے آباد ہو گیا۔ چکی جان کے آنے سے جانی کا چاؤ تو کٹا لیکن اس نے بڑی عقلمندی سے کام لیا۔ چڑھتے سورج کی پوجا نہ کرو پر اس کی نندا بھی نہ کرو! جانی کم از کم اس اصول کا

قائل تھا۔ اس نے حوصلہ کر کے چھاتی پر وہ پتھر رکھ لیا جس نے اس کا مکان ڈھایا تھا' اُسے ڈھایا تھا۔ چنگی جان نے اس کے دن' اس کی راتیں چھین لیں۔

چنگی جان کے لیے تین دن کے اندر اندر پرانا چوبارہ نیا ہو گیا۔ بوسیدہ چھت ادھیڑ کر نئی چھت ڈالی گئی۔ پلستر ہوا' لیپ ہوئی' سفیدی ہوئی اور یہ سب کچھ جانی نے جی کڑا کر کے دیکھا۔ وہی مصالحہ جسے جانی کے چوبارے میں لپنا تھا چنگی جان کے چوبارے میں لگا۔

ایک بار تو مستری بھولے سے تگاری تیشہ لیے جانی کے چوبارے پر ہی چڑھ آیا۔ پر جانی نے کولھے پر ہاتھ دھر کر کہا۔ "ہائے ہائے صابر سائیں ہمارا نہیں چنگی کا ہے۔ اس نے ہوا کا رخ پھیر دیا تو ادھر کیوں آیا ہے؟ مسالہ میرے ہی چوبارے کا ہے پر لگے گا برابر کے چوبارے میں۔ مستری تیرا بھلا ہو جہاں کی مٹی ہے اسے وہیں لگا! اب یہ اپنے یہاں نہیں لگے گی۔" اس نے ترتالے میں تالیاں مارتے کہا۔

مستری ہنس کر نیچے اتر آیا لیکن جانی دل مسوس کر رہ گیا۔ اسے یہ غم نہ تھا کہ اس کا چوبارہ مرمت سے رہ گیا اور چنگی جان کے چوبارے کی سن گئی۔ اسے تو یہی غم کھانے لگا کہ چنگی جان نے اس کے چوبارے کی گہما گہمی لوٹ لی۔ کون اپنا بھرا گھر اجڑتا دیکھ سکتا تھا؟ جسے قہقہوں کی برکھا میں رہنے کا چسکا پڑا ہو وہ تنہائی میں کیسے رہے؟

حاجی تنکا نے یوں آنکھیں پھیر لیں جیسے اسے جانی سے کبھی تعلق خاطر ہی نہ رہا ہو حالانکہ دونوں کا نکاح پڑھا گیا تھا اور پھوپھی کریم بخش مرحوم نے اپنے ہاتھوں سے مٹھائی بانٹی تھی۔ خلیفہ جی ابھی زندہ تھے۔ انہی کے ایما پر نکاح ہوا تھا لیکن حاجی تنکا اب کسی کی سنتا ہی نہ تھا۔ وہ تو صاف کہتا۔۔۔ "نکاہ وکاہ کوئی چیز نہیں' یونہی ڈھکوسلا ہے۔ من کا سودا ہے۔ وبار بیوپار ہے۔ جب تک موج آئی جانی سے یارانہ رکھا اور جب موج نہ رہی یارانہ توڑ دیا۔ کسی کا ٹھیکہ تو نہیں کہ یارانہ توڑو ہی نہیں۔

جانی کو اس بات کا بڑا قلق تھا کہ حاجی تنکا نکاح کر کے مکر گیا۔ اس میں جانی کی بڑی بدنامی تھی کون اپنی بدنامی گوارا کرتا؟ اس کی تو ناک ہی کٹ گئی۔ برادری میں باتیں ہوئیں۔ جستی ہی مٹ گئی اس کی دو کوڑی کا نہ رہا۔ اب وہ لوگوں کی نظروں میں جچتا ہی نہ تھا۔ نیا یارانہ ہوتا اور ٹوٹ جاتا تو وہ اتنا اثر نہ لیتا' ہتکی بھی نہ ہوتی۔ چنگی جان نے جانی کے یار کو نہیں اس کے خصم کو ہتھیایا تھا اور اسے سب کی نظروں سے گرا کر خاک میں ملایا تھا جانی خلیفہ جی کے پاس جا کر رویا پیٹا لیکن وہ بے چارہ کیا کرتا۔ اس نے محض اتنا کہا۔۔۔ "جانی صبر کر! مولا مشکل کشا تیری سنے گا اور تجھ پر اپنا فضل کرے گا۔ تو راستی پر ہے۔ مولا مشکل کشا سچوں کا ساتھ دیتا ہے۔ گھبرائے بات نہیں بنتی۔"

جانی نے صبر تو کر لیا پر وہ کبھی کبھی یہ ضرور سوچتا کہ خلیفہ جی چکی جان کو منع کیوں نہیں کرتے کہ کسی کو رسوا اور ذلیل نہ کرے۔ قصور آخر چکی جان کا بھی تو تھا لیکن پھر یہ سوچ کر اپنے دل کو تسلی دے لیتا کہ چکی جان کو یہاں آئے آخر دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ ابھی تو وہ خلیفہ جی کی بڑائی کا قائل بھی نہ ہوا ہوگا۔ خلیفہ جی کا حکم تو اسی پر چل سکتا جو ان سے عقیدت رکھتا۔

جانی کا چوبارہ جانی سمیت اندھیرے میں ڈوب گیا۔ اس کا سہاگ قضا نے لوٹ لیا۔ چوبارے کا سارا پلستر اور ملبا اس کے اوپر آ گرا۔ سانس لینا اور جینا دوبھر ہو گیا۔ برابر والے چوبارے سے جب قہقہوں کا دھتکار شور اٹھتا تو اسے بھالے لگتے اور سینہ چھلنی چھلنی ہو جاتا۔ اس کا چوبارہ دوزخ کا ایسا ٹکڑا بن گیا جہاں سب سے بڑا عذاب نازل ہو رہا ہو۔ ایسے میں اگر جانی سانس لیتا اور جیتا رہا تو یہ اس کے حوصلے کی خوبی تھی۔

رزق خدا دیتا ہے۔ چنانچہ جانی بھی بھوکا نہیں رہا۔ سینے کی مشین اس کے پاس تھی۔ اس نے صابر سائیں کے مزار پر جا کر دعا مانگی۔ خلیفہ جی سے مشورہ لیا اور باوفا منکوح کی طرح زندگی بسر کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ چوبارہ چھوڑ کر ایک چھوٹی سے دکان پر جا بیٹھا۔ عذاب جہنم قدرے کم ہوا۔ چکی جان کا ستارہ دیکھتے دیکھتے زمین سے آسمان پر جا پہنچا۔

عجیب اتفاق تھا۔ بازار کے جس حصے میں چکی جان کا چوبارہ تھا اس کا کوئی نام نہ تھا ممکن ہے اس کی یہ وجہ ہو کہ وہاں کبھی کوئی لیڈر پیدا نہ ہوا البتہ لیڈروں کا ادھر گزر ضرور تھا۔ چھوٹے موٹے لیڈر اور صوبائی ممبر تو وہاں رات گزارنے میں بھی مضائقہ نہ سمجھتے لیکن ایسے عارضی لیڈروں کے نام پر بازار کا نام نہ پڑ سکتا تھا۔ علاقائی لیڈر تھے سو انہوں نے بھی معاملے کی نزاکت پر کبھی توجہ نہ دی۔ ایسی اہم جگہ اور نام سے محروم رہے حالانکہ الیکشن کے دنوں میں ان کی توجہ ایک ایک اینٹ، ایک ایک کواڑ، ایک ایک کھڑکی، ایک ایک دکان، مکان اور چوبارے پر رہی۔ ووٹ کے سلسلے میں وہ نوٹ لیے لیے پھرے، بیسیوں بار خلیفہ جی اور چکی جان سے ملے بلکہ ایک لیڈر نے تو ایسے سنہری موقع پر بیٹے کی ولادت کو غنیمت جانا اور بازار بھر کو چکی جان کے ناچ گانے سے نوازا۔

ایک طرف کھلی سڑک تھی جو نورے پہلوان کے اکھاڑے کو نکل جاتی اور دوسری طرف رنڈی بازار تھانے تک پھیلا ہوا تھا۔ درمیان میں فرلانگ بھر کا یہ بے نام ٹکڑا تھا جسے لوگ رفتہ رفتہ چکی بازار کہنے لگے۔

جانی کو بجا طور پر رنج تھا وہ یہاں کب سے آباد تھا لیکن کسی نے اس کے نام پر بازار کا نام نہ رکھا۔

اسے تو حاجی تنکا نے گھر میں ڈال کر برباد کیا۔

چکی بازار بہت جلد مقبول ہو گیا۔ اس نام ہی میں جادو کا اثر تھا۔ اگر اسے شیخ شریف کے نام سے موسوم کرتے جس کا علاقے کی تین چوتھائی جائداد پر قبضہ تھا یا صابر سائیں کے نام سے فائدہ اٹھاتے تب بھی بازار کی شہرت کو ایسے چار چاند نہ لگتے جیسے اب لگے تھے۔ بازار آسانی سے لوگوں کی زندگی میں داخل ہو گیا۔ نہ کسی وزیر نے رسم افتتاح ادا کی نہ بورڈ چسپاں ہوا۔ نہ اخبار میں خبر چھپی۔ بات ہونے والی تھی سو ہو گئی۔

جو شوقین مزاج رنڈی بازار کی سیر کو آتے وہ چکی بازار سے ہو کر جاتے' بڑے غور سے بازار کی جان کو دیکھتے اور قدرت کے ہنر کی داد دیتے۔ بعض تماش بین کچھ بھی ہوتے جو ایسے گم ہوتے کہ چکی بازار ہی کے ہو رہتے۔

ایک حاجی تنکا ہی نہیں چکی جان پر سارا جہان مرنے لگا۔ کون تھا جو ادھر سے گزرتا اور چکی جان کا دیدار کئے بغیر چل دیتا۔ لوگ اسے اس انہماک سے دیکھتے جیسے وہ عالم بالا سے اتری ہوئی نعمت ہو اور اسے دیکھنے سے مریض شفایاب ہو جاتے ہوں۔

چکی جان کی رنگت ایسی تھی جیسے گورے پن اور سانولے پن نے بیاہ رچایا ہو جیسے صندل کے شربت میں مالٹے کا رس ملایا ہو۔ سارا بدن بے داغ تھا۔ پنڈلیاں اور بانہیں ولایتی کانچ کی طرح صاف اور چکنی تھیں۔ ان پر ہاتھ یوں پھسلتے جیسے ریشمی کپڑوں پر گرم گرم استری۔ آنکھیں یوں مٹکتیں جیسے نور بھرے تالاب میں ننھی ننھی مچھلیاں تیر رہی ہوں' لمبی لمبی پلکیں بڑی بڑی آنکھوں پر سایہ ڈالے رہتیں۔ مکھڑا تھا کہ چاند پر شفق بکھری تھی۔ کلائی پر زنانہ گھڑی چمکتی رہتی۔ انگلیوں میں جڑاؤ انگوٹھیاں جگمگ جگمگ کرتیں۔ کانوں میں تالیس چمکتے۔ عید بقر عید پر وہ گلے میں سونے کا ہار ڈال لیتا۔

مولسری کے پھول اس کی جان تھے۔ ہمیشہ دیر سے اٹھتا اور سورج جتنے بانس چاہے اوپر چلا جائے وہ مولسری کے پھول چننے ضرور باغ میں جاتا۔ مولسری کے پیڑوں میں ایسی جاذبیت نہ تھی اور پھول دیکھنے میں ایسے خوشنما بھی نہ تھے لیکن خوشبو دلپذیر تھی۔ مٹھی میں سمیٹ کر انہیں سونگھتا تو یوں آنکھیں میچ لیتا جیسے میٹھے میٹھے' سنہری سنہری خواب اس کی سوچ میں گھل مل رہے ہوں' وہ ایسے انمول دیس میں کھو جاتا جہاں صرف کیف ہو' صرف لذت ہو' صرف مہک ہو۔

ننھے ننھے پھول اپنے اندر امنگوں کا طوفان سمیٹے رہتے' چکی جان کے ہاتھ لگتے ہی یہ بکھر جاتا۔ مولسری کے پھول کچھ ایسے مقبول ہوئے کہ پھلیرے نے موتیا اور چنبیلی کے ساتھ مولسری کے پھول اور ہار بھی رکھنے شروع کر دیئے۔ چکی جان حاجی تنکا کی دکان پر آ کر بیٹھتا تو پھلیرا بھی آ کر کھڑا ہو جاتا

اور وہیں کھڑے کھڑے مولسری کے ہار بک جاتے۔ چکی بازار میں صرف مولسری کے ہار بکتے۔ انہیں ٹھکانے لگا کر پھلیرے کو رنڈی بازار کا رخ کرنا پڑتا۔ جہاں موتیے اور چنبیلی کے چٹی چاندنی جیسے ہار بکتے۔

جب کوئی قدر دان مولسری کا ہار خرید کر چکی جان کے گلے میں ڈالتا اور اسے بازو سے پکڑ کر دکان سے اٹھا کر لے جاتا تو حاجی تنکا کو بڑا تاؤ آتا لیکن وہ کیا کرتا؟ چکی جان نہ تو اس کا منکوح تھا اور نہ ہی وہ چکی جان کا بوجھ اٹھا سکتا جو دن میں دو دو بار کپڑے بدلتا اور ہر ہفتے ریشمی سوٹ سلواتا۔ پیزسوپ کی ٹکیے سے چھترے کو نہلاتا۔ تکیوں کے غلاف اور بستر پوش روز بدلواتا، نئی نئی قمیصیں، شلواریں اور دوپٹے اس بے تکلفی سے مہترانی کے حوالے کر دیتا جیسے دادا جی کی فاتحہ کے لیے بہت بڑے حلوائی کی دکان مل گئی ہو۔۔۔۔۔اسے حاجی تنکا کیوں کر اپنے کھاتے میں ڈالتا۔ ادھر چکی جان ایک کے ہو جانے کی قباحتوں سے آگاہ تھا۔ جانی کا حال اسے معلوم تھا۔

جانی کا گزارہ بھی صبر و قناعت پر تھا اور حاجی تنکا کا بھی۔ دونوں کا مرض ایک نہ تھا لیکن علاج ایک ہی تھا۔ صبر و قناعت امرت دھارا ثابت ہوا۔

چکی جان جونہی بازار میں آتا سب کی نظریں اس کا خیر مقدم کرتیں۔ گاموں کی دکان کے پھلوں سے لدے پھندے چھابے اسے اپنی طرف بلاتے۔ ریڈ بلڈ مالٹے، سنگترے، سیب اور انار گاموں کی جانب سے خیر سگالی کا پیغام دیتے۔ سردیوں کے ایام میں انہی سے دکان کی بہار ہوتی۔ منہ کا ذائقہ بدلنا چاہتا تو گاموں کی دکان پر چلا جاتا اور مالٹے سنگترے اٹھا کر چھیلنے لگتا۔ کبھی کبھی چھلکے چھیلتے چھیلتے باریک سی پھوار اس کی آنکھوں میں جا گرتی اور وہ ایکدم آنکھیں میچ لیتا۔ گاموں جھٹ دھوتی کا پلو اٹھا کر آنکھیں پونچھ دیتا۔ چکی جان کو اس سے کسی قدر سکون ملتا اور وہ مالٹے سنگترے کھانے میں مشغول ہو جاتا۔۔۔۔۔چکی جان منہ کا ذائقہ بدل کر جانے لگتا تو گاموں اپنے منہ کا ذائقہ بدلنے کی غرض سے اسے ٹھہرالیتا، پکڑ لیتا اور تالی بجا بجا کر "یاری لائیں تے نبھائیں بیبا" گاتا۔

گاموں ہر موسم کا پھل لاتا۔ جب مالٹے سنگترے کم یابی کی وجہ سے صرف بیماروں کے خریدنے کے لائق رہ جاتا تب بھی وہ چکی جان کی خاطر ضرور لاتا۔ کبھی کیلے لاتا اور چکی جان انہیں چھوڑ کر کسی دوسرے پھل کی جانب ہاتھ بڑھاتا تو گاموں اس کی کلائی تھام کر بول اٹھتا۔ "سوہنیا! ذرا یہ کیلا بھی کھا کر دیکھ! مولا جانے بڑا شیریں ہے"۔۔۔۔۔۔پھر بن پوچھے چھلکا اتارتا اور کیلا اس کے ہونٹوں کے قریب لے جا کر کہتا ۔۔۔۔"شہزادیا! دکان تیری ہے جو من میں آئے کھا لیکن ذرا یہ کیلا بھی کھا کر دیکھ! اس کے سامنے ہر چیز ہیچ ہے۔"

یہ درست ہے کہ کیلے لذیذ ہوتے' گھلے ہوئے' میٹھے اور خوشبودار لیکن چکی جان ہمیشہ ان سے کتراتا مگر جتنا کتراتا گاموں اتنا ہی ستاتا آخر کیلے کھا کر ہی چکی جان کی خلاصی ہوتی۔

جانی یہ سب کچھ دیکھتا اور جی ہی جی میں کڑھتا۔ کیلے کھانے کو اس کا بھی جی چاہتا لیکن گاموں اسے جھوٹے منہ بھی نہ پوچھتا۔ تنہائی کی گھڑیاں کاٹنے کے لیے ہولے ہولے تالی بجاتا اور گنگناتا۔

حاجی تنکا بھی جلتا۔ جانی کو دھتکار کر اس نے اپنی کشتیاں جلا دی تھیں اور سب کچھ داؤ پر لگا دیا تھا۔ کیوں نہ لگاتا؟ چکی جان چیز ہی ایسی اونچی تھا۔

حاجی تنکا نے دکان کا جائزہ لیا۔ اس کی دکان پر تو پان سگرٹ ہی ملتے اور چکی جان کا صرف انہی پر گزارہ نہ تھا۔ اسے گاموں کے مسکراتے' جگمگاتے' ہنستے بولتے پھلوں کے تازہ انبار اپنی طرف کھینچ لیتے۔ حاجی مجبور تھا۔ وہ پھل پھلاری کے دھندے سے بالکل ناواقف تھا۔ ہاں چکی جان کو خوش کرنے اور گاموں سے اس کا پیچھا چھڑوانے کی نیت سے سوچ سوچ کر اس نے ایک ترکیب نکالی۔ وہ منڈی جا کر سستے داموں تھوڑا تھوڑا پھل لانے لگا۔ تھڑے پر جگہ بنا کر ٹوکرا جما دیتا لیکن اس سے کچھ بات نہ بنی۔ تجربہ چنداں کامیاب نہ ہوا۔ گاموں کی دکان پر جو بہار تھی وہ یہاں کہاں؟ اور پھر چکی جان کے انگ انگ میں دن بھر جوانی انگڑائیاں لیتی رہتی یہ مستیاں کب کل پڑنے دیتیں۔ انگڑائیاں ٹوٹتی ہی بھلی لگتیں۔ وہ انگڑائیاں لئے گاموں کی دکان پر گئے بغیر نہ رہتا۔

گاہک تو گاہک چکی جان نے بھی حاجی تنکا کے پھلوں پر توجہ نہ دی۔ وہ مالٹے لائے تو چکی جان سیب کھانے گاموں کی دکان پر جا پہنچے۔ وہ سیب لائے تو چکی جان سردہ کھانے گاموں کے پاس چلا جائے۔

حاجی تنکا سمجھ گیا کہ چکی جان کو صرف پھل ہی سے نہیں گاموں سے بھی رغبت ہے۔ جہاں تک اڈے کا تعلق تھا حاجی تنکا کی دکان سے بہتر بازار میں کوئی اڈہ نہ تھا۔ بڑے کے ایک طرف اتنی جگہ تھی کہ چکی جان کی چوکی بچھ جائے۔ سر پر ایک تختے کے اوپر ریڈیو جما رکھا تھا۔ برابر میں نامی گرامی پہلوانوں اور ایکٹرسوں کی تصویریں لگی تھیں۔ دکان کے وسط میں بجلی کا بلب آویزاں تھا۔ چوبارے سے اتر کر آتا۔ بیٹھنے کو جی چاہتا تو چکی جان یہیں آ بیٹھتا۔ ایک تو یہاں نمائش ٹھیک سے ہوتی' دوسرے سب شوقین مزاج سہولت سے جمع ہو جاتے۔ کوئی تھڑے پر بیٹھ جاتا اور کوئی سامنے کھڑا ہو جاتا۔ پان سگریٹ کا دور چلتا۔ چھیڑ چھاڑ ہوتی لطیفے چلتے ہنسی مذاق کی باتیں کی جاتیں اور گاہک پھنستے۔ گاہکوں کا موڈ بنانے میں یہ اڈہ اہم کردار ادا کرتا......اور کہیں یہ بات نہ تھی۔

گاموں کی دکان چکی جان کا اڈہ نہ بن سکتی تھی۔ وہ اور ہی قسم کا آدمی تھا۔ اس روانی اور بے تکلفی

سے تخول کرتا کہ اچھے اچھوں کے منہ پھیر دیتا۔ چکی جان اس کے یہاں جا کر بیٹھتا تو گاہک بدک جاتے کسی کو اس سے بالمشافہ گفتگو کرنے ہی نہ دیتا اور کسی کی پروا کئے بغیر اسے کھڑے دوہرا کر کے اس کے آدھے بدن کو تخت پر ہی چت کر دیتا۔ اسے یوں لگتا جیسے کوئی اس کے بدن میں مچلتی ہوئی انگڑائیوں کو توڑ رہا ہو۔ بے چارے کے کپڑوں میں سلوٹ پڑ جاتے اور انہیں دھول لگ جاتی۔۔۔۔ چکی جان کو اس کا یہ جارحانہ انداز بھلا لگتا لیکن وہ زیادہ دیر یہاں نہ ٹھہرتا۔ تھوڑا سا بچل کھایا ذرا کی ذرا کے لیے گاموں کے پیار کا تختۂ مشق بنا اور وہاں سے چل دیا۔

گاموں کی زبان گندی تھی اور طبیعت میں درندگی تھی۔ اس کی نسبت حاجی تنکا کی زبان میں مٹھاس اور شائستگی تھی وہ آدمی بھی نرم طبع تھا نہ تو تخول بازی میں مہارت رکھتا اور نہ چکی جان کے گاہکوں کو بھگاتا۔ سچ پوچھو تو اس کی دکانداری چکی جان کی وجہ سے چمک اٹھی جسے پان سگریٹ کی عادت نہ تھی اسے بھی ان کا چسکا پڑ گیا۔ کوئی خود پیسے نہ پیئے۔ چکی جان کو تو پان کھلانے اور سگریٹ پلانے میں اپنی نجات ضرور سمجھتا۔ حاجی تنکا چکی جان کا احسان مند تھا اور اسی لیے اسے گاموں کی دکان پر جانے سے نہ روکتا۔ چکی جان کو کس کی محتاجی اور کس بات کی کمی تھی؟ حاجی تنکا ماتھے پر تیوری ڈالے تو وہ اٹھ کر جیجے کے قہوہ خانے میں چلا جائے اور پھر گاہک بھی وہاں پہنچ جائیں۔۔۔۔ ویسے بھی حاجی تنکا کا حساب آدھی رات کے بعد شروع ہوتا جب تماش بین اور استاد صاحبان رنڈیوں کے کوٹھوں پر سے اٹھ کر آتے اور نشے کی ٹوٹ میں اس سے رجوع کرتے تو وہ انہیں نمٹا کر ہی دکان بڑھاتا۔ یہی اس کے آخری گاہک ہوتے اس کے بعد وہ چوبارے پر جاتا اور چکی جان سے رجوع کرتا۔ چکی جان اس آخری اور مستقل گاہک کو نمٹانے میں بخل سے کام نہ لیتا۔

سورج نکلنے سے پہلے ابھی سارا چکی بازار بند ہوتا کہ جیجے کا قہوہ خانہ کھل جاتا۔ لال لال کوکلوں کی گود میں دھری ہوئی کیتلیوں کی ٹونٹیوں سے بھاپ ناچتی ناچتی نکلتی اور ہوا میں غائب ہو جاتی۔ کیتلیوں کے اندر گدگدیاں اٹھتیں اور چائے کا تیز تیز فلیور چکی جان کو پاس بلاتا۔

جیجا چائے بناتا اور خوش الحانی کے ساتھ کبھی "میرے مولا بلا لو مدینے مجھے" کا ورد کرتا اور کبھی "چکی کمریا ترچھی نجریا" کی رٹ لگاتا۔

دن چڑھے چکی جان کی آنکھ کھلتی تو وہ انگڑائیاں لیتا لیتا کھڑکی میں آ بیٹھتا۔ جیجا اسے دیکھتے ہی زور سے سیٹی بجاتا۔ پھر اسے ہاتھ کے اشارے سے بلاتا۔ کچھ دیر تو چکی جان متوجہ ہی نہ ہوتا۔ بس انگڑائیاں لیے جاتا اور اس وقت یوں محسوس ہوتا جیسے حسن کی کمانیں چلہ چڑھا رہی ہوں کسی آتش فشاں سے قوس قزح ابھر رہی ہو۔ اس کے ساتھ اردگرد پھیلی ہوئی کائنات انگڑائیاں لینے لگتی۔ جوں جوں انگڑائیاں لیتا نیند کا نشہ

ٹوٹتا۔ ذرا ہوش آتا تو جیجے کی طرف دھیان دیتا۔ جیجا بند ڈبل روٹی پر مکھن لگاتے یا چائے بناتے مسکراتا اور کہتا ۔۔۔۔۔ "میری جان! چوبارے کا کھیڑا چھوڑ ذرا ہمارے پاس آ! ہماری خاطر چائے کی ایک پیالی ہی پی لے!"

چکی جان کی بڑی بڑی آنکھیں دور سے نیم خوابیدہ ستارے کی طرح مستی میں کھوئی ہوئی نظر آتیں۔ بڑے انداز سے صراحی دار گردن ہلا کر کہتا ۔۔۔۔۔ "ہونہہ جیسے کلیجے میں آگ لگائی ہو وہ چائے پیے۔"

ادھر دولا حرامی بھی چپ نہ رہتا۔ پرانے سینما کی سیڑھیوں پر جیجے کے چائے خانے کے عین سامنے چکی جان کے چوبارے سے ذرا دور اس کا سری پائے کا دیگچہ کھلا رہتا اور چکی جان کو دعوت دیتا۔ آنکھ مار کر کہتا ۔۔۔ "پیارے! ذرا ہم پر بھی نظر سوتی ہو گرما گرم مال ہے۔ مغز اور مکھ ملا دوں گا۔ آ تو سہی۔ داتا جانے جلوہ آ جائے گا۔"

بھجا پہاڑی اپنے تھڑے پر کھڑا ہو کر اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کبھی جیجے کے قہوہ خانے کو اور کبھی دولے حرامی کے دیگچے کو دیکھتا۔ پھر دھوتی کے پلو اٹھا کر پنکھا جھلنے لگتا۔ ساتھ ساتھ چکی جان کی طرف دیکھ کر ہنستا جاتا۔ چکی جان منہ پھیر لیتا تو وہ تھڑے سے اتر کر نالی میں پیشاب کرنے بیٹھ جاتا۔

صبح صبح بھجے پہاڑی کو کون خاطر میں لاتا؟ ہاں دوپہر آتی۔ اس کے یہاں کونڈی ڈنڈا کھڑکتا تو چکی جان وہاں چلا جاتا۔ اس وقت حاجی تنکا' گاموں' جیجا' دولا حرامی اور خلیفہ جی بھی آ جاتے۔ کبھی کبھی جانی بھی کچھ دیر کے لیے آ جاتا۔ پیالہ کبھی کدورتیں اور رقابتیں دور کر دیتا۔

چکی جان کی ریشمی اور سرمئی آنکھوں کی پیالیاں مستی سے لبریز ہو جاتیں۔ ہونٹوں پر ہنسی رقص کرنے لگتی اور بہار نکھر آتی۔ گاموں گھڑا سنبھال لیتا اور ترنگ میں آ کر گانے لگتا۔ دیر تک محفل جمی رہتی۔ گرمی گھٹ جاتی اور پھر ادھر چکی جان نہانے کے لیے اٹھتا ادھر محفل بکھر جاتی۔

جسے سب چاہیں اسے ایک آدمی کیسے بس میں لائے؟ حاجی تنکا یہی غنیمت سمجھتا کہ چکی جان اس کی دکان پر آ بیٹھتا اور اس کی دکانداری کو چار چاند لگا دیتا۔

اسی دکان' اسی تھڑے اور اسی چوکی پر جہاں اب چکی جان بیٹھتا کبھی جانی بیٹھتا تھا اور اس سے کہیں زیادہ دیر تک مسلسل بیٹھتا لیکن اتنی بکری کبھی نہ ہوئی۔ چکی جان تھوڑی دیر بیٹھتا اور جب قدردان ہجوم کر آتے اور اسے زیادہ ستاتے تو اٹھ کر ادھر ادھر کھسک جاتا اس پر بھی حاجی تنکا کی بن آتی۔ پانوں کی ڈھولی دو دن میں غائب اور کم از کم سگریٹ کا ایک بڑا ڈبہ بھی لیمن کے ادھے الگ درجنوں کے حساب سے اٹھتے۔

گرمی سردی سے خاص اثر نہ پڑتا۔ البتہ پھل نہیں بکے۔

چکی جان کا مزاج درویشانہ تھا۔ اس میں پیسے کا لالچ تو رتی بھر نہ تھا۔ بازار والوں سے یوں پیش آتا جیسے اس کے اپنے ہوں۔ بیچے کی چائے' گاموں کے پھل اور دو لے حرامی کے سری پائے رائیگاں نہ جاتے۔ وہ ان سب کا حق پہچانتا اور فرض جان کر ادا کرتا۔ یار لوگ خالی ہاتھ چوبارے پر آتے لیکن جو چاہے پا لیتے۔ بیجے پھاڈی کا قرض اس کی دکان پر ہی چکا دیتا۔ رہا حاجی تنکا کا معاملہ سو وہ گھر کی بات تھی۔ چکی جان کی آدھی رات اس کے پاس گروی پڑی تھی۔ مندا ہوتا تو حاجی تنکا بوریت ٹالنے کے لیے ہیر یا ماہیا گانے لگتا۔ کوٹھوں سے آنے والے آخری گاہکوں کو نمٹانے کے بعد ہی چکی جان کے پاس جاتا۔ دن بھر کام کرنے کے بعد نیند بڑی پیاری لگتی لیکن زندگی فقط نیند نہیں۔ زندگی کا ایک ضروری مقام چکی جان تھا۔ یہیں وہ رات کو قیام کرتا۔ شب خون میں نیند حرام ہو جاتی۔ ایسے میں چوبارے پر صرف تین چیزیں ہوتیں ایک چیز وہ خود تھا' دوسری چیز چکی جان تھا اور تیسری چیز شراب تھی۔ شراب کی اس کے یہاں کمی نہ تھی کیونکہ وہ اس کی بلیک کرتا تھا۔

چکی جان کو حاجی تنکا کی ذات سے اور تو کوئی خاص فائدہ نہ تھا ہاں اتنی بات تھی کہ ہر وقت کی غمخواری کو ساتھی میسر تھا۔ وقت بے وقت آڑے آتا۔ ویسے تو خدا کے فضل سے کتنے ہی ایسے قدردان تھے جو اس کے اشارہ ابرو پر جان چھڑکنے کو تیار رہتے لیکن وہ دکھڑا ہر کسی کو کیسے کہہ سنا سکتا تھا؟

چکی جان کو کوئی لمبا چوڑا غم نہ تھا۔ پھر بھی کبھی کبھار اپنے آپ کو اس بھری پری دنیا میں اکیلا اکیلا سا محسوس کرنے لگتا۔۔۔۔۔۔ جیسے اس کا کوئی دردمند نہ ہو جیسے وہ سمندر کے اس پار کھڑا ہو جدھر جہازوں کا گزر نہ ہو۔ جیسے اس کے شاندار حال میں اداس اداس مستقبل جھانک رہا ہو۔ وہ سوچتا' کوئی آفت نہ آ جائے جو اس کی سہانی زندگی کا شیرازہ منتشر کر دے۔ اسے اس ہنستے کھیلتے' ناچتے گاتے بازار سے دور کر دے۔ گاہے گاہے اسے فکر بھی دامنگیر ہوتا کہ چند سال بعد جب چہرے کے بالوں میں سختی آ جائے گی اور ان کی کھونٹیاں نکالنے میں دشواری پیش آئے گی پھر کیا بنے گا؟ ابھی تو بات ہی کچھ اور تھی۔ ٹھوڑی پر چند بال تھے۔ موچنا لے کر بیٹھ جاتا تو چند منٹ میں انہیں صاف کر لیتا اور جلد یوں نکل آتی جیسے چودھویں کی چاندنی میں نکھرے ہوئے گلاب کی ملائم ملائم پتیاں۔ بیجا اسے تازہ ڈبل روٹی کی طرح ملائم خیال کرتا اور گاموں اناس کے گودے کی طرح نرم و لذیذ۔ ایسی اداسی کے عالم میں چکی جان گم سم حاجی تنکا کی دکان پر جا بیٹھتا اور ہولے ہولے باتیں کر کے دل کا بوجھ ہلکا کرتا۔ حاجی تنکا مزاج آشنا تھا۔ وہ تو یہی چاہتا کہ چکی جان یونہی اداس اور شوخیوں شرارتوں سے باز رہے۔ اسے دیکھ کر حاجی تنکا بھی اداس ہو جاتا اور اداسی کے یہ دونوں مجسمے ایک

دوسرے کے مثالی ساتھی معلوم ہوتے۔

دولت بڑی چیز سہی لیکن چکی جان اس سے بھی بے نیاز تھا۔ دولت پیدا کرنا اس کے بائیں ہاتھ کا کرتب تھا پھر اسے وہ ہاتھ کا میل سمجھتا اور شیخ شریف مہینے کے مہینے کرایہ لینے آتا تو نہایت بے پروائی سے نوٹ پھینک دیتا جنہیں شیخ شریف اس احتیاط سے اٹھا کر جیب میں رکھ لیتا جیسے ان کا کوئی اعتبار نہ ہو جیسے انہیں پیسے لگے ہوں۔ چکی جان کے ہاتھ کا میل اسے جان سے بڑھ کر عزیز تھا۔ یہی میل ہر سال گچ گارے میں تبدیل ہو کر دکانوں چوباروں اور کوٹھوں کی شکل اختیار کر لیتا اور پھر ان کی بدولت نیا میل اکٹھا ہونے لگتا۔ اسی میل کے طفیل اس نے موٹر خریدی جسے وہ تب استعمال کرتا جب اسے بڑے لوگوں سے ملنے جانا پڑتا ورنہ اپنی کٹڑی میں تو وہ یوں رہتا جیسے یہ بھی دوسروں کی طرح کوئی کرایہ دار ہو۔ وہ بالکل بوسیدہ دیوار کی ٹوٹی پھوٹی اینٹ لگتا۔۔۔۔۔ چکی جان کے یہاں بڑا میل تھا۔ جانے یہ میل کہاں کہاں سے بہتے کو آتا۔ کوئی اس چو بچے کا کیمیائی تجزیہ کرتا جو چوبارے کے پرنالے کے عین نیچے واقع تھا اور جسے منگو دن میں تین چار بار صاف کرتا تو شاید کچھ پتہ چلتا۔

شروع شروع میں چکی جان نے پیسے کی ضرور پروا کی اور اس سلسلے میں حاجی تنکا کا احسان اٹھاتا رہا' چوبارے کی مرمت بھی اسی نے کروائی لیکن بہت جلد اس کے یہاں دھن برسنے لگا اور وہ غنی ہو گیا۔ جیبوں میں' طاق میں' تکیے کے نیچے پلنگ کی نواڑ میں' فرش پر ادھر ادھر نوٹ پڑے رہتے۔ اب حاجی تنکا کا روپیوں والا صندوقچہ پڑا رہتا اور چکی جان اسے ہاتھ تک نہ لگاتا۔ روپے کے بل پر حاجی تنکا اسے زیر نہ کر سکتا تھا۔ ہاں پیسے کے بغیر اسے جیت لیتا تو اور بات تھی۔ پیار بڑی چیز ٹھہری۔

پہلے تو اس نے چکی جان کو چوبارہ لے کر دیا۔ پھر اسے اپنا اڈہ دیا' چوبارے میں اس کے سنگ ڈیرے ڈالے' دکان میں دھری ہوئی چارپائی سونفی کی دکان اسے سونپ دی جس دن وہ سگریٹ کا کوٹہ لینے اور سودا سلف خریدنے جاتا چکی جان کو دکان پر بٹھا جاتا۔ چکی جان بے تکلفی سے پیسے نکال کر فقیروں اور بندر نچانے والوں کو دے دیتا۔ کبھی کبھی سارا بھان ٹھکانے لگا دیتا۔ حاجی تنکا کچھ نہ کہتا۔

حاجی تنکا کھانے پکانے کا بندوبست بھی چوبارے ہی پر کر لیا کرتا۔ وہ اس کام میں طاق تھا۔ جانی بھی بڑا کاریگر تھا لیکن حاجی تنکا کا لوہا مانتا۔ جب بھی جانی بیمار پڑا تو اسی نے چولہا سنبھالا۔

ادھر قصائی نے ریڑے سے گوشت اتارا اور ادھر حاجی تنکا سر پر سوار ہوا۔ سب سے اچھی بوٹی چھانٹ کر لاتا۔ دوپہر کی ہانڈی تیار کر کے چکی جان کے سامنے لا دھرتا۔ دونوں مل کر کھاتے۔

جانی بڑے صبر والا تھا اور کوئی ہوتا تو جان ہلکان کر بیٹھتا۔ وہی تھا کہ آنکھوں کے سامنے سارا

تماشا دیکھتا اور اف تک نہ کرتا۔ حاجی تنکا تو پنکی جان کا اتنا گرویدہ ہو چکا تھا کہ جیسے وہ فلمی ہیروئن کا ہیرو ہو۔ جانی وفادار جاں نثار اور تابعدار تھا لیکن حاجی تنکا نے کبھی اس پر یوں جان نہ چھڑکی۔

ضبط کرنے کو تو کر لیا جاتا لیکن انسان پھر انسان ٹھہرا پتھر نہیں جس دن پنکی جان ریشمی شلوار سلوانے کی نیت سے جانی کے یہاں گیا تو اسے دیکھتے ہی جانی بھڑک اٹھا۔ اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ ساتن کا جھلملاتا ہوا لال ٹکڑا شعلہ بن کر اس کی آنکھوں سے ٹکرایا۔ غصے کا طوفان اٹھا اور پنکی جان پر ٹوٹ پڑا۔ پہلے تو اس نے بے تحاشا گالیاں فرمائیں اور پھر کر سے پکڑ کر اسے زمین پر پٹخ دیا سینے پر چڑھ بیٹھا اور دانتوں سے کاٹ کاٹ کر اسے لہولہان کر دیا۔

شلوار اور قمیض کی دھجیاں ہوا کے جھونکے اڑا کر لے گئے۔

ساتن کی چندیاں گلے میں لپٹائے اور دھول میں اٹ کر جب پنکی جان آیا تو حاجی تنکا سامنے رو دیا اور بولا" ــــ مجھے داتا کوڑھی کر دے جو میں جھوٹ بولوں۔ مولا جانے میں نے اسے کچھ نہیں کہا۔ شلوار سینے کو ضرور کہا تھا۔ مجھے کیا پتہ تھا اسے مجھ سے بدلہ لینا تھا۔ کسی اور سے شلوار سلوا لیتی۔ جانی کا ٹھیکہ تھوڑی تھا۔"

جانی کا نام سنتے ہی حاجی تنکا کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ جانی کی یہ مجال کہ اس کے یار پر ہاتھ اٹھائے۔ اس نے برف توڑنے کا سوا لیا اور چھلانگ لگا کر دکان سے اترا۔ لپک کر جانی کی کوٹھری کی طرف گیا۔ جانی آنے والے طوفان سے بے خبر نہ تھا۔ اس نے دور سے حاجی تنکا کو آتے دیکھا تو مضبوطی سے کواڑ بند کر لیا۔ حاجی تنکا کا خون کھول رہا تھا۔ اس نے پورے زور سے لات ماری لیکن کواڑ ڈھیٹ نکلا۔ نہ کھلا۔ ہاں پاؤں میں چوٹ آ گئی۔ حاجی نے طیش آلود لہجے میں چلا کر کہا۔ ــــ" رانی خاں کے سالے! آج میں تیرا پیٹ پھاڑ کر دم لوں گا تو اپنے آپ کو بھولو پہلوان سمجھتا ہے میں یخنی بنا دوں گا۔ تیرے حمایتیوں کی ماں ــــ میں نے تیری بوٹی بوٹی نہ کی تو مجھے حاجی تنکا نہ کہنا حرام کا جنا ہوا کہنا۔" ــــ دوبارہ آنے کی نیت کر کے لوٹ آیا۔

شیخ شریف کا خدا بھلا کرے جس نے مضبوط کواڑ لگوا رکھے تھے ورنہ آج جانی کا کام تمام ہو جاتا۔ دیر تک گوڈ گرم کر کر کے پنکی جان حاجی تنکا کے پاؤں کی ٹکور کرتا رہا۔ اس وقت تو غصے کا بھوت سر پر سوار تھا۔ پتہ نہ چلا لیکن اب درد نے بے چین کر دیا۔ جب رات بھر ٹکور کرنے کے بعد بھی درد نہ گیا تو حاجی نے لبے گوجر کو پاؤں دکھایا۔ لبے گوجر نے پاؤں کو بے طرح جھٹکا دیا اور زور زور سے مالش کی تو حاجی کی چیخیں نکل نکل گئیں۔ معاملہ لمبا پڑ گیا۔

جیجے کو جانی کی حرکت اتنی اچھی تو نہ لگی لیکن وہ اسے اتنا خطاوار بھی نہ سمجھتا۔ ایک لحاظ سے تو جانی حق پر تھا۔ چکی جان لاکھ بے خطا سہی لیکن جانی کا خون اس کی گردن پر تھا اور اگر جانی نے بدلہ لیا تو کیا برا کیا؟ اسے اس کا حق پہنچتا تھا۔ پھر حاجی تنکا کہاں سے چکی جان کا خیر خواہ تھا چکی جان کا بدلہ لینے کو ایک حاجی تنکا ہی رہ گیا تھا؟ جیجا بھی تو بدلہ لے سکتا تھا اور اچھی طرح لے سکتا تھا۔ حاجی تو بالکل پاجی تھا۔ ایک جھاپڑ سے تو جانی کی جان نکل جاتی اور یہ ماں کا پہلوان سوالے کے چلا گیا تھا جیسے یہی تو بازار میں ایک غنڈہ رہ گیا تھا' باقی سب نے تو جیسے چوڑیاں پہنی تھیں۔

چکی جان چائے خانے میں آیا تو جیجے نے حسرت آلود لہجے میں شکایتاً کہا۔ ''پیارے! ہم بھی تیرے بجن ہیں۔ حاجی ہم سے بڑا غنڈہ تو نہیں۔ ہمیں کہنا تھا۔ ہم جانی سے بدلہ لے کر دکھاتے۔ اس ماں کے ماں پشک نے تو ٹانگ بھی تڑوائی اور بدلہ بھی نہ لیا۔ بھلا جانی بھی کوئی شے ہے؟ اس کی کیا ہستی ہے کہ تیری طرف ٹیڑھی نظر سے دیکھے؟ کلیروالے کی سوں! میں اس کا لہو پی جاؤں۔''

چکی جان کی آنکھوں میں خوف جھلکا اور دل میں رحم کی لہر دوڑ گئی۔ بولا ''جس کا گھر اجڑا ہو وہ کیا کچھ نہیں کرتا؟ جانی کا اس میں کیا قصور ہے؟ اسے تو حاجی پر رنج تھا غصہ مجھ پر نکالا۔''

''تیری خیر ہو! صابر پیر کی قسم! جانی بے قصور ہے۔ کوئی مرد ہوتا تو حاجی کا اندر چیا باہر کر کے چھوڑتا۔''

حاجی تنکا کا روگ بڑھتا ہی چلا گیا۔ بسا گوجر بڑا استاد تھا۔ پہلوان اترے ہوئے جوڑ اسی سے چڑھواتے لیکن قسمت کی بات ہے' حاجی تنکا کی ٹانگ ٹھیک نہ ہوئی۔ اب نہ تو وہ پابندی سے قصائی کی دکان پر جاتا اور نہ گرم جوشی سے چکی چولہا کرتا۔ گھر کا شیرازہ پریشان ہونے لگا۔

حاجی تنکا کے ٹخنے پر ہر وقت پٹیاں بندھی رہتیں اور وہ آہستہ آہستہ کراہتا رہتا۔ دکان پر بیٹھے بیٹھے پینترے بدلتا اور پاؤں دباتا سہلاتا رہتا۔

وہی چکی جان تھا۔ وہی چوبارہ وہی فرصت شب تھی لیکن ٹخنے کے درد نے نظام زندگی درہم برہم کر دیا۔

دکان پر سکون نہ رہا۔ بیمار گھر کا ماحول پیدا ہو گیا۔ چکی جان کا دل کمزور تھا اور اس کی طبیعت نازک تھی۔ جب ذرا گھبراہٹ محسوس کرتا اٹھ کر گھومنے لگتا۔ حاجی تنکا کے پاس بہت کم ٹک کر بیٹھتا۔ ویسے بھی اب گھر کی ہانڈی کی لذت سے محروم ہو گیا تھا۔

جانی ہر تغیر بڑے اشتیاق سے دیکھتا' نئے نئے تانے بانے بنتا اور خوبصورت خوابوں سے مستقبل

کو سجاتا۔ بڑی باقاعدگی سے خلیفہ جی کے پاس جاتا' ان کی خدمت کرتا۔

جب تک دکان پر شغل کرنے والے جمع رہتے۔ محفل لگی رہتی۔ چکی جان مزے سے بیٹھا رہتا۔ محفل ٹوٹتی تو وہ بھی ادھر ادھر کھسک جاتا۔ حاجی تنکا یہ سب کچھ دیکھتا اور دل ہی دل میں کڑھتا لیکن کچھ نہ کر پاتا۔ وہ اب ایک لمحے کے لیے بھی چکی جان سے الگ نہ رہنا چاہتا۔ چکی جان پر سو جان سے فدا تھا۔ اس کی خاطر اس نے گھر اجاڑا تھا۔

حاجی تنکا کے دل میں ایسی ایسی ٹیسیں اٹھتیں کہ جیسے اسے کوئی بار بار سولی پر چڑھا رہا ہو۔ برف کا وہی سوا جو اس نے جانی کا مغز چھیدنے کو اٹھایا تھا۔ آنکس بن کر اس کی کھوپڑی میں چبھتا رہتا۔ اسے ہر وقت یوں محسوس ہوتا جیسے کوئی نشتر لے کر نہایت بے دردی سے اس کا سینہ کھرچ رہا ہو۔ پاؤں کا درد جو اسے رات رات بھر سونے نہ دیتا اب اس میں ایک نیا درد مل گیا نئی ٹیس اور نئی تڑپ پیدا ہو گئی۔

چکی جان کی زندگی بھی جمی جمائی نہ رہی۔ پہلے گھر کا کھانا میسر تھا۔ اب وہ میسر نہ رہا۔ کھانے پینے کے پروگرام میں گڑبڑ آ گئی۔ کبھی دولے حرامی کی دکان پر ناشتہ کرتا کبھی جیجے کے چائے خانے میں جا کر رات اور دوپہر کا کھانا کھاتا' کبھی گاموں کے ساتھ کھاتا' کبھی اکیلا کھاتا۔ جیجے کا لونڈا اسے ہر چیز لا دیتا۔ پہلی سی بات نہ رہی۔ ایک وہ زمانہ کہ تنہائی محسوس ہوتی تو حاجی تنکا کی صحبت میں سکون مل جاتا اور ایک زمانہ کہ ہر شے گرد و غبار کی طرح بکھر کر رہ گئی۔۔۔۔ حاجی تنکا کی زندگی میں جو بدمزگی آئی تھی اس کا اثر چکی جان پر بھی پڑا۔ وہ سمجھ نہ سکا کہ اس کا کیا علاج کرے۔ علاج معلوم نہ ہو تو آوارہ گردی ہی تکلیف رفع کرتی ہے چنانچہ اس نے آوارہ گردی بڑھا لی۔ گاموں کی دکان' جیجے کے ہوٹل اور بھیجے بھاڈی کے اڈے کے دن بھر چکر کاٹتا لیکن طبیعت سیر ہوتی نہ چین ملتا۔ ہاں جانی کو ضرور چین ملا۔ وہ یہ دیکھ کر خوش ہوتا کہ چکی جان اب حاجی تنکا کی دکان پر برائے نام بیٹھتا اور جیجے کے چائے خانے میں منڈلی جماتا ہے دوپہر لو منڈلی اٹھ کر بھیجے بھاڈی کے یہاں جمتی وہی روز کا سماں بندھتا۔۔۔۔ بھنگ گھٹتی دور چلتے گھڑا بجتا تانیں اڑتیں اور۔۔۔۔۔ اس کے بعد چکی جان نہانے کی غرض سے اٹھ آتا تو محفل تتر بتر ہو جاتی۔

حاجی تنکا کی دکان کے بعد جیجے کا چائے خانہ غنیمت ثابت ہوا اور چکی جان نے وہاں سکون محسوس کیا۔ گپ بازی آ جاتے اور وقت کٹ جاتا۔ رفتہ رفتہ بیکلی کم ہوئی۔

حاجی تنکا کے پاس بیٹھتا تو جھٹ بیزار ہو جاتا۔ ایک تو حاجی کراہتا رہتا۔ دوسرے شکایتوں کا دفتر کھول بیٹھتا۔ پہلے کبھی اس نے ایسا نہیں کیا تھا۔ اس کے مزاج میں چڑچڑا پن آ گیا تھا اور اب وہ ہر ایک کو برا بھلا کہنے لگا تھا۔ وہ گاموں' دولے حرامی' بھیجے بھاڈی اور جیجے کے خلاف زہر اگلتا رہتا بلکہ چکی جان کی بے

وفائی کا بھی گلہ کرتا۔

جانی کے ڈوبے ہوئے دل میں امید کی ہلکی ہلکی لہریں زور پکڑنے لگیں اور وہ سمجھنے لگا کہ مرجھائے ہوئے پھولوں میں جان پڑنے کی رت آ گئی ہے۔ ایک دن آنکھوں میں آنسو لیے خلیفہ جی کا پاس پہنچا اور ان کے پاؤں پکڑ کر بولا۔۔۔۔۔۔ آپ میرے پیر خانہ ہیں۔ دین دنیا میں مجھے بس آپ کا آسرا ہے۔ میں تھک ہار چکی ہوں۔ جیسے بھی بنے آپ میری مدد کریں۔ حاجی کو سمجھائیں۔ خواہ مخواہ اپنی مٹی پلید کر رہا ہے۔ مجھے اپنے برے دنوں کی لونڈی بنالے۔"

پہلے تو خلیفہ جی نے سوچا معاملہ ان کے اختیار سے باہر ہے لیکن پھر جب جانی کے ٹپ ٹپ گرتے آنسو دیکھے اور چیخیں سنیں تو انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ ضرور مداخلت کریں گے۔

رات گئے حاجی تنکا اداسیوں کی گھنیری گھٹاؤں میں گھرا بیٹھا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے گھمبیر تنہائی میں مرا جا رہا ہو۔ خلیفہ جی نے اسے اونچ نیچ سے واقف کرنا چاہا لیکن وہ تمام اونچ نیچ سمندر کی لہروں کے حوالے کیے بیٹھا تھا۔ اب تو اس کے سامنے گہرائی ہی گہرائی تھی۔ وہ کسی قیمت پر جانی کو دوبارہ آباد کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ اسے چکی جان سے پیار تھا۔

خلیفہ جی نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا تھا اور محبت کے اسرار و رموز سے کماحقہ آگاہ تھے۔ انہوں نے ہمدردی کے لہجے میں کہا۔۔۔۔۔۔ "حاجی تنکا! بن کا پنچھی پنجرے میں قید نہیں رہتا۔ چکی جان کو کیا سمجھتے ہو؟ وہ آزاد طبیعت کی بندی ہے۔ اسے کسی سے پیار نہیں اور سب سے ہے اسے پابند نہیں کیا جا سکتا۔ ہر ایک کی صفت الگ الگ ہوتی ہے۔ چکی جان کو مولا نے نرالی طبیعت دی ہے۔ اس سے یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک کو خوش رکھے اور ایک کو ناراض کرے۔ اس کی تو ایسی طبیعت ہے کہ خوش رکھے تو سبھی کو خوش رکھے۔ میری مانو جانی سے صلح کر لو! کہو تو پاؤں پکڑوا دوں معافی منگوا دوں۔ وہ تمہارے پاؤں دھو دھو پئے۔ مولا دستگیر جانے میں نے کبھی کسی کو غلط صلاح نہیں دی۔ مجھے چکی جان سے بیر نہیں لیکن جو سچی بات ہے وہ سچی ہی ہے اور میں نے کہہ دی ہے۔

اس گفتگو نے حاجی کو سوچ میں ڈال دیا۔ اس نے گردن جھکا لی۔ پہلے تو یوں لگا جیسے وہ کچھ کہے گا ہی نہیں جیسے وہ بولنے کی تاب ہی نہیں رکھتا لیکن تھوڑی دیر بعد بولا "جانی کا نام نہ لو خلیفہ! اس نے مجھے برباد کیا ہے۔ اس کی تو میں شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتا۔ مجھے چکی جان سے پیار ہے۔ آج نہیں تو کل اسے پا لوں گا۔ مجھے پتہ ہے لوگ اسے بہکا رہے ہیں لیکن اسے ضرور ٹھوکر لگے گی۔ جو لوگ اسے بہکا رہے ہیں اسے دھوکا دیں گے پھر چکی میرے پاس آئے گی۔"

خلیفہ جی کے جانے کے بعد حاجی تنکا کو دھچکا سا لگا۔ اسے یہ من کر دکھ ہوا کہ چکی جان کا آوارہ پن اسے ایک کا ہو رہنے پر آمادہ نہ کر سکے گا۔ اسے پہلے ہی روگ لگا تھا۔ اب یہ غم کھانے لگا کہ وہ چکی جان کو سب کے پنجے سے چھڑا کر اپنا بنانے میں ناکام ہوا تھا۔

خلیفہ جی نہ آتے تو اچھا تھا۔ انہوں نے آکر تو اور بھالے مار دیئے۔ وہ تو کب سے کانٹوں پر لوٹ رہا تھا۔ اب یہ کانٹے اس کی روح کو بھی ڈسنے لگے۔ وہ اور زیادہ کراہنے لگا۔ جوں جوں سوچتا چکی جان کا پیار تیکھا ہوتا جاتا اور کانٹے زیادہ شدت سے ڈسنے لگتے۔ وہ تو جیسے آندھی کا پیچھا کر رہا تھا۔ خلیفہ جی نے رہی سہی امید بھی توڑ دی۔ اسے جتا دیا کہ چکی جان کی بے وفائی اٹل ہے۔

دل کی دنیا سونی ہوئی تو دوکان بھی سونی ہو گئی۔ جس کے دم قدم سے رونق تھی اسے حاجی تنکا کی پرواہ تھی۔ گاہکوں کی آمد کم ہوگئی۔ اب تو وہی آتے جو پرانی وضعداری کے پابند تھے۔ سودا باقاعدگی سے نہ آتا۔ کبھی پان ہے تو کتھا چونا نہیں۔ قینچی کا سگریٹ ہے تو کیونڈر کا نہیں۔ بڑھتی ہوئی اداسی کے ساتھ ساتھ حاجی تنکا کا دل بیٹھتا جاتا۔ ڈوبا ہوا دل ابھرنا چاہتا لیکن رہ جاتا۔

ایک دن تو وہ اتنا غم زدہ ہوا کہ آنکھوں میں آنسو آگئے۔ دکان بند کر کے شیر شاہ کی درگاہ پر چلا گیا۔ یہاں آکر اس کے دل میں روشنی کی ایک کرن پھوٹی اور کشتی بھنور سے نکل کر کنارے آ گئی۔ اس نے درگاہ کے کنویں سے پانی نکالا اور وضو کیا۔ نہایت خشوع وخضوع سے درگاہ میں داخل ہوا۔ آج سے چند سال ادھر جب وہ حج کرنے گیا تھا تب بھی اس کے دل میں اس طرح عقیدت کا طوفان اٹھا تھا۔ اس نے قدموں کی طرف تعویذ کی جڑ میں سر رکھ دیا۔ اپنے پیار کی کامیابی کے لیے دعا مانگی۔ اسے پورا پورا یقین تھا کہ شیر شاہ اس کی سنیں گے اور مراد پوری کر کے رہیں گے۔ اس نے سر اٹھایا اور بیٹھ کر وہ دو چار آیتیں پڑھیں جو اس نے حج پر جاتے ہوئے حفظ کی تھیں۔ اس نے ساری رات درگاہ پر گزاری۔ کبھی سجدے میں جاتا اور کبھی بیٹھ کر آیتیں پڑھتا۔ ساتھ ساتھ آنسو بہاتا۔

فجر کی اذان ہوئی تو اسے نیند آگئی۔ دن چڑھے تک آنکھ نہ کھلی۔ جانے کب تک یونہی پڑا رہتا کہ ایک زائر نے اسے جگا دیا۔ زائر کا خیال تھا کہ درگاہ کی حدود میں دعا مانگی جا سکتی تھی سویا نہیں جا سکتا تھا۔ ٹانگ کی چوٹ کے بعد آج پہلی بار اسے نیند آئی کہ اسے جگا دیا گیا۔

رت جگے کی وجہ سے اس کا سارا بدن درد کرنے لگا۔ دکان پر جانے کی بجائے وہیں درگاہ کی بغل والے تکیے میں چلا گیا اور چرس کا سوٹا لگا کر ایک طرف میلی چٹائی پر سو رہا۔ دوپہر کے وقت اٹھا اور دوکان پر آیا۔

جیجھے کے چائے خانے میں قہقہوں کی بوچھاڑ ہو رہی تھی۔ حاجی کی طبیعت جو رات بھر کی ریاضت سے قدرے ہلکی ہوئی تھی، قہقہوں کا شور سن کر پھر بپھر گئی۔ ایک کڑا بوجھ سینے پر آ گرا۔ چکی جان کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ چکی جان نے حد کر دی۔ حاجی تنکا رات بھر غائب رہا' اس نے خبر تک نہ لی۔ حاجی تنکا نے دل میں کہا۔۔۔ "ظالم کو لگن ہوتی تو ضرور اسے ڈھونڈ نکالتا اور شیر شاہ کی درگاہ پر پہنچتا۔" یہ کون دور جگہ تھی؟ شاہی مسجد کے مقابل قلعے کے پیچھے ہی تو تھی۔ بہت ہوگا تو دس منٹ کا راستہ ہوگا۔ چکی جان کو معلوم تھا کہ حاجی تنکا دکان سے اٹھ کر جاتا تو صرف تین جگہ جاتا۔۔۔۔ سودا سلف لینے بازار جاتا۔ سوٹا لگانے بودی سائیں کے تکیے میں اور دعا مانگنے شیر شاہ کی درگاہ پر جاتا۔

حاجی تنکا کو شیر شاہ سے بلا کی عقیدت تھی۔ زندگی میں کئی بار ان کے کمالات دیکھ چکا تھا۔ ایک دفعہ جب گنجا ٹھوٹھی جھانسہ دے کر جانی کو بھگا کر لے گیا تو شیر شاہ کی مہربانی سے جانی صحیح سلامت لوٹ آیا۔ چوری ہوئی تو شیر شاہ نے نظر کرم کی چور پکڑا گیا۔ مال برآمد ہو گیا۔ پھر چکی جان بھی تو انہیں کی عنایت سے اسے ملا تھا۔

اس کے دل میں حسرت ہی رہی جب وہ درگاہ پر آنسو بہا رہا اور دعا مانگ رہا تھا اگر اس وقت شیر شاہ کرشمہ دکھاتے اور چکی جان کو کھینچ لاتے تو کتنا مزہ آتا؟

حاجی تنکا چپ چاپ دکان پر بیٹھا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد جیجا چکی جان کے گلے میں ہاتھ ڈالے چائے خانے سے باہر نکلا۔ اگر گاموں پیچھے سے آ کر گھونسہ رسید نہ کرتا تو ہاتھ اپنی جگہ سے الگ نہ ہوتے۔ جیجا اور چکی جان بھیجے بھاڑی کے اڈے پر چلے گئے۔ حاجی تنکا دیکھتا ہی رہ گیا۔ اسے امید تھی کہ چکی جان آئے گا اور حال پوچھے گا۔ لیکن کہاں؟ وہ ایسا غائب ہوا کہ جب بھیجے بھاڑی کے اڈے سے اٹھ کر چوبارے پر گیا تو حاجی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔۔۔۔۔۔ حاجی لہو کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔

اگلے دن چراغوں کا میلہ تھا۔ چراغوں کے میلے سے حاجی تنکا کو بڑا عشق تھا۔ اس نے کبھی میلہ نہ چھوڑا تھا۔ جب بھی میلہ آتا وہ ایک ہفتہ پہلے سے تیاریوں میں لگ جاتا۔ جیجے' گاموں' بھیجی' دوے اور سب دوستوں کو بلاتا۔ جانی کو شریک اجلاس کرتا اور پروگرام تیار کرتا۔ بڑی سرگرمی دکھاتا۔ ایک دن پہلے پارٹی اس کی قیادت میں شالامار پہنچ جاتی۔ یہ لوگ اچھی سے اچھی جگہ دیکھ کر خیمہ گاڑتے اور ڈیرے جماتے' گانے کی محفل لگتی۔ چائے پانی کے دور چلتے' مرغ بھنتے اور خوب گہما گہمی رہتی۔ کبھی یہ جوش و خروش تھا اور اب یہ حالت تھی کہ کسی نے سابقہ قائد کو بھولے سے بھی تو نہیں کہا کہ وہ بھی ساتھ چلے۔ دنیا کیسی طوطا چشم تھی۔ گو اس میں جانے کی ہمت نہ تھی لیکن چکی جان دعوت دیتا تو وہ چلنے کے لیے تیار ہو جاتا اور پاؤں کا درد بھول جاتا۔

وہ جان گیا کہ اسے جان بوجھ کر انظر انداز کیا گیا ہے۔

زوال کے بعد چکی بازار میں شور وغل ہونے لگا۔ گاموں نے ججے کو اور ججے نے چکی جان کو آواز دی تھوڑی دیر کے بعد بھجے پھاڈی نے تھڑے پر کھڑے ہو کر بازار کا جائزہ لیا۔ دولا حرامی خوانچہ سنبھال کر گھر جا رہا تھا۔ بھجے پھاڈی نے کہا" اوئے دولے حرام دے! اب تو نے دکان بڑھائی ہے' تیار کب ہو گا' میلے کو کب جائے گا؟"

دولے حرامی نے نہایت بے پروائی سے کہا" ماں کے یار! تجھے بڑی جلدی ہے تو بے شک چلا جا! میں تو اب جا کر تیاری کروں گا مجھے ساتھ لے لیا تو خیر صلا۔ نہیں تو میں اکیلا شالا مار پہنچ جاؤں گا۔ مجھے راستہ آتا ہے۔"

"تیری خوشی پیارے! ہم تو تیار بر تیار ہیں۔"

دولا حرامی خوانچہ اٹھا کر گھر چلا گیا اور بھجا پھاڈی تھڑے سے اتر کر نالی میں پیشاب کرنے بیٹھ گیا۔ گاموں ہرے رنگ اور لال دھاریوں والی ملتانی دھوتی اس پر دو گھوڑا بوسکی کا نیا کرتہ اور گلابی ریشمی مندیل پہن کر نکلا۔ گاے شاہی نئی سرخ جوتی چمک رہی تھی گلے میں سونے کا کنٹھا بہار دکھا رہا تھا۔ مونچھیں سروں تک خوب بٹی ہوئی تھیں جیسے پولیس کے سپاہی ڈیوٹی پر ڈٹ رہے ہوں۔ چکی جان نے چوبارے میں بیٹھے بیٹھے دولہا کو دیکھا اور مسکرانے لگا۔ گاموں نے زبان میں دو انگلیاں اڑا کر اس زور سے سیٹی بجائی کہ پورا چکی بازار گونج اٹھا۔ ججا سیٹی سنتے ہی دکان سے باہر نکل آیا۔ اس کی ترچھی لمبے شملے والی لنگی اور ڈھیلی ڈھالی شلوار فراغت اور چستی کا اعلان کر رہی تھی۔ کالر والی قمیض کی ایک جیب میں اصلی ریشم کا مہین گلناری رومال آدھا اندر اور آدھا باہر تھا۔

گاموں نے سگریٹ کا دھواں منہ سے اڑاتے ہوئے کہا" اوئے یار! میلے کب چلے گا؟" ججے نے چکی جان کے چوبارے کی طرف ہاتھ سے اشارہ کر کے کہا" جب ہمارا دلبر چکی جان چلے گا۔"

حاجی تنکا کے سینے پر سانپ لوٹ گئے۔ ایک تو اس کا میلے سے رہ جانا ہی کم قیامت نہ تھا۔ پھر چکی جان کا ان سب کے ہجوم میں مل کر جانا تو اور بھی غضب تھا۔ کوئی کہاں تک صبر کرتا؟ حاجی کو تو کسی نے انگاروں پر لٹا دیا۔

چکی جان ابھی تک تیار نہ ہوا تھا۔ کھڑکی میں بیٹھا دوسروں کی حرکتیں دیکھ رہا تھا۔ بال بکھر رہے تھے جیسے رات سایہ ڈال رہی ہو۔ کھلے گریبان میں سے بدن کا بے داغ' چمکتا دمکتا حصہ نظر آ رہا تھا جس نے شاید سحری سویرے بھیک مانگ لی تھی۔ بھنگ پینے کے بعد سستی سی آ گئی تھی اور اس کا باسی کھڑا پھیکی

مسکراہٹوں کے بوجھ تلے دب رہا تھا۔ اس کی بڑی بڑی نشیلی آنکھیں بازار پر اس انداز سے پڑ رہی تھیں جیسے آفتاب کرنیں نچھاور کر رہا ہو۔ وہ کبھی گاموں کو اور کبھی ججے کو دیکھتا۔

پھجے پھاڈی نے سب کو مات کر دیا۔ ساجی درزی نے اپنے خاص الخاص مشورے اور اپنی مرضی سے میلے کے لیے اسے بش شرٹ سی دی جو اس نے شلوار پر ہی پہن لی حالانکہ ساجی نے پتلون بھی تیار کر دی تھی۔ آنکھوں میں سرمہ ڈال کر گلفام بن گیا۔

حاجی سب کے ٹھاٹ دیکھ کر جل بھن گیا۔ وہ ہر گز نہ چاہتا کہ چنگی جان ان کے ساتھ جائے وہ چاہتا تھا کہ میلے کا دن چنگی جان اس کے ساتھ گزارے۔ اس کے پہلو میں بیٹھے اسے مدت ہی ہو گئی تھی۔ آج چنگی جان کی اسے بڑی آرزو ہوئی۔ تصور کی زبردست لہر اٹھی اور وہ اس میں بہہ گیا۔

دکان رہی نہ لنگڑا پاؤں اور نہ اس کی غمگین زندگی۔ وہ خوبصورت محل سرا میں جا پہنچا جہاں چنگی جان اس کے انتظار میں بے قرار تھا۔ نظروں سے نظریں ٹکرائیں بھرپور مستی دھیرے دھیرے آنکھوں میں سے ہو کر حاجی تنکا کے بدن میں سرایت کر گئی۔ اس نے قریب جا کر چنگی جان کو بغلگیر کیا۔ ہلکی ہلکی آنچ جذبات کو دم پخت کرنے لگی۔ قریب ہی سنہری پلنگ پر ریشمی بچھونا لگا تھا۔ بچھونا بالکل بھرا تھا اور اس پر نام کو سلوٹ نہ تھے لیکن پھر دیکھتے دیکھتے اس پر سلوٹ پڑنے لگے۔ جو سلوٹ دلوں میں پڑ رہے تھے وہی سلوٹ پلنگ پر نمودار ہونے لگے۔ دو زندگیوں میں بڑی بے تابی سے سلوٹ پڑنے لگے۔ پھر یہ سلوٹ دو بے تاب زندگیوں کا دلفریب تصور اور محل سرا غائب ہوئے۔۔۔۔۔۔ صرف غسل خانہ سامنے رہ گیا۔

نل کھلا تھا اور پانی یوں ٹپ ٹپ گر رہا تھا۔ جیسے استاد انترے کے بول گا رہا ہو کبھی نل کی دھار ہلکی پڑ جاتی اور بول انترے سے اتر کر استائی پر آ جاتے۔ غسلخانے کا کواڑ نیچے سے شکستہ تھا۔ اس لیے اندر سے پانی کے چھینٹے اڑ اڑ کر باہر فرش پر پڑ رہے تھے۔

پلنگ پر گہرے نیلے رنگ کا ریشمی غرارہ دھرا تھا۔ اس میں ازار بند بھی اسی رنگ کا پڑا تھا اگر سرے سنہرے تاروں سے گندھے نہ ہوتے تو ازار بند کا پتہ ہی نہ چلتا۔ اس پر ہلکے نیلے رنگ کی لنن کی قمیص رکھی تھی اور برابر میں گہرے نیلے رنگ کا دوپٹہ پڑا تھا۔ ایک طرف سرخ پرس رکھا تھا۔ پلنگ کے نیچے سچے تلے کی جوتی دھری تھی۔ گاموں 'پھجا' پھاڈی 'دولا حرامی' بودی سائیں 'گنجا ٹھوٹھی' ساجی درزی اور ججا سب چائے خانے میں بیٹھے بے قراری سے چنگی جان کے چوبارے کی طرف دیکھ رہے تھے۔

دولا حرامی بولا۔۔۔۔۔۔ "یار چنگی نے تو بڑی دیر لگا دی۔"

پھجے پھاڈی نے جواباً کہا۔۔۔۔۔۔ "معشوق کا کام دیر لگانا ہی تو ہے۔"

پھر میلے کے پروگرام پر گفتگو ہونے لگی۔ سڑک پر حسو تانگے پر بیٹھا سوتا لگ رہا تھا اور اس کا گھوڑا ہنہنا رہا تھا۔ ساتھ ہی کرمو اپنے ریڑھے پر ٹانگیں پسارے پڑا تھا۔

حسو جماہی لیتے ہوئے مایوسانہ انداز میں بولا ۔۔۔۔۔۔ "استاد جیجا! کتنی دیر اور ہے؟" کرمو نے کان کھڑے کئے۔

جیجے نے بڑی بے تکلفی سے دو تین چالو قسم کی گالیاں فرمائیں اور پھر کہا۔۔ "تجھے تو دیہاڑی پوری ملے گی۔ تجھے دیر سویر سے کیا؟"

"ہاں ٹھیک ہے۔ مجھے دیہاڑی چاہیے۔ دیر سویر سے کیا؟ اور یہ کہہ کر وہ سوتا لگانے لگا۔ کرمو بھی تار کا سگریٹ نکال کر پینے لگا۔

ادھر نل بند ہوا۔ پانی کی ٹپ ٹپ رک گئی۔ کواڑ کھلا۔ چنی جان مسکراتا ہوا باہر نکلا اور اس کا ننگا بدن یوں چمکا جیسے چاند ڈھل کر طلوع ہوا ہو۔ ایک دم زور کی چیخ نکلی اور تیز چھری اس کی نرم و نازک پسلیوں میں دھنس گئی۔ بھاگ کر کوٹھے پر چڑھنے لگا لیکن حاجی تنکا نے اس دہشت زدہ گائے کو لمبے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹ لیا اور اسی ٹانگ کے نیچے دبا لیا جو لنگڑی تھی اور اب اس میں کوٹ کوٹ کر بجلی بھر گئی تھی۔ چنی جان فریادی گائے کی طرح اس کی طرف دیکھنے لگا لیکن قصاب نے رحم نہ کھایا بلکہ تیز چھری نرخرے پر رکھ کر حلق میں اتار دی۔ خون کی دھار نکلی اور حاجی تنکا کے کپڑے لال کر گئی۔

ایک مسکراہٹ ہمیشہ کے لیے سوگئی۔

ایک پھول دھول میں مل گیا۔

چنی جان کی لاش تڑپ تڑپ کر ٹھنڈی ہوگئی اور پھر بازار یوں سونا ہوا جیسے دلی اجڑی ہو۔

سعادت حسن منٹو

# ہتک

دن بھر کی تھکی ماندی وہ ابھی ابھی اپنے بستر پر لیٹی تھی اور لیٹتے ہی سو گئی تھی۔ میونسپل کمیٹی کا داروغہ صفائی جسے وہ سیٹھ کے نام سے پکارا کرتی تھی ابھی ابھی اس کی ہڈیاں پسلیاں جھنجوڑ کر شراب کے نشے میں چور گھر واپس گیا تھا۔۔۔۔۔۔ وہ رات کو یہاں بھی ٹھہر جاتا مگر اسے اپنی دھرم پتنی کا بہت زیادہ خیال تھا جو اس سے بے حد پریم کرتی تھی۔

وہ روپے جو اس نے جسمانی مشقت کے بدلے اس داروغہ سے وصول کیے تھے اس کی چست اور تھوک بھری چولی کے نیچے سے اوپر کو ابھرے ہوئے تھے۔ کبھی کبھی سانس کے اتار چڑھاؤ سے چاندی کے یہ سکے کھنکھنانے لگتے اور اس کی کھنکھناہٹ اس کے دل کی غیر آہنگ دھڑکنوں میں گھل مل جاتی۔ ایسا معلوم ہوتا کہ ان سکوں کی چاندی پگھل کر اس کے دل کے خون میں ٹپک رہی ہے۔

اس کا سینہ اندر سے تپ رہا تھا۔ یہ گرمی تو کچھ اس برانڈی کے باعث تھی جس کا ادھا داروغہ اپنے ساتھ لایا تھا اور کچھ اس "بیوڑا" کا نتیجہ تھی جس کا سوڈا ختم ہونے پر دونوں نے پانی ملا کر پیا تھا۔

وہ ساگوان کے لمبے اور چوڑے پلنگ پر اوندھے منہ لیٹی تھی۔ اس کی باہیں جو کاندھوں تک ننگی تھیں پتنگ کی اس کانپ کی طرح پھیلی ہوئی تھیں جو اوس میں بھیگ جانے کے باعث پتلے کاغذ سے جدا ہو جائے۔۔۔۔۔۔ دائیں بازو کی بغل میں شکن آلود گوشت ابھرا ہوا تھا جو بار بار مونڈنے کے باعث نیلی رنگت اختیار کر گیا تھا۔ جیسے نچی ہوئی مرغی کی کھال کا ایک ٹکڑا وہاں پر رکھ دیا گیا ہے۔

کمرہ بہت چھوٹا تھا جس میں بے شمار چیزیں بے ترتیبی کے ساتھ بکھری ہوئی تھیں۔ تین چار سوکھے سڑے چپل پلنگ کے نیچے پڑے تھے جن کے اوپر منہ رکھ کر ایک خارش زدہ کتا سو رہا تھا اور نیند میں کسی غیر مرئی چیز کو منہ چڑا رہا تھا۔ اس کتے کے بال جگہ جگہ سے خارش کے باعث اڑے ہوئے تھے۔ دور سے آ کر کوئی اس کتے کو دیکھتا تو سمجھتا کہ پیر پونچھنے والا پرانا ٹاٹ دوہرا کر کے زمین پر رکھا ہے۔

اس طرف چھوٹے سے دیوار گیر پر سنگار کا سامان رکھا تھا۔ گالوں پر لگانے کی سرخی، ہونٹوں کی

سرخی بی پاؤڈر کنگھی اور لوہے کے پن جو وہ غالباً اپنے جوڑے میں لگایا کرتی تھی۔ پاس ہی ایک لمبی کھونٹی کے ساتھ سبز طوطے کا پنجرہ لٹک رہا تھا جو گردن کو اپنی پیٹھ کے بالوں میں چھپائے سو رہا تھا۔ پنجرہ کچے امرود کے ٹکڑوں اور گلے ہوئے سنگترے کے چھلکوں سے بھرا ہوا تھا۔ ان بدبودار ٹکڑوں پر چھوٹے چھوٹے کالے رنگ کے مچھر یا پتنگے اڑ رہے تھے۔

پلنگ کے پاس ہی بید کی ایک کرسی پڑی تھی جس کی پشت سر ٹیکنے کے باعث بے حد میلی ہو رہی تھی۔ اس کرسی کے دائیں ہاتھ کو ایک خوبصورت تپائی تھی جس پر ہز ماسٹرز وائس کا پورٹ ایبل گراموفون پڑا تھا۔ اس گراموفون پر منڈھے ہوئے کالے کپڑے کی بہت بری حالت تھی۔ زنگ آلود سوئیاں تپائی کے علاوہ کمرے کے ہر کونے میں بکھری ہوئی تھیں۔ اس تپائی کے عین اوپر دیوار پر چار فریم لٹک رہے تھے جن میں مختلف آدمیوں کی تصویریں جڑی تھیں۔

ان تصویروں سے ذرا ادھر ہٹ کر یعنی دروازے میں داخل ہوتے ہی بائیں طرف کی دیوار کے کونے میں شوخ رنگ کی گنیش جی کی تصویر تھی جو تازہ اور سوکھے ہوئے پھولوں سے لدی ہوئی تھی۔ شاید یہ تصویر کپڑے کے کسی تھان سے اتار کر فریم میں جڑوائی گئی تھی۔ اس تصویر کے ساتھ چھوٹے سے دیوار گیر پر جو کہ بے حد چکنا ہو رہا تھا تیل کی ایک پیالی دھری تھی جو دیئے کو روشن کرنے کے لیے وہاں رکھی گئی تھی۔ پاس ہی دیا پڑا تھا جس کی لو ہوا بند ہونے کے باعث ماتھے کے تلک کی مانند سیدھی کھڑی تھی۔ اس دیوار گیر پر دھوپ کی چھوٹی بڑی مروڑیاں بھی پڑی تھیں۔

جب وہ بونی کرتی تھی تو دور سے گنیش جی کی اس مورتی سے روپے چھوا کر اور پھر اپنے ماتھے کے ساتھ لگا کر انہیں اپنی چولی میں رکھ لیا کرتی تھی۔ اس کی چھاتیاں چونکہ کافی ابھری ہوئی تھیں اس لیے وہ جتنے روپے بھی چولی میں رکھتی محفوظ پڑے رہتے تھے۔ البتہ کبھی کبھی جب مادھو پونے سے چھٹی لے کر آتا تو اسے اپنے کچھ روپے پلنگ کے پائے کے نیچے اس چھوٹے سے گڑھے میں چھپا پڑتے تھے جو اس نے خاص اس کام کی غرض سے کھودا تھا۔ مادھو سے روپے محفوظ رکھنے کا یہ طریقہ سوگندھی کو رام لال دلال نے بتایا تھا۔ اس نے جب یہ سنا تھا کہ مادھو پونے سے آ کر سوگندھی پر دھاوا بولتا ہے تو کہا تھا۔ ''اس سالے کو تو نے کب سے یار بنایا ہے۔۔۔۔۔ یہ بڑی انوکھی عاشقی ہے۔۔۔۔۔۔ سالا ایک پیسا اپنی جیب سے نکالتا نہیں اور تیرے ساتھ مزے اڑاتا رہتا ہے۔ مزے الگ رہے۔ تجھ سے کچھ لے ہی مرتا ہے۔۔۔۔۔ سوگندی مجھے کچھ دال میں کالا کالا نظر آتا ہے۔ اس سالے میں کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے جو تجھے بھا گیا ہے۔۔۔۔۔ سات سال سے یہ دھندا کر رہا ہوں۔ تم چھوکریوں کی ساری کمزوریاں جانتا ہوں۔''

یہ کہہ کر رام لال دلال نے جو بمبئی شہر کے مختلف حصوں سے دس روپے سے لے کر سو روپے تک والی ایک سو بیس چھوکریوں کا دھندا کرتا تھا۔ سوگندھی کو بتایا۔۔۔ "سالی! اپنا دھن یوں نہ برباد کر۔ تیرے انگ پر سے یہ کپڑے بھی اتار لے جائے گا۔ وہ تیری ماں کا یار!۔۔۔۔ اس پلنگ کے پائے کے نیچے چھوٹا سا گڑھا کھود کر اس میں سارے پیسے دبا دیا کر اور جب وہ یار آیا کرے تو اس سے کہا کر۔۔۔ "تیری جان کی قسم مادھو آج صبح سے ایک دھیلے کا منہ نہیں دیکھا۔ باہر والے سے کہہ کر ایک کوپ چائے اور ایک افلاطون بسکٹ تو منگا۔ بھوک سے میرے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہیں۔۔۔۔۔۔ سمجھیں؟ بہت نازک وقت آگیا ہے میری جان۔۔۔۔ اس سالی کانگریس نے شراب بند کر کے بازار بالکل مندا کر دیا ہے۔ پر تجھے تو کہیں نہ کہیں سے پینے کو مل ہی جاتی ہے۔ بھگوان قسم جب تیرے یہاں کبھی رات کی خالی کی ہوئی بوتل دیکھتا ہوں اور دارو کی باس سونگھتا ہوں تو جی چاہتا ہے تیری جون میں چلا جاؤں۔"

سوگندھی کو اپنے جسم میں سب سے زیادہ اپنا سینہ پسند تھا۔ ایک بار جمنا نے اس سے کہا تھا "نیچے سے ان بم کے گولوں کو باندھ کر رکھا کر۔ انگیا پہنا کرے گی تو اس کی سختائی ٹھیک رہے گی۔"

سوگندھی یہ سن کر ہنس دی "جمنا تو سب کو اپنے سری کا سمجھتی ہے۔ دس روپے میں لوگ تیری بوٹیاں توڑ کر چلے جاتے ہیں تو تو سمجھتی ہے کہ سب کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوتا ہوگا۔ کوئی موا لگائے تو ایسی ویسی جگہ ہاتھ۔۔۔۔۔۔ ارے ہاں کل کی بات تجھے سناؤں! رام لال رات کے دو بجے ایک پنجابی کو لایا۔ رات کا تیس روپے طے ہوا۔ جب سونے لگے تو میں نے بتی بجھا دی۔۔۔۔ ارے وہ تو ڈرنے لگا!۔۔۔ سنتی ہو جمنا؟ تیری قسم اندھیرا ہوتے ہی اس کا سارا ٹھاٹھ کرکرا ہو گیا۔۔۔۔ وہ ڈر گیا۔ میں نے کہا چلو چلو دیر کیوں کرتے ہو! تین بجنے والے ہیں۔ ابھی دن چڑھ آئے گا۔۔۔۔۔ بولا۔۔۔۔ روشنی کرو۔۔۔۔ روشنی کرو۔۔۔۔ میں نے کہا یہ روشنی کیا ہوا!۔۔۔ بولا لائٹ۔۔۔۔ لائٹ! اس کی بھنچی ہوئی آواز سن کر مجھ سے ہنسی نہ رکی۔ بھئی میں تو لائٹ نہ کروں گی! اور یہ کہہ کر میں نے اس کی گوشت بھری ران کی چٹکی لی۔۔۔۔ تڑپ کر اٹھ بیٹھا اور لائٹ آن کر دی۔ میں نے جھٹ سے چادر اوڑھ لی اور کہا تجھے شرم نہیں آتی ہے مردوے!۔۔۔۔ وہ پلنگ پر آیا تو میں اٹھی اور لپک کر لائٹ بجھا دی۔۔۔۔ وہ پھر گھبرانے لگا۔۔۔۔ تیری قسم بڑے مزے میں رات کٹی۔۔۔۔ کبھی اندھیرا کبھی اجالا۔ کبھی اجالا کبھی اندھیرا۔۔۔۔ ٹرام کی کھڑ کھڑ ہوئی تو پتلون وتلون پہن کر وہ اٹھ بھاگا۔۔۔۔ سالے نے تیس روپے سٹے میں جیتے ہوں گے جو یوں مفت دے گیا۔۔۔۔ جمنا تو بالکل الھڑ ہے۔ بڑے بڑے گر یاد ہیں مجھے ان لوگوں کے ٹھیک کرنے کے لیے۔"

سوگندھی کو واقعی بہت سے گر یاد تھے۔ جو اس نے اپنی دو ایک سہیلیوں کو بتائے بھی تھے۔ عام طور پر وہ یہ گر سب کو بتایا کرتی تھی۔۔۔۔۔۔" اگر آدمی شریف ہو زیادہ باتیں کرنے والا ہو تو اس سے خوب شرارتیں کرو ان گنت باتیں کرو۔ اسے چھیڑو اس کے گدگدی کرو اس سے کھیلو۔۔۔۔۔ اگر داڑھی رکھتا ہو تو اس میں انگلیوں سے کنگھی کرتے کرتے دو چار بال بھی نوچ لو۔ پیٹ بڑا ہو تو تھپتھپاؤ۔۔۔ اس کو اتنی مہلت ہی نہ دو کہ اپنی مرضی کے مطابق کچھ کرنے پائے۔۔۔۔۔ وہ خوش خوش چلا جائے اور تم بھی بچی رہو گی۔۔۔۔ ایسے مرد جو گپ چپ رہتے ہوں بڑے خطرناک ہوتے ہیں بہن۔۔۔۔۔ ہڈی پسلی توڑ دیتے ہیں اگر ان کا داؤ چل جائے۔"

سوگندھی اتنی چالاک نہیں تھی جتنی خود کو ظاہر کرتی تھی۔ اس کے گاہک بہت کم تھے۔ غایت درجہ جذباتی لڑکی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تمام گر جو اسے یاد تھے اس کے دماغ سے پھسل کر اس کے پیٹ میں آ جاتے تھے۔ جس پر ایک بچہ ہونے کے باعث کئی لکیریں پڑ گئی تھیں ان لکیروں کو پہلی مرتبہ دیکھ کر اسے ایسا لگا تھا کہ اس کے خارش زدہ کتے نے اسے پنجے سے یہ نشان بنا دیئے ہیں۔۔۔۔۔۔۔ جب کوئی کتیا بڑی بے اعتنائی سے اس کے پالتو کے پاس سے گزر جاتی تو وہ شرمندگی دور کرنے کے لیے زمین پر اپنے پنجوں سے اسی قسم کے نشان بنایا کرتا تھا۔

سوگندھی دماغ میں زیادہ رہتی تھی لیکن جوں ہی کوئی نرم و نازک بات۔۔۔۔ کوئی کول بول اس سے کہتا تو جھٹ پگھل کر وہ اپنے جسم کے دوسرے حصوں میں پھیل جاتی۔ گو مرد اور عورت کے جسمانی ملاپ کو اس کا دماغ بالکل فضول سمجھتا تھا مگر اس کے جسم کے باقی اعضاء سب کے سب اس کے بہت بری طرح قائل تھے! وہ تھکن چاہتے تھے۔۔۔۔۔۔ ایسی تھکن جو انہیں جھنجھوڑ کر۔۔۔۔ انہیں مار کر سلانے پر مجبور کر دے! ایسی نیند جو تھک کر چور چور ہونے کے بعد آئے۔ کتنی مزیدار ہوتی ہے۔۔۔۔ وہ بے ہوشی جو مار کھا کر بند بند ڈھیلے ہو جانے پر طاری ہوتی ہے۔ کتنا آنند دیتی ہے۔۔۔۔ کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم ہو اور کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم نہیں ہو اور اس ہونے اور نہ ہونے کے بیچ میں کبھی کبھی ایسا بھی محسوس ہوتا ہے کہ تم ہوا میں بہت اونچی جگہ لٹکی ہوئی ہو۔ اوپر ہوا' نیچے ہوا' دائیں ہوا' بائیں ہوا' بس ہوا ہی ہوا اور پھر اس ہوا میں دم گھٹنا بھی ایک خاص مزا دیتا ہے۔

بچپن میں جب وہ آنکھ مچولی کھیلا کرتی تھی اور اپنی ماں کا بڑا صندوق کھول کر اس میں چھپ جایا کرتی تھی' تو ناکافی ہوا میں دم گھٹنے کے ساتھ ساتھ پکڑے جانے کے خوف سے وہ تیز دھڑکن جو اس کے دل میں پیدا ہو جایا کرتی تھی۔ کتنا مزا دیا کرتی تھی۔

سوگندھی چاہتی تھی کہ اپنی ساری زندگی کسی ایسے ہی صندوق میں چھپ کر گزار دے جس کے باہر ڈھونڈنے والے پھرتے رہیں۔ کبھی کبھی اس کو ڈھونڈ نکالیں تا کہ وہ بھی ان کو ڈھونڈنے کی کوشش کرے۔ یہ زندگی جو وہ پانچ برس سے گزار رہی تھی آنکھ مچولی ہی تو تھی۔ کبھی وہ کسی کو ڈھونڈ لیتی تھی اور کبھی کوئی اسے ڈھونڈ لیتا تھا۔۔۔۔۔ بس یوں ہی اس کا جیون بیت رہا تھا۔ وہ خوش تھی اس لیے کہ اس کو خوش رہنا پڑتا تھا۔ ہر روز رات کو کوئی نہ کوئی مرد اس کے چوڑے ساگوان کے پلنگ پر ہوتا تھا اور سوگندھی جس کو مردوں کے ٹھیک کرنے کے بے شمار گر یاد تھے اس بات کا بار بار تہیہ کرنے پر بھی کہ وہ ان مردوں کی کوئی ایسی ویسی بات نہیں مانے گی اور ان کے ساتھ بڑے روکھے پن کے ساتھ پیش آئے گی' ہمیشہ اپنے جذبات کے دھارے میں بہہ جایا کرتی تھی اور فقط ایک پیاسی عورت رہ جایا کرتی تھی۔

ہر روز رات کو اس کا پرانا یا نیا ملاقاتی اس سے کہا کرتا تھا۔ ''سوگندھی' میں تجھ سے پریم کرتا ہوں۔'' اور سوگندھی یہ جان کر کہ وہ جھوٹ بولتا ہے بس موم ہو جاتی تھی اور ایسا محسوس کرتی تھی جیسے سچ مچ اس سے پریم کیا جا رہا ہے۔۔۔۔ پریم۔۔۔۔ کتنا سندر بول ہے۔ وہ چاہتی تھی' اس کو پگھلا کر اپنے سارے انگوں پر مل لے۔ اس کی مالش کرے تا کہ یہ سارے کا سارا اس کے مساموں میں رچ جائے۔۔۔۔۔ یا پھر وہ خود اس کے اندر چلی جائے۔ سمٹ سمٹا کر اس کے اندر داخل ہو جائے اور اوپر سے ڈھکنا بند کر دے۔ کبھی کبھی جب پریم کرنے اور پریم کیے جانے کا جذبہ اس کے اندر بہت شدت اختیار کر لیتا تو کئی بار اس کے جی میں آتا کہ اپنے پاس پڑے ہوئے آدمی کو گود میں لے کر تھپتھپانا شروع کر دے اور لوریاں دے کر اپنی گود ہی میں سلا دے۔

پریم کرنے کی اہلیت اس کے اندر اس قدر زیادہ تھی کہ ہر اس مرد سے جو اس کے پاس آتا تھا وہ محبت کر سکتی تھی اور پھر اس کو نباہ بھی سکتی تھی۔ اب تک چار مردوں سے اپنا پریم نباہ ہی تو رہی تھی جن کی تصویریں اس کے سامنے دیوار پر لٹک رہی تھیں۔ ہر وقت یہ احساس اس کے دل میں موجود رہتا تھا کہ وہ بہت اچھی ہے لیکن یہ اچھا پن مردوں میں کیوں نہیں ہوتا' یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔۔۔۔ ایک بار آئینہ دیکھتے ہوئے بے اختیار اس کے منہ سے نکل گیا تھا۔۔۔۔ ''سوگندھی! تجھ سے زمانے نے اچھا سلوک نہیں کیا۔''

یہ زمانہ یعنی پانچ برسوں کے دن اور ان کی راتیں اس کے جیون کے ہر تار کے ساتھ وابستہ تھا۔ گو اس زمانے سے اس کو خوشی نصیب نہیں ہوئی تھی' جس کی خواہش اس کے دل میں موجود تھی تا ہم وہ چاہتی تھی کہ یوں ہی اس کے دن بیتے چلے جائیں۔ اسے کون سے محل کھڑے کرنا تھے جو روپے پیسے کا لالچ کرتی۔ دس روپے اس کا عام نرخ تھا جس میں سے ڈھائی روپے رام لال اپنی دلالی کا کاٹ لیتا تھا۔ ساڑھے سات

روپے اسے روز مل ہی جایا کرتے تھے جو اس کی اکیلی جان کے لیے کافی تھے اور مادھو جو پونے سے بقول رام لال دلال سوگندھی پر دھاوے بولنے کے لیے آتا تھا تو وہ دس پندرہ روپیہ خراج بھی ادا کرتی تھی۔ یہ خراج صرف اس بات کا تھا کہ سوگندھی کو اس سے کچھ وہ ہو گیا تھا۔ رام لال دلال ٹھیک کہتا تھا اس میں ایسی بات ضرور تھی جو سوگندھی کو بہت بھا گئی تھی۔ اب اس کو چھپانا کیا ہے بتا ہی کیوں نہ دیں!۔۔۔سوگندھی سے جب مادھو کی پہلی ملاقات ہوئی تو اس نے کہا تھا "تجھے لاج نہیں آتی اپنا بھاؤ کرتے۔۔ جانتی ہے تو میرے ساتھ کس چیز کا سودا کر رہی ہے؟۔۔۔۔۔اور میں تیرے پاس کیوں آیا ہوں؟۔۔۔چھی چھی چھی۔۔۔۔دس روپے اور جیسا کہ تو کہتی ہے ڈھائی روپے دلالی کے' باقی رہے ساڑھے سات' رہے نا ساڑھے سات۔ ۔۔۔ ان ساڑھے سات روپوں پر تو مجھے ایسی چیز دینے کا وچن دیتی ہے جو تو دے ہی نہیں سکتی اور میں ایسی چیز لینے آیا ہوں جو میں لے ہی نہیں سکتا۔۔۔ مجھے عورت چاہیے' پر تجھے کیا اس وقت اسی گھڑی مرد چاہیے۔ مجھے تو عورت بھی بھا جائے گی۔ پر کیا میں تجھے جچتا ہوں۔۔۔ تیرا میرا ناطہ ہی کیا ہے۔ کچھ بھی نہیں۔۔۔۔ بس یہ دس روپے۔۔۔۔جن میں ڈھائی روپے دلالی میں چلے جائیں گے اور باقی ادھر ادھر بکھر جائیں گے۔ تیرے اور میرے بیچ میں بج رہے ہیں۔۔۔۔۔تو بھی ان کا بجنا سن رہی ہے اور میں بھی۔ تیرا من کچھ اور سوچتا ہے میرا من کچھ اور۔۔۔۔ کیوں نہ کوئی ایسی بات کریں کہ تجھے میری ضرورت ہو اور مجھے تیری۔ پونے میں حوالدار ہوں۔ مہینے میں ایک بار آیا کروں گا۔ تین چار دن کے لیے۔۔۔۔۔یہ دھندا چھوڑ۔۔۔۔میں تجھے خرچ دیا کروں گا۔۔۔ کیا بھاڑا ہے اس کھولی کا؟۔۔۔۔۔

مادھو نے اور بھی بہت کچھ کہا تھا۔ جس کا اثر سوگندھی پر اس قدر زیادہ ہوا تھا کہ وہ چند لمحات کے لیے خود کو حوالدارنی سمجھنے لگی تھی۔ باتیں کرنے کے بعد مادھو نے اس کے کمرے کی بکھری ہوئی چیزیں قرینے سے رکھی تھیں اور ننگی تصویریں جو سوگندھی نے اپنے سرہانے لٹکا رکھی تھیں' بنا پوچھے گچھے پھاڑ دی تھیں اور کہا تھا "۔۔۔سوگندھی بھئی میں ایسی تصویریں یہاں نہیں رکھنے دوں گا۔ اور پانی کا یہ گھڑا۔۔۔ دیکھنا کتنا میلا ہے اور یہ۔۔۔ یہ چیتھڑے۔۔۔۔ یہ چندیاں۔۔۔ اف کتنی بری باس آتی ہے۔ اٹھا کر باہر پھینک ان کو۔۔۔اور تو نے اپنے بالوں کا کیا ستیاناس کر رکھا ہے۔۔۔۔اور۔۔۔۔"

تین گھنٹے کی بات چیت کے بعد سوگندھی اور مادھو آپس میں گھل مل گئے تھے اور سوگندھی کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ برسوں سے حوالدار کو جانتی ہے۔ اس وقت تک کسی نے بھی کمرے میں بدبودار چیتھڑوں' میلے گھڑے اور ننگی تصویروں کی موجودگی کا خیال نہیں کیا تھا اور نہ کبھی کسی نے اس کو یہ محسوس کرنے کا موقع دیا تھا کہ اس کا ایک گھر ہے۔ جس میں گھریلو پن آ سکتا ہے۔ لوگ آتے تھے اور بستر تک کی غلاظت کو محسوس کیے

بغیر چلے جاتے تھے۔ کوئی سوگندھی سے یہ نہیں کہتا تھا" دیکھ تو آج تیری ناک کتنی لال ہو رہی ہے۔ کہیں زکام نہ ہو جائے۔ تجھے ۔۔۔۔۔ ٹھہر میں تیرے واسطے دوا لاتا ہوں" مادھو کتنا اچھا تھا۔ اس کی ہر بات باون تولے اور پاؤ رتی کی تھی۔ کیا کھری کھری سنائی تھیں۔ اس نے سوگندھی کو۔۔۔۔۔ اسے محسوس ہونے لگا کہ اسے مادھو کی ضرورت ہے۔ چنانچہ دونوں کا سمبندھ ہو گیا۔

مہینے میں ایک بار مادھو پونے سے آتا تھا اور واپس جاتے ہوئے ہمیشہ سوگندھی سے کہا کرتا تھا " دیکھ سوگندھی اگر تو نے پھر سے اپنا دھندا شروع کیا تو بس تیری میری ٹوٹ جائے گی۔۔۔۔۔ اگر تو نے ایک بار بھی کسی مرد کو اپنے یہاں ٹھہرایا تو چٹیا سے پکڑ کر باہر نکال دوں گا۔۔۔۔ دیکھ اس مہینے کا خرچ میں تجھے پونا پہنچتے ہی منی آرڈر کر دوں گا۔۔۔۔۔ ہاں کیا بھاڑا ہے اس کھولی کا۔۔۔۔۔"

نہ مادھو نے کبھی پونا سے خرچ بھیجا تھا اور نہ سوگندھی نے اپنا دھندا بند کیا تھا۔ دونوں اچھی طرح جانتے تھے کیا ہو رہا ہے۔ نہ سوگندھی نے کبھی مادھو سے یہ کہا تھا "تو یہ ٹر ٹر کیا کرتا ہے۔ ایک پھوٹی کوڑی بھی دی ہے کبھی تو نے؟" اور نہ مادھو نے کبھی سوگندھی سے پوچھا تھا۔ "یہ مال تیرے پاس کہاں سے آیا ہے جب کہ میں تجھے کچھ دیتا ہی نہیں۔"۔۔۔ دونوں جھوٹے تھے۔ دونوں ایک ملمع کی ہوئی زندگی بسر کر رہے تھے لیکن سوگندھی خوش تھی۔ جس کو اصل سونا پہننے کو نہ ملے وہ ملمع کیے ہوئے گہنوں پر ہی راضی ہو جایا کرتا ہے۔

اس وقت سوگندھی تھکی ماندی سو رہی تھی بجلی کا قمقمہ جسے اوف کرنا وہ بھول گئی تھی اس کے سر کے اوپر لٹک رہا تھا۔ اس کی تیز روشنی اس کی مندی ہوئی آنکھوں کے ساتھ ٹکرا رہی تھی مگر وہ گہری نیند سو رہی تھی۔

دروازے پر دستک ہوئی۔۔۔۔ رات کے دو بجے یہ کون آیا تھا؟ سوگندھی کے خواب آلود کانوں میں دستک کی آواز بھنبھناہٹ بن کر پہنچی۔ دروازہ جب زور سے کھٹکھٹایا گیا تو چونک کر اٹھ بیٹھی۔۔۔ ملی جلی شرابوں اور دانتوں کی ریخوں میں پھنسے ہوئے مچھلی کے ریزوں نے اس کے منہ کے اندر ایسا لعاب پیدا کر دیا تھا جو بے حد کسیلا اور لیسدار تھا۔ دھوتی کے پلو سے اس نے یہ بدبودار لعاب صاف کیا اور آنکھیں ملنے لگی۔ پلنگ پر وہ اکیلی تھی۔ جھک کر اس نے دیکھا تو اس کا کتا سوکھے ہوئے چپلوں پر منہ رکھے سو رہا تھا اور نیند میں کسی غیر مرئی چیز کا منہ چڑا رہا تھا اور طوطا پیٹھ کے بالوں میں سر دیئے سو رہا تھا۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ سوگندھی بستر سے اٹھی۔ سر درد کے مارے پھٹا جا رہا تھا۔ گھڑے سے پانی کا ایک ڈونگا نکال کر اس نے کلی کی اور دوسرا ڈونگا غٹاغٹ پی کر اس نے دروازے کا پٹ تھوڑا سا کھولا اور کہا۔ "رام لال؟"

رام لال جو باہر دستک دیتے دیتے تھک گیا تھا۔ بھنا کر کہنے لگا " تجھے سانپ سونگھ گیا تھا یا کیا ہو

گیا تھا۔ ایک کلارک (گھنٹے) سے باہر کھڑا دروازہ کھٹکھٹا رہا ہوں۔ کیا مر گئی تھی؟" ---- پھر آواز دبا کر اس نے ہولے سے کہا تھا۔ "اندر کوئی ہے تو نہیں؟"

جب سوگندھی نے کہا۔ "نہیں" ------ تو رام لال کی آواز پھر اونچی ہو گئی۔ "تو دروازہ کیوں نہیں کھولتی؟ ------ بھئی حد ہو گئی۔ کیا نیند پائی ہے۔ یوں ایک ایک چھوکری اتارنے میں دو دو گھنٹے سر کھپانا پڑے تو میں اپنا دھندا کر چکا ------ اب تو میرا منہ کیا دیکھتی ہے' جھٹ پٹ یہ دھوتی اتار کر وہ پھولوں والی ساڑھی پہن' پاؤڈر وؤڈر لگا اور چل میرے ساتھ --- باہر موٹر میں ایک سیٹھ بیٹھے تیرا انتظار کر رہے ہیں ------ چل چل ایک دم جلدی کر۔"

سوگندھی بھی آرام کرسی پر بیٹھ گئی اور رام لال آئینے کے سامنے اپنے بالوں میں کنگھی کرنے لگا۔

سوگندھی نے تپائی کی طرف ہاتھ بڑھایا اور بام کی شیشی اٹھا کر اس کا ڈھکنا کھولتے ہوئے کہا۔ "رام لال آج میرا جی اچھا نہیں۔"

رام لال نے کنگھی دیوار گیر پر رکھ دی اور مڑ کر کہا۔ "تو پہلے ہی کہہ دیا ہوتا۔"

سوگندھی نے ماتھے اور کنپٹیوں پر بام ملتے ہوئے رام لال کی غلط فہمی دور کر دی۔ "وہ بات نہیں رام لال ------ ایسے ہی میرا جی اچھا نہیں --- بہت پی گئی۔"

رام لال کے منہ میں پانی بھر آیا۔ "تھوڑی بچی ہو تو لا --- ذرا ہم بھی منہ کا مزا ٹھیک کر لیں۔"

سوگندھی نے بام کی شیشی تپائی پر رکھ دی اور کہا۔ "بچائی ہوتی تو یہ موا سر میں درد ہی کیوں ہوتا ------ دیکھ رام لال! وہ جو باہر موٹر میں بیٹھا ہے اسے اندر ہی لے آ۔"

رام لال نے جواب دیا۔ "نہیں بھئی وہ اندر نہیں آ سکتے۔ جنٹلمین آدمی ہیں' وہ تو موٹر کو گلی کے باہر کھڑی کرتے ہوئے بھی گھبراتے تھے ------ تو کپڑے وپڑے پہن لے اور ذرا گلی کی نکڑ تک چل ------ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

ساڑھے سات روپے کا سودا تھا۔ سوگندھی اس حالت میں جبکہ اس کے سر میں شدت کا درد ہو رہا تھا کبھی قبول نہ کرتی مگر اسے روپوں کی سخت ضرورت تھی۔ اس کے پاس والی کھولی میں ایک مدراسی عورت رہتی تھی جس کا خاوند موٹر کے نیچے آ کر مر گیا تھا۔ اس عورت کو اپنی جوان لڑکی سمیت اپنے وطن جانا تھا لیکن اس کے پاس چونکہ کرایہ ہی نہیں تھا اس لیے وہ کسمپرسی کی حالت میں پڑی تھی۔ سوگندھی نے کل ہی اس کو ڈھارس

دی تھی اور اس سے کہا تھا" بہن تو چنتا نہ کر۔ میرا مرد پونے سے آنے ہی والا ہے۔ میں اس سے کچھ روپے لے کر تیرا جانے کا بندوبست کردوں گی۔" مادھو پونا سے آنے والا تھا مگر روپوں کا بندوبست تو سوگندھی ہی کو کرنا تھا چنانچہ وہ اٹھی اور جلدی جلدی کپڑے تبدیل کرنے لگی۔ پانچ منٹوں میں اس نے دھوتی اتار کر پھولوں والی ساڑھی پہنی اور گالوں پر سرخی پوڈر لگا کر تیار ہو گئی۔ گھڑے کے ٹھنڈے پانی کا ایک ڈونگا پیا اور رام لال کے ساتھ ہولی۔

گلی جو کہ چھوٹے شہروں کے بازار سے بھی کچھ بڑی تھی بالکل خاموش تھی۔ گیس کے وہ لیمپ جو کھمبوں پر جڑے تھے پہلے کی نسبت بہت دھندلی روشنی دے رہے تھے۔ جنگ کے باعث ان کے شیشوں کو گدلا کر دیا گیا تھا۔ اس اندھی روشنی میں گلی کے آخری سرے پر ایک موٹر نظر آرہی تھی۔

کمزور روشنی میں اس سیاہ رنگ کی موٹر کا سایہ سا نظر آیا اور رات کے پچھلے پہر کی بھیدوں بھری خاموشی۔۔۔ سوگندھی کو ایسا لگا کہ اس کے سر کا درد فضا پر بھی چھا گیا ہے۔ ایک کسیلا پن اسے ہوا کے اندر بھی محسوس ہوتا تھا۔ جیسے برانڈی اور بیوڑا کی باس سے وہ بھی بوجھل ہو رہی ہے۔

آگے بڑھ کر رام لال نے موٹر کے اندر بیٹھے ہوئے آدمیوں سے کچھ کہا۔ اتنے میں جب سوگندھی موٹر کے پاس پہنچ گئی تو رام لال نے ایک طرف ہٹ کر کہا۔" لیجیے وہ آ گئی ۔۔۔۔۔۔ بڑی اچھی چھوکری ہے۔ تھوڑے ہی دن ہوئے ہیں اسے دھندا شروع کئے۔" پھر سوگندھی سے مخاطب ہو کر کہا۔ سوگندھی ادھر آ سیٹھ جی بلاتے ہیں۔"

سوگندھی ساڑھی کا ایک کنارہ اپنی انگلی پر لپیٹتی ہوئی آگے بڑھی اور موٹر کے دروازے کے پاس کھڑی ہو گئی۔ سیٹھ نے بیٹری اس کے چہرے کے پاس روشن کی۔ ایک لمحے کے لیے اس روشنی نے سوگندھی کی خمار آلود آنکھوں میں چکا چوند پیدا کی۔ بٹن دبانے کی آواز پیدا ہوئی اور روشنی بجھ گئی۔ ساتھ ہی سیٹھ کے منہ سے "اونہہ" نکلا پھر ایک دم موٹر کا انجن پھڑ پھڑایا اور کار یہ جا وہ جا ۔۔۔۔۔۔۔۔

سوگندھی کچھ سوچنے بھی نہ پائی تھی کہ موٹر چل دی۔ اس کی آنکھوں میں ابھی تک بیٹری کی تیز روشنی گھسی ہوئی تھی۔ وہ ٹھیک طرح سے سیٹھ کا چہرہ بھی تو نہ دیکھ سکی تھی۔ یہ آخر ہوا کیا تھا اس "اونہہ" کا کیا مطلب تھا جو ابھی تک اس کے کانوں میں بھنبھنا رہی تھی۔ کیا؟ ۔۔۔ کیا؟

رام لال دلال کی آواز سنائی دی۔" پسند نہیں کیا تجھے؟ ۔۔۔ اچھا بھئی میں چلتا ہوں۔ دو گھنٹے مفت ہی میں برباد کر دیئے۔"

یہ سن کر سوگندھی کی ٹانگوں میں اس کی بانہوں میں اس کے ہاتھوں میں ایک زبردست حرکت پیدا

ہوئی۔ کہاں ہے وہ موٹر۔۔۔ کہاں ہے وہ سیٹھ۔۔۔ تو "اونہہ" کا مطلب یہ تھا کہ اس نے مجھے پسند نہیں کیا۔۔۔ اس کی۔۔۔۔۔۔

گالی اس کے پیٹ کے اندر سے اٹھی اور زبان کی نوک پر آ کر رک گئی۔ وہ آخر گالی کسے دیتی۔ موٹر تو جا چکی تھی۔ اس کی دم کی سرخ بتی اس کے سامنے بازار کے اندھیارے میں ڈوب رہی تھی اور سوگندھی کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ لال لال انگارہ "اونہہ" ہے جو اس کے سینے میں برمے کی طرح اترا چلا جا رہا تھا۔ اس کے جی میں آئی کہ زور سے پکارے۔ "او سیٹھ۔۔۔ او سیٹھ۔ ذرا موٹر روکنا اپنی۔۔۔۔۔ میں ایک منٹ کے لیے۔" پر وہ سیٹھ تھوڑی ہے اس کی ذات پر بہت دور نکل چکا تھا۔

وہ سنسان بازار میں کھڑی تھی۔ پھولوں والی ساڑھی جو وہ خاص خاص موقعوں پر پہنا کرتی تھی، رات کے پچھلے پہر کی ہلکی پھلکی ہوا سے لہرا رہی تھی۔

یہ ساڑھی اور اس کی ریشمی سرسراہٹ سوگندھی کو کتنی بری معلوم ہوتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ اس ساڑھی کے چیتھڑے اڑا دے کیونکہ ساڑھی ہوا میں لہرا لہرا کر "اونہہ اونہہ" کر رہی تھی۔

گالوں پر اس نے پوڈر لگایا تھا اور ہونٹوں پر سرخی۔ جب خیال آیا کہ یہ سنگار اس نے اپنے آپ کو پسند کرانے کے واسطے کیا تھا تو شرم کے مارے اسے پسینہ آ گیا۔ یہ شرمندگی دور کرنے کے لیے اس نے کیا کچھ نہ سوچا۔۔۔۔ "میں نے اس موئے کو دکھانے کے لیے تھوڑی اپنے آپ کو سجایا تھا۔ یہ تو میری عادت ہے۔۔۔ میری کیا سب کی یہی عادت ہے۔۔۔ پر۔۔۔۔ پر۔۔۔۔ یہ رات کے دو بجے اور رام لال دلال اور۔۔۔۔۔ یہ بازار۔۔۔ اور وہ موٹر اور بیٹری کی چمک۔" یہ سوچتے ہی روشنی کے دھبے اس کی حد نگاہ تک فضا میں ادھر ادھر تیرنے لگے اور موٹر کے انجن کی پھڑ پھڑاہٹ اسے ہوا کے ہر جھونکے میں سنائی دینے لگی۔

اس کے ماتھے پر بام کا لیپ جو سنگار کرنے کے دوران میں بالکل ہلکا ہو گیا تھا۔ پسینہ آنے کے باعث اس کے مساموں میں داخل ہونے لگا اور سوگندھی کو اپنا ماتھا کسی اور کا ماتھا معلوم ہوا۔ جب ہوا کا ایک جھونکا اس کے عرق آلود ماتھے کے پاس سے گزرا تو اسے ایسا لگا کہ سرد ٹین کا ٹکڑا کاٹ کر اس کے ماتھے کے ساتھ چسپاں کر دیا گیا ہے۔ سر میں درد ویسے کا ویسا موجود تھا مگر خیالات کی بھیڑ بھاڑ اور اس کے شور نے اس درد کو اپنے نیچے دبا کر رکھا تھا۔ سوگندھی نے کئی بار اس درد کو اپنے خیالات کے نیچے سے نکال کر اوپر لانا چاہا مگر ناکام رہی۔ وہ چاہتی تھی کہ کسی نہ کسی طرح اس کا انگ انگ دکھنے لگے۔ اس کے سر میں درد ہو اس کی ٹانگوں میں درد ہو۔ اس کے پیٹ میں درد ہو اس کی بانہوں میں درد ہو۔۔۔ ایسا درد کہ وہ صرف درد ہی کا خیال

کرے اور سب کچھ بھول جائے۔ یہ سوچتے سوچتے اس کے دل میں کچھ ہوا۔۔ کیا یہ درد تھا؟۔۔۔ایک لمحے کے لیے اس کا دل سکڑا اور پھر پھیل گیا۔۔۔ یہ کیا تھا؟۔۔۔لعنت! یہ تو وہی ''اونہہ'' تھی جو اس کے دل کے اندر کبھی سکڑتی اور کبھی پھیلتی تھی۔

گھر کی طرف سوگندھی کے قدم اٹھے ہی تھے کہ رک گئے اور وہ ٹھہر کر سوچنے لگی۔ رام لال دلال کا خیال ہے کہ اسے میری شکل پسند نہیں آئی۔۔۔۔۔ شکل کا تو اس نے ذکر نہیں کیا۔ اس نے تو یہ کہا تھا۔ ''سوگندھی تجھے پسند نہیں کیا!'' اسے۔۔۔ اسے۔۔۔صرف میری شکل ہی پسند نہیں آئی۔۔۔نہیں آئی تو کیا ہوا؟۔۔۔۔ مجھے بھی تو کئی آدمیوں کی شکل ہی پسند نہیں آتی۔۔۔۔۔وہ جو اماوس کی رات کو آیا تھا کتنی بری صورت تھی اس کی۔ کیا میں نے ناک بھوں نہیں چڑھائی تھی؟ جب وہ میرے ساتھ سونے لگا تھا مجھے گھن نہیں آئی تھی؟ کیا مجھے ابکائی آتے آتے نہیں رک گئی تھی؟۔۔۔۔ ٹھیک ہے۔ پر سوگندھی۔۔۔ تو نے اسے دھتکارا نہیں تھا۔ تو نے اسے ٹھکرایا نہیں تھا۔۔۔ اس موٹر والے سیٹھ نے تو تیرے منہ پر تھوکا ہے۔۔۔ اونہہ۔۔۔ اس ''اونہہ'' کا اور مطلب ہی کیا ہے؟۔۔۔ یہی کہ اس چھچھوندر کے سر میں چنبیلی کا تیل۔۔۔۔ اور۔۔۔ یہ منہ اور مسور کی دال۔۔۔ ارے رام لال تو یہ چھپکلی کہاں سے پکڑ کر لے آیا ہے۔۔۔ اس لونڈیا کی اتنی تعریف کر رہا ہے تو۔۔۔ دس روپے اور یہ عورت۔۔۔۔ خچر کیا بری ہے۔۔۔۔

سوگندھی سوچ رہی تھی اور اس کے پیر کے انگوٹھے سے لے کر چوٹی تک گرم لہریں دوڑ رہی تھیں۔ اس کو کبھی اپنے آپ پر غصہ آتا تھا اور کبھی رام لال پر جس نے رات کے دو بجے اسے بے آرام کیا۔ لیکن فوراً ہی دونوں کو بے قصور پا کر وہ سیٹھ کا خیال کرتی تھی اس خیال کے آتے ہی اس کی آنکھیں اس کے کان اس کی باہیں اس کی ٹانگیں اس کا سب کچھ مڑتا تھا کہ سیٹھ کو کہیں دیکھ پائے۔۔۔۔ اس کے اندر یہ خواہش بڑی شدت سے پیدا ہو رہی تھی کہ جو کچھ ہو چکا ہے ایک بار پھر ہو۔۔۔ صرف ایک بار۔۔۔۔ وہ ہولے ہولے موٹر کی طرف بڑھے۔۔۔ موٹر کے اندر سے ایک ہاتھ بیٹری نکالے اور اس کے چہرے پر روشنی پھینکے۔ ''اونہہ'' کی آواز آئے اور وہ۔۔۔ سوگندھی۔۔۔ اندھا دھند اپنے دونوں پنجوں سے اس کا منہ نوچنا شروع کر دے۔ وحشی بلی کی طرح جھپٹے اور۔۔۔ اپنی انگلیوں کے سارے ناخن جو اس نے موجودہ فیشن کے مطابق بڑھا رکھے تھے اس سیٹھ کے گالوں میں گاڑ دے۔۔۔ بالوں سے پکڑ کر اسے باہر گھسیٹ لے اور دھڑا دھڑ مکے مارنا شروع کر دے اور جب تھک جائے۔۔۔ جب تھک جائے تو رونا شروع کر دے۔

رونے کا خیال سوگندھی کو صرف اس لیے آیا تھا کہ اس کی آنکھوں میں غصے اور بے بسی کی شدت کے باعث تین چار بڑے آنسو بن رہے تھے۔ ایکا ایکی سوگندھی نے اپنی آنکھوں سے سوال کیا۔ ''تم روتی

کیوں ہو؟ تمہیں کیا ہوا ہے کہ چھکنے لگی ہو؟"۔۔۔۔۔۔ آنکھوں سے کیا ہوا سوال چند لمحات تک ان آنسوؤں میں تیرتا رہا جواب پلکوں پر کانپ رہے تھے۔ سوگندھی ان آنسوؤں میں سے دیر تک اس خلاء کو گھورتی رہی جدھر سیٹھ کی موٹر گئی تھی۔

پھڑ پھڑ پھڑ۔۔۔۔۔۔ یہ آواز کہاں سے آئی؟۔۔۔۔۔ سوگندھی نے چونک کر اِدھر اُدھر دیکھا لیکن کسی کو نہ پایا۔۔۔۔۔۔ ارے! یہ تو اس کا دل پھڑ پھڑایا تھا۔ وہ سمجھی تھی موٹر کا انجن بولا ہے۔۔۔۔۔۔ اس کا دل۔۔۔۔۔۔ یہ کیا ہو گیا تھا اس کے دل کو۔۔۔۔۔۔ آج ہی یہ روگ لگ گیا تھا اسے۔۔۔۔۔۔ اچھا بھلا چلتا چلتا ایک جگہ رک کر دھڑ دھڑ کیوں کرتا تھا۔۔۔۔۔۔ بالکل اس گھسے ہوئے ریکارڈ کی طرح جو سوئی کے نیچے ایک جگہ رک جاتا تھا۔ "رات کٹی گن گن تارے۔" کہتا کہتا تارے تارے کی رٹ لگا دیتا تھا۔

آسمان تاروں سے اٹا ہوا تھا۔ سوگندھی نے ان کی طرف دیکھا اور کہا "کتنے سندر ہیں"۔۔۔۔۔۔ وہ چاہتی تھی کہ اپنا دھیان کسی اور طرف پلٹ دے پر جب اس نے سندر کہا تو جھٹ سے یہ خیال اس کے دماغ میں کودا۔ "یہ تارے سندر ہیں پر تو کتنی بھونڈی ہے۔ کیا بھول گئی کہ ابھی تیری صورت کو پھٹکارا گیا ہے؟"

سوگندھی بدصورت تو نہیں تھی۔ یہ خیال آتے ہی وہ تمام عکس ایک ایک کر کے اس کی آنکھوں کے سامنے آنے لگے جو ان پانچ برسوں کے دوران میں وہ آئینے میں دیکھ چکی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کا رنگ وروپ اب وہ نہیں رہا تھا جو آج سے پانچ سال پہلے تھا۔ جبکہ وہ تمام فکروں سے آزاد اپنے ماں باپ کے ساتھ رہا کرتی تھی لیکن وہ بدصورت تو نہیں ہو گئی تھی۔ اس کی شکل وصورت ان عام عورتوں کی سی تھی جن کی طرف مرد گزرتے گزرتے گھور کر دیکھ لیا کرتے تھے۔ اس میں وہ تمام خوبیاں موجود تھیں جو سوگندھی کے خیال میں ہر مرد اس عورت میں ضروری سمجھتا ہے جس کے ساتھ اسے ایک دو راتیں بسر کرنا ہوتی ہیں۔ وہ جوان تھی۔ اس کے اعضاء متناسب تھے کبھی کبھی نہاتے وقت جب اس کی نگاہیں اپنی رانوں پر پڑتی تھیں تو وہ خود ان کی گولائی اور گدراہٹ کو پسند کیا کرتی تھی۔ وہ خوش خلق تھی۔ ان پانچ برسوں کے دوران میں شاید ہی کوئی آدمی اس سے ناخوش ہو کر گیا ہو۔۔۔۔۔۔ بڑی ملنسار تھی، بڑی رحم دل تھی۔ پچھلے دنوں کرسمس میں جب وہ گول پیٹھا میں رہا کرتی تھی۔ ایک نوجوان لڑکا اس کے پاس آیا تھا۔ صبح اٹھ کر جب اس نے دوسرے کمرے میں جا کر کھونٹی سے اپنا کوٹ اتارا تو بٹوہ غائب پایا۔ سوگندھی کا نوکر یہ بٹوا لے اڑا تھا۔ بے چارہ بہت پریشان ہوا چھٹیاں گزارنے کے بعد حیدرآباد سے بمبئی آیا تھا۔ اب اس کے پاس واپس جانے کے لیے دام نہ تھے۔ سوگندھی نے ترس کھا کر اسے اس کے دس روپے واپس دے دیئے تھے۔۔۔۔۔۔

''مجھ میں کیا برائی ہے؟'' سوگندھی نے یہ سوال ہر اس چیز سے کیا تھا جو اس کی آنکھوں کے سامنے تھی۔ گیس کے اندھے لیمپ' لوہے کے کھمبے' فٹ پاتھ کے چوکور پتھر' اور سڑک کی اکھڑی ہوئی بجری ۔۔۔ ان سب چیزوں کی طرف اسے نے باری باری دیکھا پھر آسمان کی طرف نگاہیں اٹھائیں جو اس کے اوپر جھکا ہوا تھا مگر سوگندھی کو کوئی جواب نہ ملا۔ جواب اس کے اندر موجود تھا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ بری نہیں اچھی ہے۔ پر وہ چاہتی تھی کہ کوئی اس کی تائید کرے۔۔۔

کوئی۔۔۔۔۔ کوئی۔۔۔ اس وقت کوئی اس کے کاندھوں پر ہاتھ رکھ کر صرف اتنا کہہ دے۔

''سوگندھی! کون کہتا ہے تو بری ہے' جو تجھے برا کہے وہ آپ برا ہے'' ۔۔۔۔۔ نہیں یہ کہنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔ کسی کا اتنا کہہ دینا کافی تھا' ''سوگندھی! تو بہت اچھی ہے!''

وہ سوچنے لگی کہ وہ کیوں چاہتی ہے کہ کوئی اس کی تعریف کرے۔ اس سے پہلے اسے اس بات کی اتنی شدت سے ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ آج کیوں وہ بے جان چیزوں کو بھی ایسی نظروں سے دیکھتی ہے جیسے ان پر اپنے اچھے ہونے کا احساس طاری کرنا چاہتی ہے۔ اس کے جسم کا ذرہ ذرہ کیوں ماں بن رہا تھا۔۔۔۔۔ وہ ماں بن کر دھرتی کی ہر شے کو اپنی گود میں لینے کے لیے کیوں تیار ہو رہی تھی؟۔۔۔۔ اس کا جی کیوں چاہتا تھا کہ سامنے والے گیس کے آہنی کھمبے کے ساتھ چمٹ جائے اور اس کے سرد لوہے پر اپنے گال رکھ دے۔۔۔ اپنے گرم گرم گال اور اس کی ساری سردی چوس لے۔

تھوڑی دیر کے لیے اسے ایسا محسوس ہوا کہ گیس کے اندھے لیمپ' لوہے کے کھمبے' فٹ پاتھ کے چوکور پتھر اور ہر وہ شے جو رات کے سناٹے میں اس کے آس پاس تھی ہمدردی کی نظروں سے اسے دیکھ رہی ہے اور اس کے اوپر جھکا ہوا آسمان بھی جو مٹیالے رنگ کی ایسی موٹی چادر معلوم ہوتا تھا جس میں بے شمار سوراخ ہو رہے ہوں۔ اس کی باتیں سمجھتا تھا اور سوگندھی کو بھی ایسا لگتا تھا کہ وہ تاروں کا ٹمٹمانا سمجھتی ہے۔۔۔ لیکن اس کے اندر یہ کیا گڑبڑ تھی؟۔۔۔۔۔ وہ کیوں اپنے اندر اس موسم کی فضا محسوس کرتی تھی جو بارش سے پہلے دیکھنے میں آیا کرتا ہے۔۔۔۔۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ اس کے جسم کا ہر مسام کھل جائے اور جو کچھ اس کے اندر ابل رہا ہے ان کے رستے باہر نکل جائے۔ پر یہ کیسے ہو؟۔۔۔۔۔

سوگندھی گلی کی نکڑ پر خط ڈالنے والے لال بھبکے کے پاس کھڑی تھی۔۔۔۔۔ ہوا کے تیز جھونکے سے اس بھبکے کی آہنی زبان جو اس کے کھلے ہوئے منہ میں لٹکتی رہتی ہے' لڑکھڑائی ہوئی سوگندھی کی نگاہیں یک بیک اس طرف اٹھیں جدھر موٹر گئی تھی' مگر اسے کچھ نظر نہ آیا۔ اسے کتنی زبردست آرزو تھی کہ وہ موٹر پھر ایک بار آئے اور ۔۔۔۔۔ اور ۔۔۔۔۔

"نہ آئے ---- بلا سے ---- میں جان کیوں بیکار ہلکان کروں ---- گھر چلتے ہیں اور آرام سے لمبی تان کر سوتے ہیں۔ ان جھگڑوں میں رکھا ہی کیا ہے۔ مفت کی دردسری ہی تو ہے۔ چل سوگندھی گھر چل ---- ٹھنڈے پانی کا ایک ڈونگا پی اور تھوڑا سا بام مل کر سو جا ---- فرسٹ کلاس نیند آئے گی اور سب ٹھیک ہو جائے گا ---- سیٹھ اور اس کی موٹر کی ایسی کی تیسی۔"

یہ سوچتے ہوئے سوگندھی کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔ جیسے وہ کسی ٹھنڈے تالاب سے نہا دھو کر باہر نکلی ہے جس طرح پوجا کرنے کے بعد اس کا جسم ہلکا ہو جاتا تھا اسی طرح اب بھی ہلکا ہو گیا تھا۔ گھر کی طرف چلنے لگی تو خیالات کا بوجھ نہ ہونے کے باعث اس کے قدم کئی بار لڑکھڑائے۔

اپنے مکان کے پاس پہنچی تو ایک ٹیس کے ساتھ پھر تمام واقعہ اس کے دل میں اٹھا اور درد کی طرح اس کے روئیں روئیں پر چھا گیا ---- قدم پھر بوجھل ہو گئے اور وہ اس بات کو شدت کے ساتھ محسوس کرنے لگی کہ گھر سے بلا کر باہر بازار میں منہ پر روشنی کا چانٹا مار کر ایک آدمی نے ابھی ابھی اس کی ہتک کی ہے۔ یہ خیال آیا تو اس نے اپنی پسلیوں پر کسی کے سخت انگوٹھے محسوس کیے جیسے کوئی اسے بھیڑ بکری کی طرح دبا دبا کر دیکھ رہا ہے کہ آیا گوشت بھی ہے یا بال ہی بال ہیں ---- اس سیٹھ نے ---- پرماتما کرے ----

سوگندھی نے چاہا کہ اس کو بددعا دے مگر سوچا بددعا دینے سے کیا بنے گا۔ مزا تو جب تھا کہ وہ سامنے ہوتا اور وہ اس کے وجود کے ہر ذرے پر اپنی لعنتیں لکھ دیتی ---- اس کے منہ پر کچھ ایسے الفاظ کہتی کہ زندگی بھر چین نہ لیتا ---- کپڑے پھاڑ کر اس کے سامنے ننگی ہو جاتی اور کہتی "یہی لینے آیا تھا نہ تو؟ ---- لے دام دیئے بنا لے جا اسے ---- پر جو کچھ میں ہوں جو کچھ میرے اندر چھپا ہوا ہے۔ وہ تو 'تو کیا' تیرا باپ بھی نہیں خرید سکتا ----"

انتقام کے نئے نئے طریقے سوگندھی کے ذہن میں آ رہے تھے۔ اگر اس سیٹھ سے ایک بار ---- صرف ایک بار ---- اس کی مڈبھیڑ ہو جائے تو وہ یہ کرے ---- نہیں ---- یہ نہیں یہ کرے ---- یوں اس سے انتقام لے ---- نہیں یوں نہیں یوں ---- لیکن جب سوگندھی سوچتی کہ سیٹھ سے اس کا دوبارہ ملنا محال ہے تو وہ اسے ایک چھوٹی سی گالی دینے ہی پر خود کو راضی کر لیتی ---- بس صرف ایک چھوٹی سی گالی جو اس کی ناک پر چپکو مکھی کی طرح بیٹھ جائے اور ہمیشہ وہیں جمی رہے۔

اسی ادھیڑ بن میں وہ دوسری منزل میں اپنی کھولی کے پاس پہنچ گئی۔

چولی میں سے چابی نکال کر تالا کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو چابی ہوا ہی میں گھوم کر رہ گئی۔

کنڈے میں تالا نہیں تھا۔ سوگندھی نے کواڑ اندر کی طرف دبائے تو ہلکی سی چرچراہٹ پیدا ہوئی۔ اندر سے کسی

نے کنڈی کھولی اور دروازے نے جمائی لی۔ سوگندھی اندر داخل ہوگئی۔

مادھو مونچھوں میں ہنسا اور دروازہ بند کر کے سوگندھی سے کہنے لگا۔ "آج تو نے میرا کہا مان ہی لیا۔۔۔ صبح کی سیر تندرستی کے لیے بڑی اچھی ہوتی ہے۔ ہر روز صبح اٹھ کر اس طرح گھومنے جایا کرے گی تو تیری ساری سستی دور ہو جائے گی اور وہ تیری کمر کا درد بھی غائب ہو جائے گا جس کی بابت تو آئے دن شکایت کیا کرتی ہے۔۔۔ وکٹوریہ گارڈن تک تو ہو آئی ہوگی تو؟۔۔۔ کیوں؟"

سوگندھی نے کوئی جواب نہ دیا اور نہ مادھو نے جواب کی خواہش ظاہر کی۔ دراصل جب مادھو بات کرتا تھا تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوا کرتا تھا کہ سوگندھی ضرور اس میں حصہ لے اور سوگندھی جب کوئی بات کیا کرتی تھی تو یہ ضروری نہیں ہوتا تھا کہ مادھو اس میں حصہ لے۔ چونکہ کوئی بات کرنا ہوتی تھی اس لیے وہ کچھ کہہ دیا کرتے تھے۔

مادھو بید کی کرسی پر بیٹھ گیا جس کی پشت پر اس کے تیل سے چپڑے ہوئے سر نے میل کا بہت بڑا دھبہ بنا رکھا تھا اور ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر اپنی مونچھوں پر انگلیاں پھیرنے لگا۔

سوگندھی پلنگ پر بیٹھ گئی اور مادھو سے کہنے لگی۔ "میں آج تیرا انتظار کر رہی تھی۔"

مادھو بڑا اسٹپٹایا۔ "انتظار؟۔۔۔ تجھے کیسے معلوم ہوا کہ میں آج آنے والا ہوں۔"

سوگندھی کے بھینچے ہوئے لب کھلے۔ ان پر ایک پیلی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ "میں نے رات تجھے سپنے میں دیکھا تھا۔۔۔ اٹھی تو کوئی نہ تھا۔ سو جی نے کہا چلو کہیں باہر گھوم آئیں۔ اور۔۔۔"

مادھو خوش ہو کر بولا۔۔۔ "اور میں آ گیا۔۔۔ بھئی بڑے لوگوں کی باتیں بڑی پکی ہوتی ہیں۔ کسی نے ٹھیک کہا ہے۔ دل کو دل سے راہ ہے۔۔۔ تو نے یہ سپنا کب دیکھا تھا؟"

سوگندھی نے جواب دیا۔ "چار بجے کے قریب۔"

مادھو کرسی سے اٹھ کر سوگندھی کے پاس بیٹھ گیا۔ "اور میں نے ٹھیک دو بجے سپنے میں دیکھا۔۔۔ جیسے تو پھولوں والی ساڑھی۔۔۔ ارے بالکل یہی ساڑھی پہنے میرے پاس کھڑی ہے۔ تیرے ہاتھوں میں۔۔۔ کیا تھا۔ تیرے ہاتھوں میں!۔۔۔ ہاں تیرے ہاتھوں میں روپوں سے بھری ہوئی تھیلی تھی۔ تو نے یہ تھیلی میری جھولی میں رکھ دی اور کہا۔ "مادھو! تو چنتا کیوں کرتا ہے۔۔۔ لے یہ تھیلی ارے تیرے میرے روپے کیا دو ہیں؟۔۔۔"

سوگندھی تیری جان کی قسم فوراً اٹھا اور ٹکٹ کٹا کر ادھر کا رخ کیا۔۔۔ کیا سناؤں بڑی پریشانی ہے!۔۔۔ بیٹھے بٹھائے ایک کیس ہو گیا ہے۔ اب بیس تیس روپے ہوں تو۔۔۔ انسپکٹر کی مٹھی گرم کر کے

چھٹکارا ملے۔۔۔۔تھک تو نہیں گئی تو؟ لیٹ جا میں تیرے پیر دبا دوں۔ میری عادت نہ ہو تو تھکن ہوہی جایا کرتی ہے۔۔۔۔ادھر میری طرف پیر کر کے لیٹ جا۔"

سوگندھی لیٹ گئی۔ دونوں باہوں کا تکیہ بنا کر وہ ان پر سر رکھ کر لیٹ ہو گئی اور اس لہجے میں جو اس کا اپنا نہیں تھا۔ مادھو سے کہنے لگی۔" مادھو یہ کس موئے نے تجھ پر کیس کیا ہے؟۔۔۔۔جیل ویل کا ڈر ہو تو مجھ سے کہہ دے۔۔۔۔بیس تیس کیا سو پچاس بھی ایسے موقعوں پر پولیس کے ہاتھ تھما دیئے جائیں تو فائدہ اپنا ہی ہے۔۔۔ جان بچی لاکھوں پائے۔۔۔ بس بس اب جانے دے۔۔۔۔ تھکن کچھ زیادہ نہیں ہے۔۔۔ مٹھی چاپی چھوڑ اور مجھے ساری بات سنا۔۔۔ کیس کا نام سنتے ہی میرا دل دھک دھک کرنے لگا ہے۔۔۔ واپس کب جائے گا تو؟"

مادھو کو سوگندھی کے منہ سے شراب کی باس آئی۔ اس نے یہ موقع اچھا سمجھا اور جھٹ سے کہا۔ " دوپہر کی گاڑی سے واپس جانا پڑے گا۔۔۔۔ اگر شام تک سب انسپکٹر کو سو پچاس نہ تھمائے تو۔۔۔۔ زیادہ دینے کی ضرورت نہیں۔ میں سمجھتا ہوں پچاس میں کام چل جائے گا۔"

"پچاس!" یہ کہہ کر سوگندھی بڑے آرام سے اٹھی اور ان چار تصویروں کے پاس آہستہ آہستہ گئی جو دیوار پر لٹک رہی تھیں۔ بائیں طرف سے تیسرے فریم میں مادھو کی تصویر تھی۔ بڑے بڑے پھولوں والے پردے کے آگے کرسی پر وہ دونوں رانوں پر اپنے ہاتھ رکھے بیٹھا تھا۔ ایک ہاتھ میں گلاب کا پھول تھا۔ پاس ہی تپائی پر دو موٹی موٹی کتابیں دھری تھیں۔ تصویر اتروانے وقت تصویر اتروانے کا خیال مادھو پر اس قدر غالب تھا کہ اس کی ہر شے تصویر سے باہر نکل کر گویا پکار رہی تھی۔" ہمارا فوٹو اترے گا! ہمارا فوٹو اترے گا۔"

کیمرے کی طرف مادھو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فوٹو اترواتے وقت اسے بہت تکلیف ہو رہی تھی۔

سوگندھی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔۔۔۔ اس کی ہنسی کچھ ایسی تیکھی اور نوکیلی تھی کہ مادھو کے سوئیاں سی چبھیں۔ پلنگ پر سے اٹھ کر وہ سوگندھی کے پاس گیا۔" کس کی تصویر دیکھ کر تو اس قدر زور سے ہنسی؟"

سوگندھی نے بائیں ہاتھ کی پہلی تصویر کی طرف اشارہ کیا جو میونسپلٹی کے داروغہ صفائی کی تھی۔ "اس کی۔۔۔۔ منشی پالٹی کے اس داروغہ کی۔۔۔۔ ذرا دیکھو تو اس کا تھوبڑا۔۔۔۔ کہتا تھا ایک رانی مجھ پر عاشق ہو گئی تھی۔۔۔۔" ہونہہ! یہ منہ اور مسور کی دال۔" یہ کہہ کر سوگندھی نے فریم کو اس زور سے کھینچا کہ دیوار میں سے کیل بھی پلستر سمیت اکھڑ آئی۔

مادھو کی حیرت ابھی دور نہ ہوئی تھی کہ سوگندھی نے فریم کو کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ دو منزلوں

سے یہ فریم نیچے زمین پر گرا اور کانچ ٹوٹنے کی جھنکار سنائی دی۔ ”رانی جھنگن کچرا اٹھانے آئے گی تو میرے اس راجہ کو بھی لے جائے گی۔“

ایک بار پھر اسی نوکیلی اور تیکھی ہنسی کی پھوار سوگندھی کے ہونٹوں سے گرنا شروع ہوئی جیسے وہ ان پر چاقو یا چھری کی دھار تیز کر رہی ہے۔ مادھو بڑی مشکل سے مسکرایا۔ پھر ہنسا۔ ”ہی ہی ہی۔۔۔۔۔“

ایک ہاتھ سے سوگندھی نے پگڑی والے کی تصویر اتاری اور دوسرا ہاتھ اس فریم کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ایک سیکنڈ میں فریم کیل سمیت سوگندھی کے ہاتھ میں تھا۔

زور کا قہقہہ لگا کر اس نے ”ہونہہ“ کی اور دونوں فریم ایک ساتھ کھڑکی میں سے باہر پھینک دیئے۔ دو منزلوں سے جب فریم زمین پر گرے اور کانچ ٹوٹنے کی آواز آئی تو مادھو کو ایسا معلوم ہوا کہ اس کے اندر کوئی چیز ٹوٹ گئی ہے۔ بڑی مشکل سے اس نے ہنس کر اتنا کہا۔۔۔۔ ”مجھے بھی یہ فوٹو پسند نہیں تھا۔“

آہستہ آہستہ سوگندھی مادھو کے پاس آئی اور کہنے لگی۔ ”تجھے یہ فوٹو پسند نہیں تھا۔۔۔۔ پر میں پوچھتی ہوں تجھ میں ہے کون سی ایسی چیز جو کسی کو پسند آ سکتی ہے۔۔۔۔۔ یہ تیری پکوڑا ایسی ناک' یہ تیرا بالوں بھرا ماتھا' یہ تیرے سوجے ہوئے نتھنے' یہ تیرے مڑے ہوئے کان' یہ تیرے منہ کی باس' یہ تیرے بدن کا میل؟۔۔۔ تجھے اپنا فوٹو پسند نہیں تھا ہونہہ۔۔۔۔ پسند کیوں ہوتا' تیرے عیب جو چھپائے رکھے تھے اس نے۔۔۔ آج کل زمانہ ہی ایسا ہے جو عیب چھپائے وہی برا۔۔۔۔“

مادھو پیچھے ہٹتا گیا۔ آخر جب وہ دیوار کے ساتھ لگ گیا تو اس نے اپنی آواز میں زور پیدا کر کے کہا۔ ”دیکھ سوگندھی مجھے ایسا دکھائی دیتا ہے کہ تو نے پھر سے اپنا دھندا شروع کیا ہے۔۔۔۔ اب تجھ سے آخری بار کہتا ہوں۔۔۔۔“

سوگندھی نے اس سے آگے مادھو کے لہجے میں کہنا شروع کیا۔ ”اگر تو نے پھر سے اپنا دھندا شروع کیا تو بس تیری میری ٹوٹ جائے گی۔ اگر تو نے پھر کسی کو اپنے یہاں ٹھہرایا تو چٹیا سے پکڑ کر تجھے باہر نکال دوں گا۔ اس مہینے کا خرچ میں تجھے پونا پہنچتے ہی منی آرڈر کر دوں گا۔ ہاں کیا بھاڑا ہے اس کھولی کا؟“

سوگندھی نے کہنا شروع کیا۔ ”میں بتاتی ہوں۔۔۔۔ پندرہ روپیہ بھاڑا ہے اس کھولی کا۔۔۔۔۔ اور دس روپے بھاڑا ہے میرا۔۔۔۔ اور جیسا تجھے معلوم ہے ڈھائی روپے دلال کے۔ باقی رہے ساڑھے سات' رہے نہ ساڑھے سات! ان ساڑھے سات روپوں میں میں نے ایسی چیز دینے کا وچن دیا تھا جو میں دے ہی نہیں سکتی تھی اور تو ایسی چیز لینے آیا تھا جو تو لے ہی نہیں سکتا تھا۔۔۔۔ تیرا میرا ناطہ ہی کیا تھا۔ کچھ بھی نہیں۔ بس یہ دس روپے تیرے اور میرے بیچ میں بج رہے تھے۔ سو ہم دونوں نے مل کر ایسی بات کی کہ تجھے میری

ضرورت ہوئی اور مجھے تیری۔۔۔۔۔ پہلے میرے اور تیرے بیچ میں دس روپے بجتے تھے۔ آج پچاس بج رہے ہیں۔ تو بھی ان کا بجنا سن رہا ہے اور میں بھی ان کا بجنا سن رہی ہوں۔۔۔۔۔ یہ تو نے اپنے بالوں کا کیا ستیاناس مار رکھا ہے؟"

یہ کہہ کر سوگندھی نے مادھو کی ٹوپی انگلی سے ایک طرف اڑا دی یہ حرکت مادھو کو بہت ناگوار گزری۔

اس نے بڑے کڑے لہجے میں کہا۔ "سوگندھی!"

سوگندھی نے مادھو کی جیب سے رومال نکال کر سونگھا اور زمین پر پھینک دیا۔ "یہ چیتھڑے یہ چندیاں۔۔۔ اف کتنی بری باس آتی ہے اٹھا کر باہر پھینکو ان کو۔۔۔۔"

مادھو چلایا۔ "سوگندھی!"

یہ کہہ کر سوگندھی نے تیز لہجے میں کہا۔ "سوگندھی کے بچے تو آیا کس لیے ہے یہاں؟ تیری ماں رہتی ہے اس جگہ جو تجھے پچاس روپے دے گی؟ یا تو کوئی بڑا گبھرو جوان ہے جو میں تجھ پر عاشق ہو گئی ہوں۔۔۔۔ کتے، کمینے، مجھ پر رعب گانٹھتا ہے؟۔۔۔۔ میں تیری رکھیل ہوں کیا؟۔۔۔۔ بھک منگے تو اپنے آپ کو سمجھ کیا بیٹھا ہے؟۔۔۔۔ میں پوچھتی ہوں تو ہے کون؟۔۔۔۔ چور یا گٹھ کترا؟۔۔۔۔ اس وقت تو میرے مکان میں کرنے کیا آیا ہے؟۔۔۔۔ بلاؤں پولیس کو؟۔۔۔۔ پونے میں تجھ پر کیس ہو نہ ہو۔ یہاں تو تجھ پر ایک کیس کھڑا کر دوں۔۔۔۔"

مادھو سہم گیا۔ "دبے لہجے میں وہ صرف اس قدر کہہ سکا۔

"سوگندھی! تجھے کیا ہو گیا ہے؟"

"تیری ماں کا سر۔۔۔۔ تو ہوتا کون ہے مجھ سے ایسے سوال کرنے والا۔۔۔ بھاگ یہاں سے ورنہ"۔۔۔۔۔۔ سوگندھی کی بلند آواز سن کر اس کا خارش زدہ کتا جو سوکھے ہوئے چپلوں میں منہ رکھے سو رہا تھا۔ ہڑبڑا کر اٹھا اور مادھو کی طرف منہ اٹھا کر بھونکنا شروع کر دیا۔ کتے کے بھونکنے کے ساتھ ہی سوگندھی زور زور سے ہنسنے لگی۔

مادھو ڈر گیا۔ گری ہوئی ٹوپی اٹھانے کے لیے وہ جھکا تو سوگندھی کی گرج سنائی دی۔ "خبردار!۔۔۔۔ پڑی رہنے دے وہیں۔۔۔۔۔ تو جا، تیرے پونا پہنچتے ہی اس کو منی آرڈر کر دوں گی۔" یہ کہہ کر وہ اور زور سے ہنسی اور ہنستی ہنستی بید کی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کے خارش زدہ کتے نے بھونک بھونک کر مادھو کو کمرے سے باہر نکال دیا۔ سیڑھیاں اتار کر جب کتا اپنی دم ہلاتا سوگندھی کے پاس واپس آیا اور اس کے قدموں کے پاس بیٹھ گیا اور کان پھڑپھڑانے لگا تو سوگندھی چونکی۔۔۔۔ اس نے اپنے چاروں طرف ایک ہولناک سناٹا

دیکھا۔۔۔۔ایسا سناٹا جو اس نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ اسے ایسا لگا کہ ہر شے خالی ہے۔۔۔۔جیسے مسافروں سے لدی ہوئی ریل گاڑی اسٹیشنوں پر مسافر اتار کر اب لوہے کے شیڈ میں بالکل اکیلی کھڑی ہے۔۔۔۔یہ خلا جو اچانک سوگندھی کے اندر پیدا ہو گیا تھا اسے بہت تکلیف دے رہا تھا اس نے کافی دیر تک اس خلا کو بھرنے کی کوشش کی۔ مگر بے سود۔ وہ ایک ہی وقت میں بے شمار خیالات اپنے دماغ میں ٹھونستی تھی مگر بالکل چھلنی کا سا حساب تھا۔ ادھر دماغ کو پر کرتی تھی۔ ادھر وہ خالی ہو جاتا تھا۔

بہت دیر تک وہ بید کی کرسی پر بیٹھی رہی۔ سوچ بچار کے بعد بھی جب اس کو اپنا دل پرچانے کا کوئی طریقہ نہ ملا تو اس نے اپنے خارش زدہ کتے کو گود میں اٹھایا اور ساگوان کے چوڑے پلنگ پر اسے پہلو میں لٹا کر سو گئی۔

---

## عصمت چغتائی

# مٹھی مالش

پولنگ بوتھ پر بڑی بھیڑ تھی جیسے کسی فلم کا پریمیر ہو۔ یہ لمبا کیو لگا تھا۔ پانچ سال پہلے بھی اسطرح ہم نے لمبے لمبے کیو لگائے تھے' جیسے ووٹ دینے نہیں سستا اناج لینے جارہے ہوں۔ چہروں پر اس کی پرچھائیں تھیں۔ کیو لمبا سہی پر کبھی تو اپنی باری آئے گی۔ پھر کیا ہے' وارے نیارے سمجھو اپنے بھروسے کے آدمی ہیں۔ قسمت کی باگ ڈور انہوں کے ہاتھ میں ہوگی۔ سارے دلدر دور ہو جائیں گے۔

''بائی' اے بائی اچھے تو ہو؟'' میلی سی کشٹو باندھے ایک عورت نے پیلے پیلے دانت نکال کر میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

''او خو گنگا بائی.........''۔

''رتی بائی' او گنگا بائی دوسری تھی مرگئی بے چاری''۔

''ارے......رے بے چاری.....'' زن سے میرا ذہن پانچ سال پیچھے قلابازی کھا گیا۔

''مالش کہ مٹھی؟'' میں نے پوچھا۔

''مالش''۔ رتی بائی نے آنکھ ماری۔'' سالی کو بہت منع بولا پرنکس سنا۔ تم کس کو دیں گا ووٹ بائی''۔

''تم کس کو دوگی'' ہم نے ایک دوسرے سے رسماً پوچھا۔

''ہمارا جات والا کو۔ اپن کے گاؤں کا ہے''۔

''پانچ سال ہوئے تب بھی تو تم نے اپنی جات والا کو دیا تھا ووٹ''۔

''ہاں بائی' پن وہ سالا کنڈم نکلا' کچھ نہیں کیا''۔ رتی بائی نے منہ بسور کر کہا۔

''اور یہ بھی تمہارا جات والا ہے''۔

''ہاں پن یہ ایک دم فرسٹ کلاس۔ ہاں بائی دیکھنا اپن کا کھیت چھوٹ جائے گا''۔

''پھر تم گاؤں جاکر دھان کوٹا کروگی''۔

''ہاں بائی''۔ رتی بائی نے اپنی چندھی آنکھیں پٹ پٹائیں۔

پانچ سال ہوئے ہسپتال میں جب میری منی پیدا ہوئی تو رتی بائی نے کہا تھا وہ اپنی جات والے کو ووٹ دینے

جارہی ہیں۔ چوپاٹی پر اس نے ان سے ہزاروں آدمیوں کی موجودگی میں وعدہ کیا تھا کہ اس کے ہاتھوں میں طاقت آتے ہی کایا پلٹ جائے گی دودھ کی نہریں بہنے لگیں گی زندگی میں سے شہد ٹپکنے لگے گا۔ آج پانچ سال بعد رتی بائی کی ساڑھی پہلے سے بوسیدہ تھی، بالوں پر سفیدی بڑھ گئی تھی آنکھوں کی وحشت دوچند ہو گئی تھی۔ آج پھر چوپاٹی پر کئے ہوئے وعدوں کا سہارا لے کر وہ اپنا ووٹ دینے آئی تھی۔

"بائی تم اس چنال سے کائیکو اتا بات کرتا"۔ رتی بائی نے بیڈ پین سرکاتے ہوئے اپنی نصیحتوں کا دفتر کھول دیا۔

"کیوں؟ کیا برائی ہے؟" میں نے بن کر پوچھا۔

"تم تمہارے کو بولا نا او چھوکری ایک دم کھراب ہے۔ سالی پکی بدماس"۔ رتی بائی کی ڈیوٹی لگنے سے پہلے گنگا بائی نے بھی اپنی ڈیوٹی کے درمیان مجھے یہی رائے دی تھی کہ رتی بائی ایک دم لوفر ہے۔ اسپتال کی یہ دونوں آیائیں ہر وقت کچر کچر لڑا کرتی تھیں۔ کبھی کبھی جوتم جھاتا تک نوبت پہنچ جاتی تھی۔ مجھے ان سے باتیں کرنے میں بڑا مزہ آتا تھا۔

"کیا وہ سالا سنکر بھائی تھوڑی ہے اس کا یار ہے۔ سنگ سوتی ہے"۔ گنگا بائی نے بتایا تھا رتی بائی کا میاں شولہ پور کے پاس ایک گاؤں میں رہتا ہے۔ تھوڑی سی زمین ہے۔ بس اسی سے چمٹا ہوا ہے۔ ساری فصل بیاج میں اٹھ جاتی ہے۔ تھوڑے سے روپے اور رہ گئے ہیں جو چند سالوں میں چک جائیں گے۔ پھر وہ اپنے بال بچوں کے پاس چلی جائے گی اور وہاں مزے سے دھان کوٹا کرے گی۔ گھر میں مزے سے دھان کوٹنے کے خواب دونوں ایسے دیکھا کرتی تھیں جیسے کوئی پیرس کے خواب دیکھتا ہو۔

"مگر رتی بائی تم بمبئی میں پیسہ کمانے کیوں آ گئیں؟ تمہارا میاں آجاتا تو ایک بات بھی تھی"۔

"ارے بائی وہ کیسے آتا؟ کھیت جو چلا جاتا۔ میرے سے کھیتی باڑی نہ سنبھلتی"۔

"اور بچوں کی دیکھ بھال کون کرتا ہے"۔

"ہے ایک رانڈ مری"۔ رتی بائی نے دو چار گالیاں نکالیں۔

"دوسری شادی کر لی ہے تمہارے میاں نے؟"

"اینہ! سالا دوسری شادی کیا کرے گا رکھیلی ہے"۔

"اور جو تمہارے پیچھے مالکن بن بیٹھی تو؟"

"کیسے بنے گی؟ مار مار بھوسا بھر دیں گے! بیاج نمٹ جائے پیچھے چلے جائیں گے ہم"۔

معلوم ہوا رتی بائی خود اپنی پسند کی ایک لاوارث عورت میاں اور بچوں کی خبر گیری پر چھوڑ آئی

ہیں۔ جب کھیت چھوٹ جائے گا تو پھر گھر ہستن بن کر دھان کوٹنے چلی جائیں گی۔ رکھیلی کا کیا ہوگا؟ اسے کوئی دوسرا میاں مل جائے گا جس کی بیوی بمبئی میں پیسہ کمانے آئی ہوئی ہے اور بال بچے دیکھنے والا کوئی نہیں۔

''اس عورت کا میاں نہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''ہے نہیں تو۔''

''تو وہ اس کے پاس نہیں رہتی۔''

''اس کے کھیت خورد برد ہو گئے۔ اس کا میاں کسان مزدور ہے' مگر سال میں آٹھ مہینے چوری چکاری کرتا ہے یا بڑے شہروں کی طرف نکل جاتا ہے' بھیک مانگ کر دن بتا دیتا ہے۔''

''اور بچے؟''

''ہیں نہیں تو۔ چار بچے ہیں یا تھے۔ ایک تو بمبئی میں ہی کھیل رل گیا' کچھ پتا نہیں کہاں گیا' چھوکریاں بھاگ گئیں' چھوٹا بچہ ساتھ رہتا ہے۔''

''تم کتنا روپیہ گاؤں بھیجتی ہو رتی بائی؟''

''اکھا چالیس۔''

''تمہاری گزر کیسے ہوتی ہے پھر''

''ہمارا بھائی سنبھالتا ہے۔'' وہی بھائی جس کے بارے میں گنگا بائی کہہ رہی تھیں کہ ان کا فرینڈ ہے''۔

''تمہارے بھائی کے بال بچے''

''ہیں نہیں تو۔''

''ہاں؟ گاؤں میں؟''

''ہاں' پونا کے پاس ایک جگہ ہے۔ اس کا بڑا بھائی کھیتی سنبھالتا ہے۔''

''یعنی تمہارا بڑا بھائی۔'' میں نے چڑانے کو پوچھا۔

''دھت۔ او ہمارا' بھائی کاہے کو ہوتا۔ کیا بائی تم ہمارے کو سالا چھنال سمجھتا۔ ہم گنگا بائی سری نہیں ہے۔ معلوم مہینے میں چار دن سے جاستی کسی کے ساتھ نہیں گئی۔ ہاں کوئی چھنا پرانا کپڑا ہو تو اس بدماس کو مت دینا' میرے کو دینا' ہاں!''

''رتی بائی''۔

''ہاں بائی''

''تمہارا ''بھائی'' تم کو مارتا ہے؟''

''سالا گنگا بائی بولا ہوئیں گا۔نہیں بائی جاستی نہیں مارتا۔کبھی کبھی پیے لا ہوتا تو مارتا۔سو بائی لاڈ بھی کرتا تا''۔

''لاڈ بھی کرتا ہے؟''۔

''کرتا نہیں تو''۔

''مگر رتی بائی تم اسے بھائی کیوں کہتی ہو کمبخت کو؟'' رتی بائی ہنسنے لگیں۔''بائی ہمارے میں ایسا ایچ بولتے''۔

''مگر رتی بائی چالیس روپیہ پگار ملتی ہے تو پھر دھندا کاہے کو کرتی ہو؟''۔

''بن کیسے پورا پڑے۔پانچ روپیہ کھولی کا بھاڑا لے تین روپیہ لالہ کے''۔

''یہ لالہ کو کاہے کے دیتی ہے؟''۔

''اکھا چالی کا عورت لوگ دیتا ہے نہیں تو نکال دیوے''۔

''دھندا جو کرتی ہو اس لیے؟''

''ہاں بائی''۔رتی بائی کچھ جھینپ گئیں۔

''اور تمہارا بھائی کیا کرتا ہے؟''۔

''بائی بولنے کا بات نہیں نا۔داروکا دھندا بڑا کھوٹا دھندا ہے۔جو پولیس کو پیسہ نہیں بھرے سو تڑی پار''۔

''یعنی بمبئی سے شہر بدر''۔

''ہاں بائی''۔

اتنے میں نرس نے آکر رتی بائی کو ڈانٹا ''کیا جیٹھی باتیں مٹھار رہی ہے۔چل جا نمبر 10 میں بیڈ پین پڑا ہے''۔ رتی بائی اپنے میلے دانت نکوستی بھاگیں۔

''آپ کیا ان لوفر عورتوں سے گھنٹوں باتیں کیا کرتی ہیں۔آپ کو آرام کی ضرورت ہے ورنہ پھر بلیڈنگ شروع ہو جائے گی''۔نرس نے بچی کو پنگھوڑے سے نکال لیا اور چلی گئی۔

شام کو گنگا بائی کی ڈیوٹی تھی۔بغیر گھنٹی بجائے خود ہی آن دھمکیں۔

''بیڈ پین مانگتا بائی''۔

''نہیں گنگا بائی بیٹھو''۔

''رانڈ ششتر بوم مارے گی۔کیا بولتی تھی تمہارے کو؟''۔

''کون سسٹر؟ بولتی تھی آرام کرو''۔

''ششتر نہیں اور تی بائی''۔

"کبھی بھی پوپٹ لال گنگا بائی کو خوب مارتا ہے" میں نے چھیڑا۔

"ارے او سالا ہمارے کو کیا مارے گا"۔ گنگا بائی میرے پاؤں پر ٹھوکے حوالے ٹکیاں مارنے لگیں۔

"بائی میرے کو جوتا چپل دینا کو بولا تھا دیو نا"۔

"لے جاؤ۔ مگر یہ تو بتاؤ تمہارے میاں کی چٹھی آئی؟"

"آئی نہیں تو"۔ گنگا بائی نے فوراً چپل پر ہاتھ مارا۔ "سالا ششٹر نے دیکھ لیا تو بوما بوم کرے گی۔ بوت کھٹ کھٹ کرتی ہے"۔

"گنگا بائی"۔

"ہاں بائی"۔

"تم اپنے گاؤں کب واپس جاؤ گی؟"۔

گنگا کی چمکیلی سیاہ آنکھیں دور کھیتوں کی ہریالی میں کھو گئیں۔ اس نے ٹھنڈی سانس بھری اور بڑی دھیمی آواز میں بولی "رام کرے اب کے فصل دھڑلے کی ہو جاوے۔ بس بائی پھر اپن چلا جائے گا۔ گئے سال باڑھ آ گئی سارا دھان کچرا ہو گیا"۔

"گنگا بائی تمہارے میاں کو تمہارے دوستوں کے بارے میں پتا ہے؟" میں نے کریدا۔

"کیا بات کرتا تم بائی"۔ گنگا بائی گم سم سی ہو گئی۔ اسے کچھ جھینپ سی معلوم ہو رہی تھی۔ انہوں نے فوراً بات بلٹی۔

"بائی تمارے کو دو چھوکری ہو گیا سیٹھ گسا کرے گا نا؟"

"کون سیٹھ؟" میں نے چکرا کر پوچھا۔

"تمہارا پتی دوسری سادی بنالے گا تو؟"

"وہ دوسرا شادی بنائے گا تو ہم بھی دوسرا شادی بنے لے گا"۔

"تمہارے لوگ میں ایسا ہوتا؟ ارے بائی ہم سمجھا تم کوئی اونچا جات کا ہے"۔ مجھے ایسا معلوم ہوا گنگا بائی اونچا جات والا کا مذاق اڑا رہی ہیں۔ میں نے بہت سمجھانے کی کوشش کی کہ گنگا بائی سمجھ جائیں مگر ان کا خیال تھا کہ دوسری لڑکی کی پیدائش پر ضرور میری شامت آئے گی۔ اگر سیٹھ میری ٹھکائی نہ کرے تو سخت تھرڈ کلاس سیٹھ ہے۔

اسپتال میں پڑے رہنا قید تنہائی سے کچھ کم نہیں۔ دو گھنٹے شام کو ملنے جلنے والے آ جاتے' اگر اسپتال میں یہ دونوں نہ ہوتیں تو شاید دم ٹوٹ جاتا۔ دونوں "معمولی سی رشوت" لیکر ایک دوسرے کے بارے میں

الٹی سیدھی باتیں بتایا کرتیں۔ ایک دن میں نے رتی بائی سے پوچھا۔

"اے رتی بائی تم مل میں کام کرتی تھیں، کیوں چھوڑ دیا؟"

"ارے بائی سالا مل میں بڑا لفڑا تھا۔"

"کاہے کا لفڑا؟"

"اے بائی ایک تو کام ایک دم بھاری، یہ بھی چلتا، پر بائی دو مہینے کے بعد چھٹی کر دیتے"۔

"کیوں؟"۔

"دوسرا بائی لوگ کو رکھتے"۔

"بھئی وہ کیوں"۔

"کارن یہ کہ اگر پکا چھ مہینے ہو جاتے تو فیکٹری لا جولا گو ہو جاوے"۔

"او ہو بھی۔ یعنی ہر دوسرے تیسرے مہینے نیا سٹاف بدلتا رہتا ہے۔ اگر مستقل ہو جائے ایک کاریگر تو فیکٹری لا کے مطابق اسے بیماری کی چھٹی زچگی کی چھٹی لینے کا حق مل جاتا ہے۔ اس لیے ہر دو مہینے کے بعد ادل بدل کر دی جاتی ہے۔ سال میں ایک مزدوری مشکل سے چار مہینے آمدنی ہوتی۔ باقی کے دن گاؤں واپس لوٹ جاتی ہیں۔ جن کی اتنی حیثیت نہیں وہ دوسری ملوں کے چکر کاٹتی ہیں۔ بعض سبزی گلی بھاجی ترکاری کی ڈھیریاں لگا کر فٹ پاتھ پر بیٹھ جاتی ہیں۔ فٹ پاتھ پا ٹچ اپنی جگہ کے لیے خوب گالی گلوچ ہوتی ہے۔ بغیر لائسنس کے بیچتی ہیں۔ اس لیے کچھ ٹکڑے سپاہی کو کھلانا پڑتا ہے اس پر بھی کبھی کوئی انجانا افسر آ جاتا ہے تو بھگدڑ مچ جاتی ہے۔ کچھ دکان جھولیوں میں سمیٹ کسی گلی میں سٹک جاتی ہیں، کچھ پکڑی جاتی ہیں اور واویلا کرتی ہیں۔ پولیس تھانے لیجائی جاتی ہیں۔ مطلع صاف ہوتے ہی پھر چیتھڑا بچھا کر دکان سجا لیتی ہیں۔ کچھ اور بھی چالاک ہوتی ہیں۔ جھولی میں چار چھ نیبو، دو چار بھٹے پکڑے بازار میں ایسے گھومتی ہیں جیسے خود خریدار ہیں، مگر پاس گزرنے والے سے چپکے سے کہتی ہیں۔

"لو بھائی بھٹا لیو ایک ایک آنہ"۔ اور بکری ہو جاتی ہے۔

ان سے ترکاری خریدنا گویا بیٹھے کی پڑیاں خریدنا ہے۔ جو ذرا کم خوش نصیب ہوتی ہیں وہ بھیک مانگنے لگتی ہیں۔ دوڑتے بھاگتے دھندا بھی کرتی جاتی ہیں۔ اپنی دانست میں سولہ سنگھار کے منہ میں بیڑا دبائے یہ لوگ نیم تاریک ریلوے اسٹیشن کے آس پاس ٹہلا کرتی ہیں۔ گاہک آتا ہے، کچھ اشارے کنائے ہوتے ہیں، سودا پٹ جاتا ہے۔ یہ گاہک عموماً پردیش کے گھر چھوڑ کر آئے ہوئے دودھ والے یا بے گھر بے در مزدور ہوتے ہیں جن کی بیویاں گاؤں میں ہوتی ہیں یا ازلی کنوارے جن کا گھر بار یہی گندی گلیاں اور فٹ پاتھ ہیں۔

صبح گنگا بائی اور رتی بائی میں باقاعدہ برآمدے میں فری اسٹائل کشتی ٹھن گئی۔ رتی بائی نے گنگا بائی کا جوڑا کھسوٹ ڈالا اور اس کے جواب میں گنگا بائی نے رتی بائی کا منگل سوتر توڑ ڈالا۔ منگل سوتر' کالی پوتھ کا باریک سا کنٹھا رتی بائی کے سہاگ کی نشانی۔ رتی بائی ایسے بھوں بھوں کر کے روئیں جیسے انہیں بیوہ کر دیا ہو۔ لڑائی کی بنیاد روئی کے وہ ٹکڑے تھے جو مریضوں کے زخموں کی رطوبت پونچھ کر پھینکے جاتے ہیں۔ یا ز چاؤں کے استعمال کی روئی۔ میونسپلٹی کا حکم ہے کہ یہ روئی احتیاط سے جلا دی جائے مگر معلوم ہوا رتی بائی اور گنگا بائی چپکے سے یہ روئی نکال کر دھو کر پوٹلی باندھ کر لے جایا کرتی تھیں۔ چونکہ آج کل تعلقات کچھ زیادہ کشیدہ تھے گنگا بائی نے ہیڈ سے شکایت کر دی۔ رتی بائی نے گالیاں دیں جو ہاتھا پائی میں تبدیل ہو گئیں۔ دونوں نکال دی جاتیں مگر ہاتھ پاؤں جوڑے تو ہیڈ نے بات دبا دی۔

رتی بائی ذرا عمر والی اور پچپسی سی تھیں۔ گنگا بائی نے ان کی خوب ٹھکائی کی۔ دوپہر کی سوجی ہوئی ناک لیے بیڈ پین رکھنے آئیں تو میں نے پوچھا۔

"رتی بائی اس گندی روئی کا کیا کرتی ہو؟"

"دھو کر سکھا لیتے ہیں۔ ایک دم صاف ہو جاتی ہے"۔

"پھر؟"

"پھر روئی والے کے ہاتھ بیچ دیتے ہیں"۔

"کون لیتا ہے یہ جراثیم بھری دوائی؟"

"میٹرس والا' جو صاحب لوگ کا فرنیچر کا گدا بناتا ہے"۔

اف! میرے جسم پر سوئیاں کھڑی ہو گئیں۔ ایک دفعہ میں نے بید کے صوفے کی روئی دھنکوانے کو نکلوائی تو کالی سیاہ۔ تو وہ بھی زخموں کی روئی تھی۔ اللہ! میری بچی کا گدا بھی ایسی روئی کا ہے۔ میری پھول سی بچی اور یہ جراثیم کے ڈھیر۔ ہائے گنگا بائی' رتی بائی تمہیں خدا سمجھے!

آج چونکہ جوتا چلا تھا۔ رتی بائی بھری بیٹھی تھیں۔ گنگا بائی چونکہ ذرا نسبتاً جوان تھیں۔ رتی بائی انہیں اپنے سے زیادہ گناہگار سمجھتی تھیں۔ کچھ دن پہلے انہوں نے رتی بائی کا خاصہ مستقل گاہک بھی توڑ لیا تھا۔ وہ تمام پیٹ جو گنگا بائی وقتاً فوقتاً ضائع کراتی رہتی تھیں' نالے میں جو جیتا جاگتا بچہ چھوڑ آئی تھیں' جو آنول نال منہ پر ڈال دینے کے بعد بھی سسکتا رہا۔ صبح نالے کے پاس ایک خلقت جمع تھی۔ اگر رتی بائی چاہتی تو صاف پکڑا دیتی گنگا کو مگر اس نے راز کو اپنے سینے میں چھپائے رکھا اور گنگا بائی کا دیدہ دیکھو فٹ پاتھ پر بیٹھی کچے بیر اور امرود کی ڈھیریاں بیچتی رہی۔

"رتی بائی کوئی گڑبڑ سڑبڑ ہو جاتی ہے اس دوسی میں تو تم اسپتال کیوں نہیں چلی جاتیں"۔

"کاہے کو جاوے اسپتال؟ ہمارے میں بہت بائی لوگ ہے ڈاکٹر کا مافک ایک دم فرسٹ کلاس"۔

"دوائی دیتی ہیں کوئی؟"

"اور کیا' فسٹ کلاس دوائی دیتی۔ مٹھی بھی چلتی ہے پن مالش ایک دم اچھی"۔

"یہ 'مٹھی' اور 'مالش' کیا بلا ہوتی ہے؟"۔

"بائی تم نہیں سمجھے گا"۔ رتی بائی ذرا شرما کر ہنسنے لگیں۔ میرے ڈسٹنگ پاؤڈر کے ڈبے پر وہ کئی دن سے منڈلا رہی تھیں۔ جب میرے لگاتیں ذرا سا ہتھیلی پر ڈال کر اپنے گلوں پر رگڑ لیتیں۔ میں نے سوچا ان کا منہ کھلوانے کے لیے یہ ڈبہ کافی ہوگا۔ میں نے ڈبہ پیش کیا تو بو کھلا گئیں۔

"نہیں بائی شسٹر مار ڈالے گی"۔

"نہیں مارے گی۔ میں اس سے کہہ دوں گی مجھے اس کی بو پسند نہیں"۔

"چہ۔ ارے کیا ایک دم فسٹ کلاس باس ہوتا ہے۔ ارے بائی تمہارا تو مستک پھر یلا ہے"۔

بڑے اصرار کے بعد رتی بائی نے مجھے مالش اور مٹھی کی تفصیل بتائی ابتدائی دنوں میں تو مالش کارگر ہوتی ہے۔ فسٹ کلاس ڈاکٹر کا مافک بائی مریضہ کو زمین پر لٹا کر چھت سے لٹکتی ہوئی رسی یا کسی لاٹھی کے سہارے اس کے پیٹ پر کھڑی ہو کر خوب کھوندتی ہے۔ یہاں تک کہ آپریشن ہو جاتا ہے۔ یا اسے دیوار کے سہارے کھڑا کر کے بائی پہلے اپنے سر میں خوب کنگھی کر کے کس کے جوڑہ باندھ لیتی ہے۔ پھر چلو بھر کڑوا تیل سر پر ڈال کر مریضہ کے پیروں کو مینڈھے کی طرح ٹکراتی ہے۔ سخت جان محنت مزدوری کرنے والی بعض نوجوان عورتوں پر اس کا بھی کبھی کبھی کچھ اثر نہیں ہوتا' تب مٹھی کی نوبت آتی ہے۔ بے دھلے گندے میل بھرے ناخن والے ہاتھ کو تیل میں ڈبو کر جسم میں سے دھڑکتی ہوئی جان کو توڑ کر نکال لیا جاتا ہے!

عموماً آپریشن پہلے وار میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ بائی اناڑی ہو تو کبھی صرف ایک ہاتھ ٹوٹ کر آ جاتا ہے' کبھی گردن رہ جاتی ہے اور کبھی جسم کا وہ حصہ بھی گھسٹتا چلا آتا ہے جسے اندر ہی رہنا تھا۔

مالش سے بہت زیادہ موتیں نہیں ہوتیں۔ ہاں عموماً مریضہ مختلف امراض کا شکار ہو جاتی ہے۔ جسم جگہ بے جگہ سے سوج جاتا ہے۔ مستقل گھاؤ بن جاتے ہیں جو رستے رہتے ہیں۔ بخار رہنے لگتا ہے اور پھر اللہ کی دی موت بھی آنے والے کو آ ہی جاتی ہے۔ مٹھی سخت نازک موقعوں پر استعمال کی جاتی ہے۔ جان پر کھیل کر اور عموماً بائی لوگ جان پر کھیل جاتی ہیں۔ جو بچ رہتی ہیں کچھ چلنے پھرنے کے قابل نہیں رہتیں' کچھ چند سال گھسٹ کر ختم ہو جاتی ہیں۔

اور رتی بائی نے کہا یہی سزا ہے ان بدقماش عورتوں کی۔ مرنا تو چاہیے ان کو۔

مجھے بڑے زور سے قے ہوئی اور رتی بائی جو چٹخارے لے لے کر سنا رہی تھیں بوکھلا کر بھاگیں۔ سنسان خاموش اسپتال میں مجھے وحشت ہونے لگی۔ یا خدا انسان کو جنم دینے کی اتنی بھیانک سزا۔ میں نے غنودگی میں ڈوبتے ہوئے سوچا۔

خوف سے میرے حلق میں کانٹے پڑ گئے۔ رتی بائی کی کھینچی ہوئی تصویروں میں تخیل نے رنگ بھرا پھر جان ڈال دی۔ کھڑکی کے پردے کا سایہ دیوار پر ہل رہا تھا۔ دیکھتے دیکھتے سایہ گنگا بائی کی مالش زدہ خون میں نہائی ہوئی لاش کی طرح تڑپنے لگا۔ ایک بھیانک میلے ناخنوں والا آہنی شکنجہ دماغ میں مٹھی بن کر اتر گیا۔ ایک وار میں ننھی ننھی انگلیاں ڈھلکی ہوئی گردن خون میں غلطاں و پیچاں۔ میرا دل و دماغ میں نے چیخنا چاہا کسی کو پکارنا چاہا مگر حلق سے آواز نہ نکلی۔ میں نے گھنٹی کا سوئچ دبانے کے لیے ہاتھ بڑھایا مگر جنبش نہ ہوئی۔ خاموش چیخیں میرے سینے میں گھٹتی رہیں۔

اسپتال کی خاموش فضا میں جیسے کسی مقتول کی چیخیں یکا یک گونج اٹھیں۔ یہ چیخیں میرے کمرے سے آتی تھیں جنہیں میں نے نہیں سنا۔ میں نے وہ بھی نہیں سنا جو میری زبان سے انجانے میں نکل رہا تھا۔

"کوئی برا خواب دیکھا ہوگا"۔ نرس نے مجھے مارفیا کا انجکشن دے دیا۔ میں نے بہت کہنا چاہا "نرس مجھے مارفیا نہ دو۔ وہ دیکھو سامنے گنگا بائی کی مالش زدہ خون میں نہائی لاش صلیب پر چڑھی تڑپ رہی ہے۔ اس کی چیخیں میرے دماغ میں پیچ کس کی طرح دھنستی جا رہی ہیں۔ دور کہیں نالے میں دم توڑتے ہوئے بچے کی سسکیاں ہتھوڑے کی ضربوں کی طرح میرے دل پر پڑ رہی ہیں۔ میرے اعصاب پر مارفیا کا پردہ نہ ڈالو۔ رتی بائی کو پولنگ بوتھ جاتا ہے۔ نئے منسٹر اس کے جات والے ہیں۔ اب بیاج چک جائے گا اور گنگا بائی مزے سے دھان کوٹے گی۔ یہ نیند کی چادر میرے دماغ پر سے سرکا دو۔ مجھے جاگنے دو۔ گنگا بائی کے جیتے جیتے خون کے دھبے سفید چادر پر پھیلتے جا رہے ہیں۔ مجھے جاگنے دو"۔

میز کے سامنے بیٹھے ہوئے کلرک نما شخص نے میرے بائیں ہاتھ کی انگلی پر نیلی روشنائی کا ٹیکہ لگایا تو میں جاگ پڑی۔

"ہمارا جات والے کے ڈبے میں ڈالنا باں"۔ رتی بائی نے مجھے ہدایت کی۔

رتی بائی کے جات والے کا ڈبا ایک یخم شخیم مٹھی بن کر میرے دل و دماغ سے ٹکرایا اور میں نے اپنی پرچی اس ڈبے میں نہیں ڈالی۔

# غلام عباس

## بھنور

اللہ کے کچھ بندے ایسے بھی ہیں جن کے لیے صوم وصلوٰۃ کا پابند ہونا ہی کافی نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنے مذہبی ولولے کی تسکین کے لیے اس سے کہیں سوا چاہتے ہیں۔ ان کی تمنا ہوتی ہے کہ جس نور سے ان کا سینہ روشن ہے اس کی کرن دوسروں تک بھی پہنچے۔ وہ گمراہوں کی ہدایت کے لیے خطرناک جگہوں پر بھی جانے سے نہیں گھبراتے۔ انہیں نہ جان کا خوف ہوتا ہے نہ جگ ہنسائی کا۔ بلکہ وہ اس کام کو فریضہ سمجھ کر ادا کرتے ہیں۔

حاجی شفاعت احمد خاں ایسے ہی دینداروں میں سے تھے۔ پچاس کے لگ بھگ سن۔ بھاری بھرکم جسم مگر خوب گٹھا ہوا۔ معلوم ہوتا تھا کہ جوانی میں کبھی کسرت سے شوق رہا ہوگا۔ سرخ وسفید رنگ' چوڑا چہرہ' گز بڑی داڑھی مگر خوب بھری ہوئی۔ آنکھیں بڑی بڑی شربتی رنگ کی' جن میں ہر وقت سرخی جھلکتی رہتی۔ چہرے پر ایک جلالی کیفیت۔ لباس ان کا عموماً یہ ہوتا۔ خاکی رنگ کی شلوار خاکی رنگ کی قمیض' چارخانے کپڑے کا کوٹ' پاؤں میں نری کا جوتا جو ہمیشہ گرد سے اٹا رہتا۔ سر پر سفید صافہ کلاہ پر بندھا ہوا۔ ہاتھ میں موٹے بید کی چھڑی' غرض لباس اور شکل وصورت سے وہ اچھے خاصے مرد مجاہد معلوم ہوتے تھے۔

حاجی صاحب صبح کو شہر کے ایک سرے سے جو گشت شروع کرتے تو شام ہوتے ہوتے پورے شہر کو جیسے کھنگال ڈالتے۔ ان کے جاننے والوں کا کوئی شمار نہ تھا۔ قدم قدم پر علیک سلیک ہوتی رہتی۔ کبھی پاؤ پاؤ گھنٹے سڑک کے کنارے ہی تلقین وہدایت کا سلسلہ جاری رہتا۔ کبھی کوئی جان پہچان والا کسی ضرورت سے ساتھ لے جاتا مگر گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے بعد وہ پھر گشت میں مصروف دکھائی دینے لگتے۔

وہ اپنی دین داری اور بزرگی کی وجہ سے بڑے ہر دل عزیز تھے۔ یہاں تک کہ شہر کے حکام بھی ان کی عزت کرتے تھے۔ کبھی محلے کا کوئی آوارہ مزاج لڑکا جوا کھیلنے یا کسی اور فعل شنیعہ کے الزام میں پکڑا جاتا تو اس کا باپ حاجی صاحب ہی کی پناہ لیتا۔

حضور! اس نالائق کے ہاتھوں سخت عاجز آ گیا ہوں۔ میں نے تو کبھی کا عاق کر دیا ہوتا مگر اس کی بدنصیب

ماں کچھ کرنے نہیں دیتی۔ جب سے سنا ہے کہ حوالات میں بند ہے سر پیٹ پیٹ کر برا حال کر لیا ہے۔

اور حاجی صاحب کی سفارش پر تھانے دار معمولی سی تنبیہہ کے بعد لڑکے کو رہا کر دیتا۔

ان کے رسوخ کی ایک وجہ یہ تھی کہ کسی زمانے میں وہ خود بھی شہر کے اہل کاروں میں سے تھے۔ شروع ہی سے وہ نیک دل اور منکسر المزاج تھے۔ سادگی سے زندگی بسر کرتے تھے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے ہر مہینے تھوڑی تھوڑی رقم پس انداز کر کے ایک چھوٹا سا گھر بنا لیا تھا۔ جب انہیں نوکری کرتے بیس برس ہو گئے تو حج کا شوق ہوا۔ اس فریضہ سے فراغت پا کر ہنسی خوشی وطن لوٹے تھے کہ اچانک ایک المناک حادثہ ان پر گزرا۔ ان کا اکلوتا بیٹا جس کی عمر اٹھارہ برس کی تھی ہیضے کا شکار ہو کر چوبیس گھنٹے کے اندر اندر چل بسا اور پھر اس کے دو ہی دن بعد اس کی ماں بھی جسے بیٹے کی تیمارداری میں چھوت لگ گئی تھی اس کے پاس پہنچ گئی۔ اس واقعہ کا ان کے دل پر ایسا گہرا اثر ہوا کہ انہوں نے علائق دنیوی سے منہ پھیر لیا اور باقی عمر ہدایت اور تبلیغ کے لیے وقف کر دی۔

اسی زمانے میں ان کے سر میں یہ دھن سمائی کہ رنڈیوں کی اصلاح کی جائے بھلا قحبہ خانوں سے بڑھ کر معصیت کے اڈے اور کون سے ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ ان کا دستور تھا کہ ہر جمعرات کی شام وہ قرآن مجید سبز جزدان میں رکھ سینے سے لگا رنڈیوں کے بازار کا رخ کرتے اور انہیں گناہوں سے توبہ کرنے اور نیک راہ پر چلنے کی ہدایت کرتے۔ رفتہ رفتہ ان عورتوں کے گھروں میں ان کی آمد و رفت ایک معمول بن گئی۔ ان کی صورت دیکھتے ہی گانا بجانا بند کر دیا جاتا اور ان کے چند و نصائح کو خاموشی سے سنا جاتا اس کے بعد گھر کی کوئی بڑی بوڑھی یا نائکہ ایسے لہجہ میں جو ہوتا تو نرم مگر طعن سے خالی نہ ہوتا' کہتی:

"حضرت اپنے شوق سے تو ہم یہ گناہ کرتے نہیں۔ یہ دوزخ جو لگا ہے اس کو بھی تو بھرنا ہے۔ آپ ہماری گزر بسر کا انتظام کر دیجئے۔ ہم آج ہی اس پیشے کو چھوڑے دیتے ہیں' مگر انتظام معقول ہونا چاہیے۔ ماما گیری تو ہم کرنے سے رہے۔"

اور یوں انہیں وقتی طور پر ٹال دیا جاتا۔

مگر کبھی کبھی ان گھروں میں حاجی صاحب کی تحقیر بھی خوب ہوتی اور انہیں گناہ اور بے حیائی کے ایسے ایسے منظر دیکھنے پڑتے کہ شرم سے نظریں جھکا لینی پڑتیں۔ ایک دفعہ ایک کوٹھے پر کسی ضیافت کا اہتمام تھا۔ بدقسمتی سے حاجی صاحب وہاں پہنچ گئے۔ ان کو دیکھنا تھا کہ قحبہ نے جس کے منہ سے شراب کے نشے میں رال ٹپک رہی تھی لپک کے ان کے گلے میں باہیں ڈال دیں اور ان کی لمبی ڈاڑھی کے پے در پے بوسے لینے شروع کر دیے پھر وہ لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں بولی:

"اے میرے مجازی خدا مجھے اپنے ساتھ لے چل۔ میں تیرے پاؤں دابوں گی۔ تیرے سر میں تیل ڈالوں گی۔ تیری ڈاڑھی میں کنگھی کروں گی"

اور جتنی قحبائیں اور ان کے آشنا اس کوٹھے پر جمع تھے یہ منظر دیکھ مارے ہنسی کے لوٹ لوٹ گئے۔

ایسے موقعوں پر وہ پیغمبروں اور ولیوں کے قصے یاد کرتے کہ کیسی کیسی ذلتیں اور ایذائیں انہیں راہ حق میں اٹھانی پڑیں اور اس طرح اپنے دل کو تقویت دے کر وہ پہلے سے زیادہ مستعدی کے ساتھ تبلیغ کا کام جاری رکھتے۔

رفتہ رفتہ وہ اس محلے میں خاصے بدنام ہو گئے۔ بعض وقت آوارہ لڑکوں اور اوباش لفنگوں کی ٹولی ان کے پیچھے ہو لیتی۔ یہ لوگ بالا خانوں میں بیٹھی ہوئی بیسواؤں کی طرف ہاتھوں سے طرح طرح کے اشارے کرتے' فحش آوازے کستے اور حاجی صاحب کو اپنا لیڈر بنا کر مضحک نعرے لگاتے۔ ان ہی باتوں سے اکثر لوگ حاجی صاحب کو مجذوب یا سودائی سمجھنے لگے تھے۔ وہ اس کی توضیح بھی کرتے کہ اکلوتے جوان بیٹے کی موت سے ان کے دماغ میں خلل آ گیا ہے۔

ایک دن حاجی صاحب کے پاس ایک شخص خبر لایا کہ بازار میں دو نئی رنڈیاں آئی ہیں۔ ایک کا نام گل ہے اور دوسری کا بہار۔ دونوں بہنیں ہیں۔ ایک ناچتی ہے دوسری گاتی ہے۔ دونوں اپنے اپنے فن میں ماہر ہیں۔ حسن بھی دونوں کا قیامت کا ہے' چند ہی روز میں سارے شہر میں ان کا چرچا ہو گیا ہے۔ لوگ پروانوں کی طرح گر رہے ہیں۔ سنا ہے بنک کا ایک ملازم ان کو رام کرنے کے لیے بنک سے بہت سا روپیہ اڑا لایا مگر پولیس موقع پر ان بیسواؤں کے گھر پہنچ گئی اور اس شخص کو نوٹوں کی گڈیوں سمیت پکڑ لیا گیا۔ ایک نوابزادے نے جو قلاش ہو گیا تھا' اپنی محرومی پر ان کے مکان کی سیڑھیوں میں پستول سے خودکشی کر لی۔ غرض وہ وہ ہنگامے ہوئے کہ ایک مدت سے سننے میں نہیں آئے تھے۔ لوگ کہتے تھے کہ یہ دوسری زہرہ اور مشتری ہیں جن کے سحر حسن سے انسان تو کیا فرشتے بھی محفوظ نہیں۔

حاجی صاحب نے مصلحتاً کچھ دنوں سے اس بازار میں جانا چھوڑ رکھا تھا' مگر اس نئے فتنے کا حال سنا تو فوراً ان کے دل میں ایک نیا جوش پیدا ہوا۔ انہوں نے دل میں کہا کہ ان عورتوں کو جلد سے جلد راہ راست پر لانا چاہیے' ورنہ خدا معلوم یہ کتنے گھروں کو تباہ اور کتنے لوگوں کے ایمان کو غارت کر دیں گی۔

انہوں نے ظہر کی نماز پڑھی' قرآن شریف سینے سے لگایا اور پتہ پوچھتے پوچھتے گل اور بہار کے بالا خانے پر پہنچ گئے۔ وہ دونوں رات بھر جاگنے کے بعد صبح کو جو سوئی تھیں تو اب سہ پہر کے قریب جا کر بیدار ہوئی تھیں۔ اتفاق سے اس وقت ایک بوڑھی خادمہ کے سوا گھر میں کوئی اور نہ تھا۔ انہوں نے اپنے سامنے سرخ

سرخ آنکھوں والے ایک مجذوب پٹھان کو جو دیکھا تو ڈر کے مارے ان کی گھگھی بندھ گئی۔

حاجی صاحب چند لمحوں تک حیرت سے ان کے حسن و جمال کو دیکھتے رہے پھر وہ پرشفقت لہجہ میں ان سے مخاطب ہوئے۔

"میری بیٹیو! مجھ سے ڈرو نہیں۔ میں کسی بری نیت سے نہیں آیا۔ میں تو تمہیں صرف یہ بتانے آیا ہوں کہ تمہاری عیش و عشرت کی یہ زندگی ایک دھوکا ہے اور یہ دھوکا صرف اسی وقت تک قائم ہے جب تک تمہارے گالوں میں خون کی یہ چند بوندیں ہیں۔ ان کی تروتازگی آخر کب تک باقی رہے گی۔ پانچ سال' سات سال' حد سے حد دس سال۔ اس کے بعد تم ایک قابل نفرت چیز بن جاؤ گی۔ اپنے عشاق کی نظروں ہی میں نہیں' اپنے عزیز ترین رشتہ داروں کی نظروں میں بھی۔ یہاں تک کہ تمہاری اولاد کو بھی تم سے گھن آئے گی۔ اس لیے کہ تمہارا وجود ان کے لیے انتہائی شرمندگی کا باعث ہوگا۔

میری بچیو! ذرا غور کرو۔ تمہاری زندگی کیسی ہنگاموں سے بھری ہوئی ہے۔ دن رات تمہارے چاہنے والوں کی دھینگا مشتی' قدم قدم پر جان کا خوف' ہر وقت پولیس کا دھڑکا' عدالت میں پیشیاں' یہ جینا بھی کوئی جینا ہے۔ میری بیٹیو تمہاری جگہ یہ بالا خانہ نہیں ہے بلکہ کسی شریف گھر کی چار دیواری ہے جہاں تم ملکہ بن کر رہو۔ جہاں تمہارا شوہر نگہبان اور محافظ ہو تمہارے ناز اٹھائے اور تمہارے پسینے کی جگہ خون بہائے اور جہاں تمہاری اولاد کے لیے تمہارے قدموں کے نیچے جنت ہو" یہ کہتے کہتے حاجی صاحب کی آواز رقت سے بھر آئی اور وہ اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکے۔

دونوں بہنوں پر سے خوف و ہراس تو دور ہو گیا تھا مگر ان باتوں کو سن کر وہ گم سم رہ گئی تھیں۔ آخر بڑی بہن گل نے کہا۔

"حضرت ہمارے ماں باپ نے ہمیں یہی پیشہ سکھایا ہے اس میں ہمارا کیا قصور!"

حاجی صاحب نے اس دن ان سے کچھ اور کہنا مناسب نہیں سمجھا۔ انہوں نے ایک کاغذ کے پرزے پر اپنے گھر کا پتہ لکھ کر ان کو دیا اور یہ کہہ کر چلے آئے کہ مجھے اپنا باپ سمجھو اور جب کبھی کوئی مشکل پڑے یا میری ضرورت ہو تو اس پتہ پر مجھے خبر کر دو۔

اس واقعہ کو آٹھ روز بھی نہیں گزرنے پائے تھے کہ ایک دن صبح ہی صبح ایک تانگہ ان کے مکان کے سامنے آ کر رکا۔ اس میں ایک عورت بیٹھی تھی جس نے سیاہ برقع اوڑھ رکھا تھا۔ تانگے میں دو ایک ٹرنک اور کچھ چھوٹی چھوٹی پوٹلیاں بھی تھیں۔ حاجی صاحب اس عورت کو اپنے مکان میں لے گئے اور اس کا سامان اندر پہنچا دیا گیا۔

یہ بہار تھی جو سچ مچ تائب ہو کر آ گئی تھی۔ اس کی خوبصورت آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ کئی دن سے وہ روتی رہی ہے اور اب بھی اس کے آنسو تھمنے میں نہ آتے تھے۔

"جس دن آپ آئے تھے"۔ اس نے حاجی صاحب کو بتلایا۔ "اسی دن سے ہم دونوں بہنوں میں جھگڑا شروع ہو گیا تھا کیونکہ اب میں پل بھر کے لیے بھی بازار میں بیٹھنا نہیں چاہتی تھی۔ آخر آج صبح میں اس سے علیحدہ ہو گئی ہوں۔"

اپنی اس کامیابی پر جو بازاری عورتوں کے اصلاحی کام کے سلسلے میں ان کی پہلی فتح تھی، حاجی صاحب کو اس قدر خوشی ہوئی کہ شاید بیٹے کے جی اٹھنے پر بھی نہ ہوتی۔ انہوں نے فوراً کپڑے بدلے اور سودا سلف لینے بازار چلے گئے۔ ان کے پیچھے بہار نے جھاڑو لے کر سارے گھر کی صفائی کی۔ چولہا مدت سے راکھ سے بھرا تھا اس کو صاف کیا۔ باورچی خانے کے فرش کو دھویا پونچھا اور اپنے سگھڑ پن سے ظاہر کر دیا کہ حسن و جمال، علم اور شستہ لب و لہجے کے ساتھ ساتھ وہ امور خانہ داری سے بھی ناواقف نہیں۔

چند ہی دنوں میں بہار نے جس کا نام حاجی صاحب نے بدل کر بلقیس بیگم رکھ دیا تھا اپنی خدمت گزاریوں سے ان کو یقین دلا دیا کہ وہ سچے دل سے توبہ کر کے آئی ہے اور اگر کوئی شریف قدردان مل گیا تو ساری زندگی اس کے ساتھ نباہ دے گی۔ حاجی صاحب کو اس سے سچ مچ الفت ہو گئی۔ جیسی باپ کو بیٹی سے ہوتی ہے۔ ادھر بلقیس بھی ان کا دل سے احترام کرتی اور ان کے سامنے شریف گھرانوں کی لڑکیوں کی طرح ہمیشہ اپنی نظریں نیچی رکھتی۔ اب حاجی صاحب کو بلقیس کے لیے کسی اچھے رشتے کی فکر ہوئی کیونکہ وہ یہ خوب سمجھتے تھے کہ لڑکی کا اصلی گھر اس کے شوہر ہی کا ہوتا ہے۔

سرکاری ملازمت کے دوران میں حاجی صاحب کا ایک رفیق کار رحمت علی ہوا کرتا تھا۔ وہ حاجی صاحب کی بڑی عزت کرتا تھا۔ یہ بھی اس سے بھائیوں کی طرح پیش آتے تھے۔ وہ تو مدت ہوئی مر چکا تھا مگر اس کے لڑکے انور نے حال ہی میں انجینئری کا امتحان پاس کیا تھا اور اسے ایک معقول سرکاری ملازمت مل گئی تھی۔ انور حاجی صاحب کو تایا ابو کہا کرتا تھا اور اکثر ان سے ملنے آیا کرتا تھا۔ ابھی چند روز ہوئے کہ وہ اپنی اس کامیابی کی اطلاع دینے آیا تھا۔ ابھی تک اس نے شادی نہیں کی تھی۔ بلقیس کے رشتے کے سلسلے میں ان کا خیال فوراً اس کی طرف گیا۔ وہ اس کے دفتر پہنچے اور اس کو شام کے کھانے پر بلایا۔ ادھر گھر آ کر انہوں نے بلقیس سے کہا۔

"بیٹی! آج شام ایک مہمان آ رہا ہے۔ وہ میرے ایک نہایت عزیز دوست کی نشانی ہے۔ تم یہ میلے کپڑے اتار کر کوئی اچھا سا لباس پہن لینا، وہ میرے بیٹوں کی طرح ہے۔ اس سے پردہ نہیں کرنا ہو گا۔"

شام کو انور کھانے پر آیا تو بلقیس کے حسن اس کی شائستگی اور حیا کو دیکھ کر مبہوت رہ گیا۔ حاجی صاحب نے اس کو بلقیس کی بپتا سنائی اور اس سے کوئی بات چھپا نہ رکھی۔ دوسرے دن وہ پھر آیا' پھر تیسرے دن پھر دن میں دو دو مرتبہ آنے لگا اور آخر مہینہ بھی نہ گزرنے پایا تھا کہ ان دونوں کی شادی ہو گئی۔

انور اور بلقیس کی خوب گزر ہونے لگی۔ وہ دونوں اکثر حاجی صاحب سے ملنے آیا کرتے۔ انور اپنی بیوی کو فریفتگی کی حد تک چاہتا تھا ادھر بلقیس بھی دل و جان سے اس پر فدا تھی۔ اس کے ساتھ ہی وہ حاجی صاحب سے بھی ایسی الفت کرنے لگی گویا وہ سچ مچ باپ ہیں اور پھر بھی تو تھے جن کے طفیل وہ گمراہی کے گڑھے سے نکلی تھی۔

جب ایک سال گزر گیا تو انور کی تبدیلی کسی اور شہر ہو گئی۔ حاجی صاحب ان میاں بیوی کو اسٹیشن پر رخصت کرنے آئے تو جدائی کے خیال سے روتے روتے بلقیس کی ہچکی بندھ گئی۔ حاجی صاحب نے بڑی تسلیاں دے کر اسے رخصت کیا۔

وہ باقاعدگی سے ہر مہینے حاجی صاحب کو خط لکھتی جس میں اس کی اور انور کی خیریت اور گھر کے حالات تفصیل سے لکھے ہوتے۔ اس کے ان خطوں میں ایک بلبل کی سی چہچہاہٹ تھی۔ ان خطوں کا سلسلہ کوئی دو برس تک جاری رہا۔ اس کے بعد جو خطوط آئے ان کا لہجہ اچانک سنجیدہ ہو گیا۔ حاجی صاحب نے اس تبدیلی کو بلقیس کی بڑھتی ہوئی عمر کے تقاضے پر محمول کیا۔ آخر تیسرے سال ایک خط آیا جسے پڑھ کر وہ بھونچکا رہ گئے۔ لکھا تھا۔

ابا جان! تسلیم! مجھے افسوس ہے کہ یہ خط پڑھ کر آپ کو صدمہ پہنچے گا۔ میں نے عرصے تک اس معاملے کو آپ سے چھپائے رکھا تاکہ آپ کو دکھ نہ ہو لیکن اب بات اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ اس کا چھپانا ممکن نہیں اور میں سمجھتی ہوں کہ اس میں میرے شوہر انور کا کچھ قصور نہیں۔ اس کی تمام ذمہ داری ان کے رشتہ داروں پر ہے جو ہر روز آ آ کر ان کے کان بھرتے رہتے ہیں۔ ان لوگوں کو کسی نہ کسی طرح میری پچھلی زندگی کا حال معلوم ہو گیا ہے اور وہ مجھ سے سخت نفرت کرنے لگے ہیں اور برملا طعنے دیتے ہیں۔ چونکہ بدقسمتی سے اس عرصے میں میرے کوئی اولاد بھی نہیں ہوئی جو شاید انور کو مجھ سے قریب تر کر دیتی۔ اس لیے یہ لوگ اب اس کوشش میں ہیں کہ انور میاں سے مجھے طلاق دلوا دیں۔ میں نے اس لڑکی کو بھی دیکھا ہے جس کو وہ ان کے پلے باندھنا چاہتے ہیں۔ اچھی شریف لڑکی ہے' بے چاری شکل کی بھی بری نہیں۔ اب میری آپ سے التجا ہے کہ اس سے پہلے کہ یہ لوگ مجھے دھکے دے

کر نکال دیں آپ خود آئیں اور مجھے طلاق دلوا کر لے جائیں۔

آپ کی پیاری بیٹی

بلقیس

اس خط کی عبارت نے حاجی صاحب کو سخت بے چین کر دیا۔ وہ رات بھر بستر پر کروٹیں بدلتے رہے۔ صبح ہوئی تو وہ اسٹیشن پہنچے اور پہلی گاڑی سے اس شہر کو روانہ ہو گئے جہاں انور ملازم تھا۔ رات بھر وہ غم اور غصے سے کھولتے رہے۔ ان کا جی چاہتا کہ وہ جاتے ہی انور کا منہ نوچ لیں۔ راستے بھر وہ قرآنی آیات پڑھ پڑھ کر اپنا غصہ ٹھنڈا کرتے رہے۔

مصالحت کا سوال ہی نہیں تھا کیونکہ جب دلوں میں فرق پڑ جائے تو زندگی کا لطف جاتا رہتا ہے۔ اب ان کی کوشش یہ تھی کہ وہ انور سے حق مہر حاصل کریں اور وہ تمام زیورات اور کپڑے بھی جو انور نے اب تک بلقیس کو بنوا کر دیے تھے۔

انور اور اس کے رشتہ داروں نے زیادہ مزاحمت نہ کی۔ انور کو توقع نہ تھی کہ اس قدر جلد بلقیس سے اس کا پیچھا چھوٹ جائے گا اور اسے کسی قدر رنج بھی ہوا کیونکہ ابھی تک اس کے دل میں بلقیس کی کچھ کچھ محبت باقی تھی۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ حاجی صاحب بلقیس کو ساتھ لے دو تانگوں میں اسباب لدوا اسی رات اسٹیشن پہنچے اور دوسرے دن گھر آ گئے۔

بلقیس اب پھر حاجی صاحب کے پاس رہنے لگی۔ حاجی صاحب کو اب پھر اس کے رشتے کی فکر ہوئی اور ابھی تین مہینے بھی نہ گزرے تھے کہ انہوں نے اس کے لیے ایک اور شوہر تلاش کر لیا۔ اب کے جو آدمی چنا گیا وہ انور کی طرح نہ تو کم عمر تھا اور نہ زیادہ تعلیم یافتہ اور نہ اس کا تعلق کسی اونچے گھرانے سے تھا۔ وہ میوے کا کاروبار کرتا تھا۔ آئے دن دساور سے میوے کی بھری ہوئی لاریاں اس کے یہاں آتی رہتی تھیں۔ شہر کے میوہ فروشوں میں اس کی بڑی ساکھ تھی۔

یہ میوہ فروش جس کا نام ربانی تھا رنڈوا تھا اور کسی نیک بیوہ سے عقد کرنا چاہتا تھا۔ حاجی صاحب نے حق مہر کے طور پر پانچ ہزار روپیہ نقد اور ایک مکان بلقیس کے نام لکھوانے کی شرط پیش کی جسے اس نے بلا حیل و حجت منظور کر لیا در اصل یہ میوہ فروش بہار کے پرانے مگر ناکام عشاق میں سے تھا۔ جب بہار بازار سے غائب ہوئی تھی تو وہ سخت پریشان ہوا تھا۔ پھر کچھ دن بعد جب اس نے سنا کہ حاجی صاحب نے اسے کسی انجینئر سے بیاہ دیا ہے تو وہ ایک آہ سرد بھر کے رہ گیا تھا۔ اب جو اسے اس طلاق کا حال معلوم ہوا تو اس کے دل میں پھر بہار کی آرزو تازہ ہو گئی اور اس نے جلد ہی منت خوشامد سے حاجی صاحب کو اس رشتے پر آمادہ کر لیا مگر حاجی

صاحب نے جب تک پورا حق مہر وصول نہ کر لیا میوہ فروش کو بلقیس کی شکل تک نہ دیکھنے دی۔

بلقیس نے ایک اطاعت مند بیٹی کی طرح حاجی صاحب کے تجویز کئے ہوئے رشتے کو صبر شکر سے قبول کر لیا اور دونوں کی خاصی گزر ہونے لگی یہاں تک کہ ایک سال ہنسی خوشی میں گزر گیا' مگر یہ میوہ فروش طبعاً عیاش واقع ہوا تھا' شادی کے بعد کچھ عرصہ تو وہ اس سے بڑی عزت کے ساتھ پیش آتا رہا مگر جلد ہی اس کے رویے میں تبدیلی آ گئی اور وہ اس سے ایسا سلوک کرنے لگا گویا وہ اس کی داشتہ ہو وہ مصر تھا کہ بلقیس رات رات بھر اس کے ساتھ جاگے اور شراب نوشی میں شریک ہو۔ پھر وہ اس کا بھی متمنی تھا کہ آئے دن دوستوں کی دعوتیں ہوں اور بلقیس ساقی میہمانی گری کی خدمت سرانجام دے اور وہ دوستوں سے فخریہ کہہ سکے۔

''یہی تھا وہ لعل بے بہا جس کی ایک جھلک دیکھنے کو دنیا ترستی تھی اور اب میں تنہا اس کی قسمت کا مالک ہوں۔''

مگر بلقیس نے اس کی ان خواہشوں کو سختی کے ساتھ رد کر دیا' وہ اس کے دوستوں کی ضیافتوں اور ان کی مے خواری سے تو تعرض نہ کرتی مگر خود کبھی ان کے سامنے نہ آتی۔

رفتہ رفتہ میوہ فروش کا دل گھر سے اچاٹ رہنے لگا اور یہ محفلیں اب اوروں کے ہاں منعقد ہونے لگیں۔ میاں بیوی کے تعلقات کشیدہ رہنے لگے۔ کئی مرتبہ گالی گلوچ تک نوبت پہنچ گئی۔ آخر ایک دن میوہ فروش نے شراب کے نشے میں بلقیس کو اس قدر پیٹا کہ وہ کئی دن تک بستر سے نہ اٹھ سکی۔

حاجی صاحب کو میاں بیوی کی ناچاقی کا علم تھا مگر جب انہیں اس مار پیٹ کی خبر ہوئی تو ان کی آنکھوں کے آگے اندھیرا آ گیا۔ وہ اسی وقت میوہ فروش کے گھر پہنچے اور بلقیس کو اپنے ہمراہ لے آئے۔ میوہ فروش نے معافی مانگی منت سماجت کی مگر حاجی صاحب پر کچھ اثر نہ ہوا۔ انہوں نے کہا۔

''اگر تم نے فوراً طلاق نہ دی تو میں تمہارے خلاف چارہ جوئی کروں گا۔''

میوہ فروش حاجی صاحب کے اثر و رسوخ کو بخوبی جانتا تھا۔ مقدمہ بازی سے خائف ہو کر ناچار طلاق دینے پر آمادہ ہو گیا۔

اب کے بلقیس سال بھر تک حاجی صاحب کے گھر پر رہی۔ جب کبھی حاجی صاحب اس کے رشتے کا سوال اٹھاتے تو وہ ٹال کر جاتی۔

''ابا جان آپ کو میری کیوں فکر رہتی ہے۔ میں آپ پر بھاری ہوں کیا؟''

مگر ایک دور اندیش باپ کی طرح حاجی صاحب نہیں چاہتے تھے کہ بلقیس زیادہ عرصے گھر میں بیٹھی رہے۔ علاوہ ازیں اس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ وہ اپنے اصلاحی کام میں ناکام رہے۔ ان کا منصوبہ ناقابل عمل

ثابت ہوا مگر ایک مرتبہ شکست حاصل کر کے اب وہ کسی طرح اس شکست کے لیے تیار نہ تھے چنانچہ انہیں پھر اس کی شادی کی فکر دامنگیر ہوئی اور بلقیس کچھ تو حاجی صاحب کے اصرار سے اور کچھ اپنے مستقبل کے خیال سے تیسری مرتبہ پھر شادی پر رضامند ہو گئی۔

اب کے حاجی صاحب نے شوہر کے انتخاب میں انتہائی حزم و احتیاط سے کام لیا اور مہینوں اس کے مزاج اور چال چلن کے بارے میں تفتیش کرتے رہے۔

یہ ایک نوعمر شخص تھا جو کسی دفتر میں معمولی کلرک تھا۔ حد درجہ کم سخن' بھولا بھالا ناک نقشہ بھی اچھا تھا' البتہ ہاتھ پاؤں کا ذرا دبلا تھا۔ سارا دفتر اس کی سادگی مزاج اور اطاعت گزاری کا معترف تھا۔ ایسے داماد کو پا کر حاجی صاحب مطمئن ہو گئے۔ ادھر بلقیس نے بھی خوشی خوشی اسے قبول کر لیا' البتہ اس بات کی ذرا خلش تھی کہ وہ عمر میں اس سے پانچ سال بڑی تھی۔

اس دفعہ حاجی صاحب نے اونچے خاندان اور روپے پیسے کا لالچ نہیں کیا تھا' بلکہ مصلحتاً غریب شوہر چنا تھا اور پھر روپے کی ضرورت بھی کیا تھی کیونکہ پچھلے مہروں کی رقمیں' گھر کا سامان زیور' کپڑا لتا پہلے ہی وافر تھا۔ اس کلرک کا نام منیر تھا۔ اس کے آگے پیچھے کوئی نہ تھا۔ کم عمری ہی میں ماں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا تھا۔ کچھ دور کے رشتہ دار تھے مگر وہ اس کے خرچ کا بوجھ اٹھانے کو تیار نہ تھے اور اس نے یتیم خانے میں پرورش پائی تھی۔

بلقیس اور منیر خوش حالی اور فارغ البالی سے زندگی بسر کرنے لگے۔ رفتہ رفتہ محبت کے بندھنوں نے ایک دوسرے کو جکڑ لیا۔ بلقیس کو ایسا محسوس ہوا کہ جو خوشی انور سے علیحدگی کے بعد اس سے چھن گئی تھی وہ اسے پھر مل گئی ہے۔ ادھر منیر بھی آٹھوں پہر اسی کا دم بھرتا تھا۔ وہ ایسا صالح نوجوان تھا کہ کسی قسم کا نشہ یا لت اس کو نہ تھی۔ دفتر سے چھٹی ملتے ہی سیدھا گھر کا رخ کرتا اور پھر بیوی کی قربت میں ایسا کھو جاتا کہ دوسرے دن دفتر جانے کے وقت ہی گھر سے نکلتا۔

دن پر دن گزرتے گئے' ہفتے' مہینے اور پھر سال دونوں کی محبت بڑھتی ہی چلی گئی۔ اب حاجی صاحب بھی بہت ضعیف ہو گئے تھے۔ تبلیغ اور ہدایت کا وہ پہلا سا جوش و خروش ان میں نہیں رہا تھا۔ گھر سے کم ہی باہر نکلتے مگر ان کو اطمینان تھا کہ بالآخر ان کی محنت ٹھکانے لگ گئی۔

اسی طرح پانچ سال گزر گئے اس دوران میں منیر کو نوکری کے سلسلے میں کئی جگہ تبدیل ہو کر جانا پڑا مگر وہ جہاں کہیں بھی جاتے بلقیس حاجی صاحب کو اپنی خیر و عافیت کی اطلاع دیتی رہتی۔

ایک دن حاجی صاحب کو ایک خط ملا جسے پڑھ کر اچانک ایک مرتبہ پھر دنیا ان کی آنکھوں میں

اندھیر گئی۔ بات یہ تھی کہ منیر کی صحت پچھلے سال سے دھیرے دھیرے گرنی شروع ہوگئی تھی۔ منیر کا ہر وقت گھر میں پڑے رہنا' کھیل تفریح میں حصہ نہ لینا اس کی تندرستی کے لیے ضرر رساں ثابت ہوا۔ اسے ہلکا ہلکا بخار رہنے لگا تھا اور کبھی کبھی کھانسی بھی اٹھنے لگی تھی۔ ڈاکٹروں کی رائے تھی کہ یہ ابتدائی دق کے آثار ہیں اور انہوں نے مشورہ دیا تھا کہ دفتر سے طویل رخصت لے لی جائے اور اسے کسی صحت افزا پہاڑی مقام پر رکھا جائے۔

خط کی آخری سطور یہ تھیں۔

لیکن میرے پیارے ابا جان! آپ اس خبر سے زیادہ پریشان نہ ہوں۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ منیر میاں سال بھر باقاعدہ علاج کرانے سے تندرست ہو جائیں گے۔ میں خود ان کی تیمارداری کروں گی اور جس صحت افزا مقام پر وہ رہیں گے میں ان کے ساتھ رہوں گی۔ شفا تو اللہ نے چاہا انہیں ضرور ہو جائے گی مگر اس میں تین چار سو روپیہ ماہوار اٹھے گا' سو اس کی آپ فکر نہ کریں۔ وہ جو میرے نام کا مکان ہے اسے فروخت کر دیں آخر جائداد اسی قسم کی ضرورتوں ہی کے لیے تو ہوتی ہے' جان ہے تو جہان ہے۔ امید ہے کہ آپ ان تمام باتوں کا جواب مفصل لکھیں گے یا خود تشریف لائیں گے۔ آپ کے دیدار کی طالب

بلقیس

اس خط کو پڑھ کر حاجی صاحب گم سم ہو کر رہ گئے۔ اچانک دل میں ایسا ضعف محسوس ہوا' گویا ان کا آخری وقت آ پہنچا ہو۔۔۔ دو دن تک وہ گھر سے باہر نہ نکلے۔ تیسرے دن جب طبیعت سنبھلی تو وہ لاٹھی ٹیکتے ہوئے اٹھے اور جائداد کی فروخت کے سلسلے میں کسی دلال کی تلاش میں نکلے۔ قدم گھر سے باہر رکھا ہی تھا کہ ایک تانگا ان کے دروازے کے سامنے آ کر رکا۔ اس میں ایک برقعہ پوش خاتون بیٹھی تھی ساتھ کچھ سامان تھا' دو تین ٹرنک' ایک اٹیچی کیس۔

حاجی صاحب ٹھہر گئے' ان کی صورت دیکھ کر اس خاتون نے چہرے سے نقاب اٹھا دی۔ اس کا سن تیس پینتیس برس سے کسی طرح کم نہ ہوگا مگر اس کے حسن میں ابھی تک غضب کی شادابی تھی۔

"میں بہار کی بہن گل ہوں" اس نے بڑی لجاجت سے کہنا شروع کیا۔ "دس سال ہوئے جیسے حضور نے میری بہن کو دین اور آخرت کی راہ دکھائی تھی ویسے ہی مجھ پر بھی کرم کی نظر ہو جائے......."

## قدرت اللہ شہاب

# تلاش

مایوس غم دیدہ بیزار..........گوراں فٹ پاتھ پر ہولے ہولے جارہی ہے۔ جانے دو۔ اس کا جسم اس کا اپنا جسم ہے۔ جس طرح میرا کوٹ میرا اپنا کوٹ ہے۔ میں اس کوٹ کو سنبھال کے رکھوں یا پھاڑ ڈالوں' خود پہنوں یا بیچ دوں یا کسی راہگیر کی جھولی میں ڈال دوں...... مجھے کون روک سکتا ہے۔ میں اپنے کوٹ کا مالک ہوں۔ گوراں اپنے جسم کی مالک ہے۔ شاید اگلے موڑ پر کوئی گزرتا ہوا راہرو اسے خرید لے گا۔ خریدنے دو' مجھے پشیمانی کا احساس بھی کیوں ہو؟ دنیا کا نظام کاروباری لین دین پر تو قائم ہے اور پھر گوراں کا جسم اس کا اپنا جسم ہے۔ اسے اختیار ہے کہ وہ جب چاہے اور جس قیمت پر چاہے اسے بیچ دے۔ اپنی چیز ہے۔ اپنی چیز پر سب قادر ہوتے ہیں۔ کوئی دوسرا اس میں ٹانگ کیوں اڑائے خواہ مخواہ!

سڑک پر بجلی کے کھمبوں کے نیچے روشنی کے بڑے بڑے دھبے ہیں۔ کھمبوں کے درمیان سنسان اندھیرا ہے۔ گوراں کی زندگی میں بھی تاریک اور اجلے سائے ہیں۔ وہ سڑک کے کالے اور سفید دھبوں کی طرح ساکن اور منجمد نہیں۔ زندگی کے سائے چلتے پھرتے نشان ہیں۔ تمتمائے ہوئے سورج کے سامنے آوارہ بدلیاں آ جائیں تو زمین پر ایک مدوّر سایہ چھا جاتا ہے۔ تھکا ہوا مسافر بے قراری سے اس کی طرف لپکتا ہے۔ بے وقوف آدمی! جوں جوں وہ سایا اس کے قریب آتا جائے گا' چھاؤں بکھیرنے والے ابر پارے اس سے دور ہوتے جائیں گے' مجھے اس کا تجربہ ہے۔ میں نے کہا" گوراں تم میری منزل ہو۔ مجھے اپنی منزل تک آنے دو۔"

گوراں نے کہا" آ جاؤ! میں بھی اپنی منزل کے لیے بھٹک رہی ہوں"۔ جوں جوں میں گوراں کی طرف بڑھتا گیا' میری منزل مجھ سے دور ہوتی گئی جیسے سراب کی طرف بھاگنے والا پیاسا مسافر بھاگتا جائے' بھاگتا جائے اور انجام کار پانی کی ٹھنڈی لہروں کی جگہ ریت کے گرم گرم تودوں میں اٹک کے رہ جائے۔ میں گوراں کی طرف بڑھتا گیا بڑھتا گیا اور جب میں نے گوراں کو قریب پالیا' وہ گوراں نہ تھی۔ وہ اس کا جسم تھا۔ خوب صورت' مرمریں' ستار کے تاروں کی طرح کسا ہوا' جھنجھناتا ہوا جسم۔ عورت کی کائنات اس کا

جسم ہی تو ہے۔ شاید گوراں کا مرمریں بدن سڑک کے اگلے موڑ پر بک گیا ہو۔ بکنے دو مجھے ہمدردی کا احساس بھی کیوں ہو؟ وہ اپنے خوب صورت جسم کی مالک ہے۔ بالکل مختار جیسے مجھے اپنے کوٹ پر اختیار ہے۔

ظہیر میری باتوں پر ہنستا ہے۔ وہ میرا پرانا یار ہے۔ ہم برسوں ہم جماعت رہے تھے۔ اب قسمت کی ستم ظریفی نے ہم دونوں کو ایک ہی دفتر میں اکٹھا کر دیا ہے۔ میں ساڑھے بارہ سو پاتا ہوں۔ ظہیر کی تنخواہ چالیس روپے ماہوار ہے۔ جب ہم کہیں اکیلے ہوتے ہیں تو وہ بے تکلفی سے میرے سر پر چانٹا مار کر گرجنے لگتا ہے۔

"اے او صاحب کے بچے! تم روز بروز سڑی ہوتے جا رہے ہو۔ تلاش، فرار، فلسفہ۔۔۔ میں کہتا ہوں سب بکواس ہے۔ تم کیا جانو 'عورت' کس چیز کا نام ہے؟ میری طرف دیکھو، جب میری جیب میں ساڑھے پانچ آنے کے پیسے ہوتے ہیں تو میں صبح سویرے سیدھا علم دین سبزی والے کی دکان پر پہنچتا ہوں آدھ سیر پالک لیتا ہوں ڈیڑھ پاؤ آلو دو پیسے کے ٹماٹر اور کسی کو یہ شکایت نہیں ہوتی کہ مجھے سبزی خریدنے کا ڈھنگ نہیں آتا! لیکن اگر کسی روز کوئی حرام زادہ ضرورت سے زیادہ مٹھی گرم کر دے اور میری جیب میں دو ایک روپے کھنکتے ہوں تو میں سبزی منڈی میں جا کے لٹک جاتا ہوں اور دل ہی دل میں سوچتا ہوں کہ علم دین کی دکان بھی کوئی دوکان ہے بھلا؟ باسی مال، سڑے ہوئے پتے، گندی ٹوکریاں، میں ہر بھدیال کی دکان پر جھانکتا ہوں۔ کرتار سنگھ کے خوب صورت سٹال کا جائزہ لیتا ہوں اور دل ہی دل میں گوبھی، مٹر، چقندر، سلاد اور انناس کے وٹامنز اے، بی، سی کا تجزیہ کرتا ہوں۔ لیکن حساب ٹھیک نہیں جمتا۔ کبھی وٹامنز کے اجزا میرے دو روپوں سے آگے نکل جاتے ہیں۔ کبھی میرے دو روپے وٹامنز کی قیمت پر بھاری نظر آتے ہیں۔ اسی ادھیڑ بن میں ساڑھے دس بج جاتے ہیں۔ میں جلدی جلدی کسی چھابڑی والے سے گلی سڑی سبزی تلوا کر بھاگم بھاگ واپس آتا ہوں۔ بیوی ناک بھوں چڑھاتی ہے۔ خالی پیٹ دفتر جاتا ہوں اور وہ حرام زادہ آفس سپرنٹنڈنٹ میرے لیٹ آنے پر آنکھیں نکالتا ہے۔۔۔۔ کیا سمجھے بیٹا؟۔۔۔۔۔ میرے چالیس روپوں پر دو لڑکیوں کے باپ رہتے۔ میں نے ایک کو پھانس لیا۔۔۔۔ تمہارے ساڑھے بارہ سو پر بہت سی لڑکیاں اور ان کی مائیں بھنبھنا رہی ہیں۔ دو ایک کو پھانسو اور عیش کرو۔۔۔۔ ورنہ لٹکے رہو گے بچے۔ جس طرح میں کرتار سنگھ کے سٹال پر لٹک جاتا ہوں۔۔۔۔۔"

ظہیر کی زبان پر عورت کا نام ایک لذیذ چٹخارے کی صورت میں آتا ہے۔ کالج کے دنوں میں اسے چاٹ کا شوق تھا۔ جب کبھی املی کے پانی سے بھرے ہوئے گول گپے منہ میں ڈالتا تھا۔ اس کے ہونٹوں سے چار چار انگل لمبی رال ٹپک پڑتی تھی اور وہ کسی خاموش لذت سے بلبلا اٹھتا۔۔۔ "ہائے ہائے کیا خستہ گول گپا

ہے۔۔۔۔جیسے مس کلیانی کے لال لال ہونٹ پگھل رہے ہوں۔"

چاٹ کے ہر تازہ لقمے کے ساتھ وہ اپنے کالج کی لڑکیوں کا کوئی نہ کوئی حسین حصہ نگل جاتا تھا۔ مس کلیانی کے ہونٹ' خالدہ کے دہکتے ہوئے گال' زرینہ کی حنائی انگلیاں۔۔۔ ظہیر کہتا ہے' عورت شہد کی مکھی ہے' وہ زندگی کے خشک اور بے کار چھتے میں رس بھرتی ہے۔ اس کے زہریلے ڈنک پر نہ جاؤ' اس کی رسیلی مٹھاس دیکھو۔ تم نے نیلما کو دیکھا ہے؟ اندر سین ڈسپیچر کی خوب صورت بیوی۔ وہ پاجی اسی دفتر میں گمنام سا امیدوار تھا' لیکن نیلم کی رعنائیوں نے دفتر کی شاہراہ پر رنگین جال بچھا دیئے۔ آفس کا ایک دل پھینک ناخدا زیر دام آ گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اندر چوبیں امیدواروں کے اوپر سے پھلانگتا ہوا ڈسپیچری کی کرسی سنبھال بیٹھا۔۔۔۔۔ ہائے عورت کی نگاہ؟ میرے بھائی! اس کی نگاہ سے زنجیریں کٹ جاتی ہیں' تقدیریں بدل جاتی ہیں۔ نگاہ مرد مومن کی تلاش کون کرے' ذوق یقین کا سودائی کون ہے۔ دنیا ہے تو عورت کی گود میں' عقبیٰ ہے تو اس کی مسکراہٹ میں۔ میں دیکھتا ہوں کہ اب اندرسین ہیڈ کلرکی کے خواب دیکھ رہا ہے' نیلما کی بلوری گردن میں اب پھر لطیف خم پیدا ہو رہے ہیں۔ خدا کی قسم تم اس سنہری گرداب میں بے تکلف کود جاؤ۔ ایک بیچاری ہیڈ کلرکی کیا چیز ہے؟ تم میری مانو تو اس مرمریں گردن کے ایک حلقے پر ساری کائنات اندر سین کو سونپ دو۔۔۔۔۔ ہائے کیا لوچ ہے ظالم کی گردن میں۔ جیسے عمر خیام کی رباعی تھرک تھرک کر ناچ رہی ہو۔۔۔۔۔"

ظہیر میں ایک یہی بڑا عیب ہے وہ عورت میں عورت کو نہیں دیکھتا' وہ عورت میں اس کا جسم ٹٹولتا ہے اور پھر جسم میں بلوری گردنوں' ناچتی ہوئی آنکھوں اور دھڑکتے ہوئے سینوں کا جائزہ لیتا ہے۔ اسی پر بس نہیں' وہ جسم کی ہر رعنائی' حسن کے ہر پیچ' سینے کے ہر نشیب و فراز کو بیوپاری نظر سے ناپ تول کر ان پر قیمتوں کے لیبل لگا دیتا ہے۔ نیلما کے گردن کے خم کی قیمت میرے دفتر کی ہیڈ کلرکی ہے۔ صادقہ اس کی بیوی ہے' لیکن ظہیر کہتا ہے کہ صادقہ کی گھنی اور گھنگھریالی زلفوں کی قیمت چالیس روپے ماہوار ہے۔

چنانچہ پہلی تاریخ کو وہ اپنی ساری تنخواہ صادقہ کی جھولی میں ڈال دیتا ہے۔ جب کبھی دفتر میں اس کی مٹھی معمول سے زیادہ گرم ہو جائے تو وہ اپنا غبار ہلکا کرنے کے لیے چھمی جان یا گلزار بیگم یا رتنا بائی کے کوٹھے میں پناہ لیتا ہے۔ چھمی جان تین روپے۔۔۔ گلزار بیگم پانچ روپے۔۔۔۔ رتنا بائی دس روپے۔۔۔۔ کیونکہ اس کے بائیں گال پر ایک ننھا سا تل ہے اور اس کے عنابی ہونٹوں میں پکے ہوئے انگوروں کا رس چھلکتا ہے۔ ایک دن وہ گوراں کے چوبارے میں گیا۔ اس کی جیب آسودہ تھی' اس نے ایک ایک روپے کے بیس نوٹ گوراں کے سامنے بچھا دیئے۔

گوراں نے کہا" آپ یہ نوٹ اپنے ہی پاس رکھیں۔ آپ میری قیمت نہیں دے سکتے"

ظہیر نے سوچا وہ بن رہی ہے۔ اس نے گوراں کو اسی قیمت پر چکایا تھا۔ اس نے اپنا بٹوہ نکال کر ہوا میں اچھالا اور فخر سے بولا" مانگو کیا مانگتی ہو جان تمنا۔ آج تمہارا ظہیر خوشحال ہے۔"

گوراں نے ایک تھکی ہوئی انگڑائی لی" ظہیر صاحب' میں روز روپیہ کماتی ہوں' آپ روز روپیہ لٹاتے ہیں۔ لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ آج ایک لمحہ کے لیے آپ مجھے گوراں نہ سمجھیں ایک عورت سمجھیں۔۔۔۔ ایک لمحہ کے لیے' آپ گاہک نہ بنیں ایک مرد بن جائیں۔ بس ایک دو بے لوث لمحے میری حیات کو جاوید کر دیں گے۔"

ظہیر ہنسنے لگا۔ وہ الو کا پٹھا کچھ بھی نہ سمجھ سکا۔ وہ گوراں کے کھوئے کھوئے اضطراب کو سراہتا رہا۔ اس نے زبردستی اسے بیس روپے دیے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ازل سے گوراں کی تعمیر میرے لیے ہوئی تھی۔ کائنات میں اس کا وجود میرے وجود کا عکس تھا۔ لیکن جب ہم ملے تو ہمارے درمیان ایک وسیع اور بھیانک خلا منہ پھاڑے کھڑا تھا۔

وہ اپنے چھبیسویں سال میں ہے۔ پچھلے تیرہ برس سے وہ ہر روز بکری کے گوشت کی طرح ترازو میں تل تل کر بکتی رہی ہے۔ سینکڑوں' ہزاروں انسان اپنی پشت ہا پشت کی کیچڑ اس پر اچھال چکے ہیں۔ بنی نوع انسان کی صدیوں کا سیہ کار زہر گوراں کی رگ رگ میں سمویا ہوا ہے۔ ایک قاتل بیماری کے انگارے اس کے خون میں چٹک رہے ہیں۔ اس کی گلاب کی پتیوں جیسی ملائم اور مشک بار جلد کے نیچے بڑے بڑے گھاؤ ہیں۔ لیکن وہ کہتی ہے کہ محبت کے دو بے لوث لمحے' اس کی حیات کو جاوید کر دیں گے۔ میں نے کہا" گوراں! اگر تو کائنات کے آخری کنارے پر بھی ہوتی' تو میں ارض و سما کی وسعتیں پھاند کر تیرے پاس پہنچ جاتا۔"

اس کا جسم بے داغ جسم نہیں۔ اس کا جسم پامال جسم ہے۔ پھول کی طرح پامال نہیں جو پاؤں کے ایک ہی دباؤ سے ٹوٹ کر مرجھا جاتا ہے بلکہ سڑک کی طرح جس کی چھاتی پر بھک بھک کرتا ہوا اسٹیم رولر ادھر سے اُدھر اُدھر سے اِدھر ریلتا جائے' پیدل چلنے والے جوتیاں چٹخاتے گزرتے جائیں۔ ٹم ٹم اور تانگے چیخ چیخ کرتے نکلتے جائیں' موٹریں گرد اڑاتی بھاگتی جائیں' سڑک گھستی جائے' پتھر ٹوٹتے جائیں' لیکن گذرنے والے گزرتے رہیں' چلنے والے چلتے رہیں اور پھر میونسپلٹی کا اسٹیم رولر بھک بھک کرتا ہوا آئے۔۔۔۔۔

گوراں میں یہ بات تھی کہ وہ اپنے خوبصورت جسم کو میونسپل کمیٹی کی پختہ سڑک کی طرح بچھا کر آپ ایک طرف کھڑی ہو جاتی تھی۔ پیدل چلنے والوں کی طرح' تھکے ہوئے کلرک' موٹر کی طرح سبک رفتار چھوکرے' اسٹیم رولر کی طرح بھبکتے ہوئے موٹے سیٹھ۔۔۔۔۔ یہ آئے وہ گئے! یہ گرے وہ پھسلے! یہ بیٹھے وہ بھاگے

۔۔۔اور گوراں کنارے کھڑی مسکراتی رہتی تھی۔ گوراں اور گوراں کے جسم کے درمیان ایک زبردست دیوار چین حائل تھی۔ اس دیوار کی بنیاد ایک ننھی سی آرزو پر قائم تھی۔ وہ آرزو دُنیا کے خزانوں سے موتی یا ہیرے یا ریشم کے انبار نہیں مانگتی۔ وہ زندگی کے نام پر دو بے لوث لمحوں کی خیرات چاہتی تھی۔ دو چھوٹے چھوٹے دھڑکتے ہوئے لمحوں کی خیرات چاہتی تھی۔ دو چھوٹے چھوٹے دھڑکتے ہوئے لمحے جو اس کی کھرڑ کھرڑ چلتی ہوئی پن چکی کو جاودانی سکون دے سکتے تھے۔۔۔۔۔۔۔

ظہیر کہتا ہے" عورت شہد کی مکھی ہے۔ وہ زندگی کے خشک اور بے کار چھتے میں رس ٹپکاتی ہے۔" ظہیر بکتا ہے' وہ رتنا بائی کے ہونٹوں کی مٹھاس پر اپنا فلسفہ جماتا ہے۔ صادقہ کی موسیقار آنکھوں سے اپنے مقولے چراتا ہے' سکو رکیبں کا ان دو سوتیلی بہنوں کے سستے ایثار نے اس کو اندھا کر دیا ہے۔ اور وہ ایسی مکھیوں کے چھتے نہیں دیکھ سکتا جو رس دیتی ہیں' رس لیتی ہیں' رس چوستی ہیں' رس چراتی ہیں۔۔۔۔۔۔۔ بیگم ستار کی طرح جو بھری محفل میں اپنی جوان چھوکری کو ننگا کر کے بٹھا دیتی ہے' " آ بیٹا' میری ثروت سے ملو' ثروت بڑی شرمیلی لڑکی ہے" اور پھر وہ قینچی کی طرح چلتی ہوئی زبان' اشاروں ہی اشاروں میں شرمیلی ثروت کی ریشمی ساڑھی اور چنا باؤز اتار کر رکھ دیتی ہے۔ یہ ثروت کی صراحی دار گردن ہے۔ یہ ہے ثروت کے مرمریں پستان' یہ ہے ثروت کی لچکیلی کمر۔۔۔۔۔ کوئی دل ہی دل میں بول دیتا ہے شرمیلی ثروت' ایک شرمیلی ثروت دو شرمیلی ثروت تین۔۔۔۔۔ قیمت ساڑھے بارہ سو روپے ماہوار۔۔۔۔۔ گوراں بھی یوں ہی بکتی آئی ہے۔ لیکن گوراں کا نام سنتے ہی بیگم ستار کو غش آ جائے گا' حاجی عثمان کی بھنویں تن جائیں گی' ڈاکٹر رحیم کے ہونٹ بھنچ جائیں گے اور غالباً انہیں وہ امید افزا لمحے بھی یاد نہ رہیں گے جب وہ انشورنس پالیسی بیچنے والوں کی طرح شادی کا بیمہ کر کے اپنی لاڈلی بیٹیوں کو مکلف شبستانوں کے اندر دھکیل دیتے ہیں۔ ثروت' مجیدہ' زہرہ' خورشید' نجمی' عفت۔۔۔۔۔۔ سب خوش گوار لڑکیاں ہیں' حسین' بے حد حسین ستاروں کے جھرمٹ کی طرح' جو نیلے آسمان کے درمیان جگمگا رہے ہوں۔ ان کے مہکتے ہوئے لچکیلے جسم۔۔۔۔۔۔ اوہ میرے خدایا! ان کے مہکتے ہوئے لچکیلے جسموں میں چاند' سورج اور کہکشاں نے اپنا سرمایہ لٹا کر رکھ دیا ہے۔ ان کی نشیلی اور بلیغ آنکھوں میں بڑے بڑے خوش آئند پیام جھلکتے ہیں۔ لیکن ان کی تمناؤں کی معراج مستقبل کے سہانے سپنوں میں ہے۔ وہ آنے والی کل کا انتظار کر رہی ہیں۔ کیونکہ انہیں اپنے ہوشربا حسن کا خراج وصول کرنا ہے۔ آراستہ بنگلے' چمکیلی کاریں' بھڑکیلے لباس۔ میں ڈرتا ہوں کہ شاید وہ اپنے مصروف لمحوں میں سے ایک بے لوث لمحے کی زکوٰۃ دے سکیں گی۔

میں نے ظہیر کی خوشامد کی کہ " دوست! تم گوراں کی زندگی کو جاوید نہیں کر سکتے۔ خدا کے لیے اسے

میرے پاس لے آؤ۔ دنیا کی ساری آبادی میں ایک وہ میری مقدس امانت ہے" مقدس؟ ارے توبہ توبہ!" ظہیر کانوں کو ہاتھ لگاتا ہے۔" تم نہیں جانتے گوراں کو اس کے جسم میں اتنے اتنے لمبے جراثیم ہیں۔ گلتے ہوئے زہریلے مہلک کیڑے۔۔۔۔۔۔۔تم مقدس کہتے ہو اس سڑتی ہوئی لاش کو۔۔۔۔۔"

میں نے دونوں ہاتھ جوڑ کر ظہیر کے منہ پر زور کا تھپڑ مارا۔ اس کے نچلے جبڑے کا ایک دانت کٹاک سے ٹوٹ کر قالین پر جا گرا۔ ظہیر نے گرم گرم سرخ سرخ خون کی ایک کلی غٹ سے نگل لی۔۔۔۔۔۔۔ اور اگلے روز گوراں کو لے کر آیا۔ وہ آئی جھجکتی ہوئی' ہچکچاتی ہوئی' لجائی لجائی سی' جیسے زندگی کے طوفان میں کہیں دور افقی لکیر پر ایک روشنی کا مینارہ آہستہ آہستہ ابھر رہا ہو۔

ایک دن میں نے کہا" گوراں' تمہارا چوبارہ تمہیں زیب نہیں دیتا۔ تم اپنے بالا خانے کے پٹ مقفل کر دو۔"

گوراں حیران سی ہو گئی۔ اس کے خوش نما ہونٹ تعجب سے کھل گئے۔" کیوں" وہ بولی

میں نے کہا۔" گوراں' تمہارا وجود معمولی سطحوں سے بہت بلند ہے۔ تم بالا خانے کی کھڑکی میں بیٹھنے والی گوراں نہیں ہو۔ تم کسی کے خوابوں میں بسنے والی عروسانہ تخیل ہو۔ اگلے مہینے ہم دونوں نیلگری کی شاداب پہاڑیوں پر جانے والے ہیں۔ میں تم کو کوہ نور کے سینی ٹوریم میں داخل کروا دوں گا۔ سینی ٹوریم کا بڈھا سپر نٹنڈنٹ میرا دوست ہے۔ وہ تمہارے خون کے قطرے قطرے کو زہریلی چنگاریوں سے پاک کر دے گا۔ تمہاری نس نس میں جو دہکتے ہوئے گھاؤ ہیں وہ بھر جائیں گے۔ تمہارے جیون کو جو گھن کھا رہا ہے' وہ مٹ جائے گا۔۔۔۔۔۔"

" تم سچ کہتے ہو" گوراں نے کہا" لیکن میں تمہارے ساتھ نہیں جا سکتی۔ میرے بالا خانے کے پٹ میری روزی کا راستہ ہیں۔ میں انہیں کیسے بند کر سکتی ہوں بھلا؟"

مجھے گوراں کی جہالت پر غصہ آ گیا۔ میں نے اس کی گھنی زلفوں کا گچھا بنا کر اس کے منہ پر بہت سے کوڑے مارے۔" تم اپنے بالا خانے سے اپنی روزی کا سہارا نہ لو' گوراں کیا تم سچ مچ سمجھتی ہو کہ میں ساڑھے بارہ سو مہینہ صرف اپنے لیے کما رہا ہوں؟"۔

گوراں کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اس کی آنکھوں میں تیز تیز شعاعیں پھیلیں اور بکھر گئیں۔ اس کا اوپر والا دانت کھچ سے نچلے ہونٹ میں دھنس گیا اور پھر یکا یک دو چار وحشی جھٹکوں کے ساتھ اس نے اپنی آخری ساڑھی کو تار تار کر کے رکھ دیا۔ پلک جھپکتے میں میرے سامنے گوراں ننگی تھی اس کا جسم تھا' خوب صورت' مرمریں ستار کے تاروں کی طرح کسا ہوا' جھنجھناتا ہوا جسم۔

"تم میرے سب سے بڑے گاہک ہو۔" وہ میرے ساتھ لپٹ کر مجھے ہاتھوں سے نوچنے لگی۔

"گوراں کی قیمت میں نکے رات تھی۔ تم اسے ساڑھے بارہ سو میں پر پچکار رہے ہو۔ تم میرے سب سے بڑے گاہک ہو۔ مجھے اپنا شکریہ ادا کرنے دو۔" اس کے لانبے لانبے سرخ ناخن کئی جگہ میرے جسم میں کھب گئے۔ ایک خون آشام نظر اس نے چاروں طرف دوڑائی۔ میز کے اگالدان کو اٹھا کر زور سے پٹخ دیا۔ اپنی ساڑھی کے الجھے ہوئے ٹکڑوں کو سمیٹا اور آہستہ آہستہ چلی گئی۔ جیسے دور سے جھلکنے والا روشنی کا مینار سمندر کی لہروں میں تحلیل ہو جائے۔ گوراں کی سسکیوں میں لپٹی ہوئی ایک آواز رو رہی تھی۔ "تم میرے سب سے بڑے خریدار ہو تم بھی مجھے زندگی کا ایک بے لوث لمحہ نہ دے سکے۔ تم میرے سب سے بڑے خریدار ہو تم بھی مجھے زندگی کا ایک بے لوث لمحہ نہ دے سکے۔"

مایوس، غم دیدہ، بیزار گوراں، فٹ پاتھ پر ہولے ہولے جا رہی ہے، جانے دو۔ وہ اپنے جسم کی مالک ہے۔ شاید اگلے موڑ پر کوئی گزرتا ہوا راہ رو اسے خرید لے گا۔۔۔۔۔۔ خریدنے دو، مجھے اس پر کوئی اختیار تو نہیں۔۔۔۔۔۔۔

کرشن چندر

# ایک طوائف کا خط

## پنڈت جواہر لال نہرو اور قائداعظم جناح کے نام

مجھے امید ہے کہ اس سے پہلے آپ کو کسی طوائف کا خط نہ ملا ہوگا۔ یہ بھی امید کرتی ہوں کہ آج تک آپ نے میری اور اس قماش کی دوسری عورتوں کی صورت بھی نہ دیکھی ہوگی۔ یہ بھی جانتی ہوں کہ آپ کو میرا خط لکھنا کس قدر معیوب ہے اور وہ بھی ایسا کھلا خط۔ مگر کیا کروں۔ حالات کچھ ایسے ہیں اور ان دونوں لڑکیوں کا تقاضا اتنا شدید ہے کہ میں یہ خط لکھے بغیر نہیں رہ سکتی۔ یہ خط میں نہیں لکھ رہی ہوں۔ یہ خط مجھ سے بیلا اور بتول لکھوا رہی ہیں اس لیے مجھے معاف کیجئے گا۔ ایک گری ہوئی عورت آپکو اس بے باکی سے خط لکھ رہی ہے۔ میں صدق دل سے معافی چاہتی ہوں۔ اگر میرے خط میں کوئی فقرہ آپ کو ناگوار گزرے۔ اسے میری مجبوری پر محمول کیجئے گا۔

بیلا اور بتول مجھ سے یہ خط کیوں لکھوا رہی ہیں۔ یہ دونوں لڑکیاں کون ہیں اور ان کا تقاضہ اس قدر شدید کیوں ہے۔ یہ سب کچھ بتانے سے پہلے میں آپکو اپنے متعلق کچھ بتانا چاہتی ہوں۔ گھبرائیے نہیں۔ میں آپ کو اپنی گھناؤنی زندگی کی تاریخ سے آگاہ نہیں کرنا چاہتی۔ میں یہ بھی نہیں بتاؤں گی کہ میں کب اور کن حالات میں طوائف بنی۔ میں کسی شریفانہ جذبے کا سہارا لے کر آپ سے کسی جھوٹے رحم کی درخواست کرنے نہیں آئی ہوں۔ میں آپ کے دردمند دل کو پہچان کر اپنی صفائی میں جھوٹا افسانہ محبت نہیں گھڑنا چاہتی۔ اس خط کے لکھنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ کو طوائفیت کے اسرار و رموز سے آگاہ کروں۔ مجھے اپنی صفائی میں کچھ نہیں کہنا ہے۔ میں صرف اپنے متعلق چند ایسی باتیں بتانا چاہتی ہوں جن کا آگے چل کر بیلا اور بتول کی زندگی پر اثر پڑ سکتا ہے۔

آپ لوگ کئی بار بمبئی آئے ہوں گے۔ جناح صاحب نے تو بمبئی کو بہت دیکھا ہے۔ مگر آپ

نے ہمارا بازار کا ہے کو دیکھا ہوگا۔ جس بازار میں میں رہتی ہوں۔ وہ فارس روڈ کہلاتا ہے۔ فارس روڈ گرانٹ روڈ اور مدن پورہ کے بیچ میں واقع ہے۔ گرانٹ روڈ کے اس پار لمنگٹن روڈ اور اوپیرا ہاؤس اور چوپاٹی۔ میرین ڈرائیو اور فورٹ کے علاقے ہیں جہاں بمبئی کے شرفا رہتے ہیں۔ مدن پورہ میں اس طرف غریبوں کی بستی ہے۔ فارس روڈ ان دونوں کے بیچ میں ہے تاکہ امیر اور غریب اس سے یکساں مستفید ہو سکیں۔ گو فارس روڈ پھر بھی مدن پورہ کے زیادہ قریب ہے کیونکہ نادار ی میں اور طوائفیت میں ہمیشہ بہت کم فاصلہ رہتا ہے۔

یہ بازار بہت خوبصورت نہیں ہے۔ اس کے مکین بھی خوبصورت نہیں ہیں۔ اس کے بیچوں بیچ ٹرام کی گڑگڑاہٹ شب و روز جاری رہتی ہے جہاں بھر کے آوارہ کتے اور لونڈے اور شہدے اور بے کار اور جرائم پیشہ مخلوق اس کی گلیوں کا طواف کرتی نظر آتی ہے۔ لنگڑے لولے اوباش مدقوق تماش بین آتشک و سوزاک کے مارے ہوئے کانے گنجے کوکین باز اور جیب کترے اس بازار میں سینہ تان کر چلتے ہیں۔ غلیظ ہوٹل میلے ہوئے فٹ پاتھ پر میلے کے ڈھیروں پر بھنبھناتی ہوئی لاکھوں مکھیاں لکڑیوں اور کوئلوں کے افسردہ گودام پیشہ ور دلال اور باسی ہار بیچنے والے سینما کی تصویروں کی گلی سڑی کتابیں بیچنے والے کوک شاستر اور ننگی تصویروں کے دکاندار چینی حجام اور اسلامی حجام اور لنگوٹے کس کر گالیاں بکنے والے پہلوان ہماری سماجی زندگی کا سارا کوڑا کرکٹ آپ کو فارس روڈ پر ملتا ہے۔ ظاہر ہے آپ یہاں کیوں آئیں گے۔ کوئی شریف آدمی ادھر کا رخ نہیں کرتا۔ شریف آدمی جتنے ہیں وہ سب گرانٹ روڈ کے اس پار رہتے ہیں اور جو بہت ہی شریف ہیں وہ ملبار ہل پر قیام کرتے ہیں۔ میں ایک بار جناح صاحب کی کوٹھی کے سامنے سے گزری تھی اور وہاں میں نے جھک کر سلام بھی کیا تھا۔ بتول بھی میرے ساتھ تھی۔ بتول کو آپ سے (جناح صاحب) جس قدر عقیدت ہے اس کو میں کبھی ٹھیک طرح سے بیان نہ کر سکوں گی۔ خدا اور رسول کے بعد دنیا میں وہ اگر کسی کو چاہتی ہے تو وہ صرف آپ ہیں۔ اس نے آپ کی تصویر لاکٹ میں لگا کر اپنے سینے سے لگا رکھی ہے۔ کسی بری نیت سے نہیں۔ بتول کی عمر ابھی گیارہ برس کی ہے۔ چھوٹی سی لڑکی ہی تو ہے وہ۔ گو فارس روڈ والے ابھی سے اس کے متعلق بڑے بڑے ارادے کر رہے ہیں مگر خیر وہ کبھی پھر آپ کو بتاؤں گی۔

تو یہ ہے فارس روڈ جہاں میں رہتی ہوں۔ فارس روڈ کے مغربی سرے پر جہاں چینی حجام کی دکان ہے۔ اس کے قریب ایک اندھیری گلی کے موڑ پر میری دکان ہے لوگ تو اسے دکان نہیں کہتے۔

مگر خیر آپ دانا ہیں آپ سے کیا چھپاؤں گی۔ یہی کہوں گی۔ وہاں پر میری دکان ہے اور وہاں پر میں اسی طرح بیوپار کرتی ہوں جس طرح بنیا' سبزی والا' پھل والا' ہوٹل والا' موٹر والا' سینما والا' کپڑے والا یا کوئی اور دکان دار بیوپار کرتا ہے۔ اور ہر بیوپار میں گاہک کو خوش کرنے کے علاوہ اپنے فائدہ کی بھی سوچتا ہے۔ میرا

بیوپار بھی اسی طرح کا ہے فرق صرف اتنا ہے کہ میں بلیک مارکیٹ نہیں کرتی اور مجھ میں اور دوسرے بیوپاریوں میں کوئی فرق نہیں۔

یہ دکان اچھی جگہ پر واقع نہیں ہے یہاں رات تو کجا دن کو بھی لوگ ٹھوکر کھا جاتے ہیں۔ اس اندھیری گلی میں لوگ اپنی جیبیں خالی کر کے جاتے ہیں۔ شراب پی کر آتے کرتے ہیں۔ جہان بھر کی گالیاں بکتے ہیں۔ یہاں بات بات پر چھرا زنی ہوتی ہے۔ دو ایک خون دوسرے تیسرے روز ہوتے رہتے ہیں۔ غرضیکہ ہر وقت جان تنگی میں رہتی ہے اور بھر میں کوئی بہت اچھی طوائف نہیں ہوں کہ پونہ پلی پر جا کے رہوں یا ورلی پر سمندر کے کنارے ایک کوٹھی لے سکوں۔ میں ایک بہت ہی معمولی درجے کی طوائف ہوں اور گو میں نے سارا ہندوستان دیکھا ہے اور گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے اور ہر طرح کے لوگوں کی صحبت میں بیٹھی ہوں۔ لیکن اب دس سال سے اسی شہر بمبئی میں اسی فارس روڈ پر اسی دکان میں بیٹھی ہوں اور اب تو مجھے اس دکان کی پگڑی بھی چھ ہزار روپے تک ملتی ہے۔ حالانکہ یہ جگہ کوئی اتنی اچھی نہیں۔ فضا متعفن ہے۔ کیچڑ چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے گندگی کے انبار لگے ہیں اور خارش زدہ کتے گھبرائے ہوئے گاہکوں کی طرف کاٹ کھانے کو لپکتے ہیں پھر بھی مجھے اس جگہ کی پگڑی چھ ہزار روپے تک ملتی ہے۔

اس جگہ میری دکان ایک منزلہ مکان میں ہے اس کے دو کمرے ہیں۔ سامنے کا کمرہ میری بیٹھک ہے۔ یہاں میں گاتی ہوں ناچتی ہوں' گاہکوں کو رجھاتی ہوں' پیچھے کا کمرہ باورچی خانے اور غسل خانے اور سونے کے کمرے کا کام دیتا ہے۔ یہاں ایک طرف نل ہے۔ ایک طرف ہنڈیا ہے اور ایک طرف ایک بڑا سا پلنگ ہے جس کے نیچے ایک اور چھوٹا سا پلنگ ہے اور اس کے نیچے میرے کپڑوں کے صندوق ہیں' باہر والے کمرے میں بجلی کی روشنی ہے لیکن اندر والے کمرے میں بالکل اندھیرا ہے' مالک مکان نے برسوں سے قلعی نہیں کرائی' نہ وہ کرائے گا۔ اتنی فرصت کسے ہے میں تو رات بھر ناچتی گاتی ہوں اور دن کو وہیں گاؤ تکیے سے سر ٹیک کر سو جاتی ہوں۔ بیلا اور بتول کو پیچھے کا کمرہ دے رکھا ہے۔ اکثر گاہک جب اس طرف منہ ہاتھ دھونے کے لیے جاتے ہیں تو بیلا اور بتول پھٹی پھٹی نگاہوں سے انھیں دیکھنے لگ جاتی ہیں۔ جو کچھ ان کی نگاہیں کہتی ہیں میرا یہ خط بھی کہتا ہے۔ اگر وہ میرے پاس اس وقت نہ ہوتیں تو یہ گناہگار بندی آپ کی خدمت میں یہ گستاخی نہ کرتی۔ جانتی ہوں دنیا مجھ پر تھو تھو کرے گی۔ جانتی ہوں شاید آپ تک میرا یہ خط بھی نہ پہنچے گا پھر بھی مجبور ہوں۔ یہ خط لکھ کے ہی رہوں گی کہ بیلا اور بتول کی مرضی یہی ہے۔

شاید آپ قیاس کر رہے ہوں گے کہ بیلا اور بتول میری لڑکیاں ہیں نہیں یہ غلط ہے۔ میری کوئی لڑکی نہیں ہے۔ ان دونوں لڑکیوں کو میں نے بازار سے خریدا ہے۔ جن دنوں ہندو مسلم فساد زوروں پر تھا اور

گرانٹ روڈ اور فارس روڈ اور مدن پورہ پر انسانی خون پانی کی طرح بہایا جارہا تھا۔ ان دنوں میں نے بیلا کو ایک مسلمان دلال سے تین سو روپے کے عوض خریدا تھا۔ یہ مسلمان دلال اس لڑکی کو دہلی سے لایا تھا۔ جہاں اسے ایک اور مسلمان دلال راولپنڈی سے لایا تھا۔ جہاں بیلا کے ماں باپ رہتے تھے۔ بیلا کے ماں باپ راولپنڈی میں راجہ بازار کے عقب میں پونچھ ہاؤس کے سامنے کی گلی میں رہتے تھے' متوسط طبقے کا گھرانہ تھا' شرافت اور سادگی گھٹی میں پڑی تھی۔ بیلا اپنے ماں باپ کی اکلوتی بیٹی تھی اور جب راولپنڈی میں مسلمانوں نے ہندوکو تہ تیغ کرنا شروع کیا اس اس وقت چوتھی جماعت میں پڑھتی تھی۔ یہ بارہ جولائی کا واقعہ ہے بیلا اپنے اسکول سے پڑھ کے گھر آ رہی تھی کہ اس نے اپنے گھر کے سامنے اور دوسرے ہندوؤں کے گھروں کے سامنے ایک جم غفیر دیکھا۔ یہ لوگ مسلح تھے اور گھروں کو آگ لگا رہے تھے اور لوگوں کو اور ان کے بچوں کو اور ان کی عورتوں کو گھر سے باہر نکال کر انہیں قتل کر رہے تھے۔ ساتھ ساتھ اللہ اکبر کا نعرہ بھی بلند کرتے جاتے تھے۔ بیلا نے اپنی آنکھوں سے اپنے باپ کو قتل ہوتے ہوئے دیکھا۔ پھر اس نے اپنی آنکھوں سے اپنی ماں کو دم توڑتے ہوئے دیکھا۔ وحشی مسلمانوں نے اس کے پستان کاٹ کے پھینک دیئے تھے' وہ پستان جن سے ایک ماں' کوئی ماں' ہندو ماں یا مسلمان ماں' عیسائی ماں یا یہودی ماں۔ اپنے بچے کو دودھ پلاتی ہے اور انسانوں کی زندگی میں اور کائنات کی وسعت میں تخلیق کا ایک نیا باب کھولتی ہے۔ وہ دودھ بھرے پستان اللہ اکبر کے نعروں کے ساتھ کاٹ ڈالے گئے۔ کسی نے تخلیق کے ساتھ اتنا ظلم کیا تھا کسی ظالم اندھیرے نے ان کی روحوں میں یہ سیاہی بھر دی تھی۔ میں نے قرآن پڑھا ہے اور میں جانتی ہوں کہ راولپنڈی میں بیلا کے ماں باپ کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ اسلام نہیں تھا۔ وہ انسانیت نہ تھی۔ وہ دشمنی بھی نہ تھی۔ وہ انتقام بھی نہ تھا۔ وہ ایک ایسی شقاوت' بے رحمی' بزدلی اور شیطنت تھی جو تاریکی کے سینے سے پھوٹتی ہے اور نور کی آخری کرن کو بھی داغدار کر جاتی ہے۔

بیلا اب میرے پاس ہے۔ مجھ سے پہلے وہ داڑھی والے مسلمان دلال کے پاس تھی اور اس سے پہلے وہ دہلی والے مسلمان دلال کے پاس تھی۔ بیلا کی عمر بارہ سال سے زیادہ نہیں تھی جب وہ چوتھی میں پڑھتی تھی اپنے گھر میں ہوتی تو آج پانچویں جماعت میں داخل ہو رہی ہوتی۔ پھر بڑی ہوتی تو اس کے ماں باپ اس کا بیاہ کسی شریف گھرانے کے غریب سے لڑکے سے کر دیتے۔ وہ اپنا چھوٹا سا گھر بساتی۔ اپنے خاوند سے' اپنے ننھے ننھے بچوں سے۔ اپنی گھریلو زندگی کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں سے۔ لیکن اس نازک سی کلی کو بے وقت خزاں آ گئی۔ اب بیلا بارہ برس کی نہیں معلوم ہوتی۔ اس کی عمر تھوڑی ہے لیکن اس کی زندگی بہت بوڑھی ہے۔ اس کی آنکھوں میں جو ڈر ہے' انسانیت کی جو تلخی ہے یاس کا جو لہو ہے' موت کی جو پیاس ہے' قائداعظم

صاحب شاید اگر آپ اسے دیکھ سکیں تو اس کا اندازہ کر سکیں۔ ان بے آسرا آنکھوں کی گہرائیوں میں اتر سکیں۔ آپ تو شریف آدمی ہیں۔ آپ نے شریف گھرانوں کی معصوم لڑکیوں کو دیکھا ہوگا۔ ہندو لڑکیوں کو، مسلمان لڑکیوں کو، شاید آپ سمجھ جاتے کہ معصومیت کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ وہ ساری انسانیت کی امانت ہے۔ ساری دنیا کی میراث ہے جو اسے مٹاتا ہے اسے دنیا کے کسی مذہب کا کوئی خدا معاف نہیں کر سکتا۔

بتول اور بیلا دونوں سگی بہنوں کی طرح میرے ہاں رہتی ہیں۔ بتول اور بیلا سگی بہنیں نہیں ہیں۔ بتول مسلمان لڑکی ہے۔ بیلا نے ہندو گھر میں جنم لیا ہے۔ آج دونوں فارس روڈ پر ایک رنڈی کے گھر میں بیٹھی ہیں۔ اگر بیلا راولپنڈی سے آئی ہے تو بتول جالندھر کے ایک گاؤں کھیم کرن کے ایک پٹھان کی بیٹھی ہے۔ بتول کے باپ کی سات بیٹیاں تھیں۔ تین شادی شدہ اور چار کنواریاں۔ بتول کا باپ کھیم کرن میں ایک معمولی کاشتکار تھا۔ غریب پٹھان لیکن غیور پٹھان جو صدیوں سے کھیم کرن میں آ کر بس گیا تھا۔ جاٹوں کے اس گاؤں میں یہی تین چار گھر پٹھانوں کے تھے۔ یہ لوگ جس حلم و آشتی سے رہتے تھے شاید اس کا اندازہ پنڈت جی آپ کو اس امر سے ہوگا کہ مسلمان ہونے پر بھی ان لوگوں کو اپنے گاؤں میں مسجد بنانے کی اجازت نہ تھی۔ یہ لوگ گھر میں چپ چاپ اپنی نماز ادا کرتے، صدیوں سے جب سے مہاراجہ رنجیت سنگھ نے عنان حکومت سنبھالی تھی کسی مومن نے اس گاؤں میں اذان نہ دی تھی، ان کا دل عرفان سے روشن تھا لیکن دنیاوی مجبوریاں اس قدر شدید تھیں اور پھر رواداری کا خیال اس قدر غالب تھا کہ لب وا کرنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔

بتول اپنے باپ کی چہیتی لڑکی تھی۔ ساتوں میں سب سے چھوٹی، سب سے پیاری، سب سے حسین۔ بتول اس قدر حسین ہے کہ ہاتھ لگانے سے میلی ہوتی ہے۔ پنڈت جی آپ تو خود کشمیری النسل ہیں اور فن کار ہو کر یہ بھی جانتے ہیں کہ خوبصورتی کسے کہتے ہیں۔ یہ خوبصورتی آج میری گندگی کے ڈھیر میں گڈمڈ ہو کر اس طرح پڑی ہے کہ اس کی پرکھ کرنے والا کوئی شریف آدمی اب مشکل سے ملے گا۔ اس گندگی میں گلے سڑے مارواڑی، گھنی مونچھوں والے ٹھیکیدار، ناپاک نگاہوں والے چور بازاری ہی نظر آتے ہیں۔ بتول بالکل ان پڑھ ہے اس نے صرف جناح صاحب کا نام سنا تھا۔ پاکستان کے نعرے لگائے تھے۔ جیسے تین چار برس کے ننھے بچے گھر میں ''انکلاب جندہ باد'' کرتے پھرتے ہیں۔ گیارہ برس ہی کی تو وہ ہے۔

ان پڑھ بتول۔ وہ چند دن ہی ہوئے میرے پاس آئی ہے۔ ایک ہندو دلال اسے میرے پاس لایا تھا۔ میں نے اسے پانچ سو روپے میں خرید لیا۔ یہ ہندو دلال اسے لدھیانے سے لایا تھا۔ ایک جاٹ دلال سے۔ اس سے پہلے وہ کہاں تھی، یہ میں نہیں کہہ سکتی۔ ہاں لیڈی ڈاکٹر نے مجھ سے بہت کچھ کہا ہے کہ اگر آپ اسے سن لیں تو شاید پاگل ہو جائیں۔ بتول بھی اب نیم پاگل ہے۔ اس باپ کو جاٹوں نے اس بیدردی سے

مارا ہے کہ ہندو تہذیب کے پچھلے چھ ہزار برس کے چھلکے اتر گئے ہیں اور انسانی بربریت اپنے وحشی ننگے روپ میں سب کے سامنے آ گئی ہے پہلے تو جاٹوں نے اس کی آنکھیں نکال لیں پھر اس کے منہ میں پیشاب کیا۔ پھر اس کے حلق کو چیر کے اس کی آنتیں تک نکال ڈالیں۔ پھر اس کی شادی شدہ بیٹیوں سے زبردستی منہ کالا کیا۔ اسی وقت ان کے باپ کی لاش کے سامنے ریحانہ' گل' درخشاں' مرجانہ' سوسن' بیگم' ایک ایک کر کے وحشی انسان نے اپنے مندر کی مورتیوں کو ناپاک کیا۔ جس نے انہیں زندگی عطا کی' جس نے انہیں لوریاں سنائی تھیں' جس نے ان کے سامنے شرم سے عجز سے' پاکیزگی سے سر جھکایا تھا۔ ان تمام بہنوں' بہوؤں اور ماؤں کے ساتھ زنا کیا۔ ہندو دھرم نے اپنی عزت کھو دی تھی۔ اپنی رواداری تباہ کر دی تھی۔ اپنی عظمت مٹا ڈالی تھی۔ آج رگ وید کا ہر منتر خاموش تھا۔ آج گرنتھ صاحب کا ہر دوہا شرمندہ تھا۔ آج گیتا کا ہر اشلوک زخمی تھا۔ کون ہے جو میرے سامنے اجنتا کی مصوری کا نام لے سکتا ہے۔ اشوک کے کتبے سنا سکتا ہے' ایلورا کے غم زاروں کے گن گا سکتا ہے۔ بتول کے بے بس بھنچے ہوئے ہونٹوں' اس کی بانہوں پر وحشی درندوں کے دانتوں کے نشان اور اسکی پھری ہوئی ٹانگوں کی ناہمواری میں تمہاری اجنتا کی موت ہے۔ تمہارے ایلورا کا جنازہ ہے۔ تمہاری تہذیب کا کفن ہے۔ آؤ' آؤ میں تمہیں اس خوبصورتی کو دکھاؤں جو کبھی بتول تھی۔ اس متعفن لاش کو دکھاؤں جو آج بتول ہے۔

جذبے کی رو میں بہہ کر میں بہت کچھ کہہ گئی۔ شاید یہ سب کچھ مجھے نہ کہنا چاہیے تھا۔ شاید اس میں آپ کی ہتک ہے۔ شاید اس سے زیادہ ناگوار باتیں آپ سے اب تک کسی نے نہ کہی ہوں گی۔ نہ سنائی ہوں گی۔ شاید آپ یہ سب کچھ محسوس کرتے ہوں گے۔ لیکن کچھ نہیں کر سکتے۔ جیسا کہ میں دیکھ رہی ہوں آپ لوگ پنڈت جی' جناح صاحب بہت کچھ نہیں کر سکتے بلکہ شاید تھوڑا بہت بھی نہیں کر سکتے۔ پھر بھی ہمارے ملک میں آزادی آ گئی ہے ہندوستان میں اور پاکستان میں اور شاید ایک طوائف کو بھی اپنے رہنماؤں سے پوچھنے کا یہ حق ضرور ہے کہ اب بیلا اور بتول کا کیا ہوگا۔؟

بیلا اور بتول دو لڑکیاں ہیں۔ دو قومیں ہیں' دو تہذیبیں ہیں دو مندر اور مسجد ہیں۔ بیلا اور بتول آج کل فارس روڈ میں ایک رنڈی کے ہاں رہتی ہیں جو چینی حجام کی بغل میں اپنی دکان کا دھندا چلاتی ہے۔ بیلا اور بتول کو یہ دھندا پسند نہیں۔ میں نے انہیں خریدا ہے۔ میں چاہوں تو ان سے یہ کام لے سکتی ہوں۔ لیکن میں سوچتی ہوں میں یہ کام نہیں کروں گی جو راولپنڈی اور جالندھر نے ان سے کیا ہے۔ میں نے انہیں اب تک دنیا فارس روڈ کی دنیا سے الگ تھلگ رکھا ہے۔ پھر بھی جب میرے گاہک پچھلے کمرے میں جا کر اپنا منہ ہاتھ دھونے لگتے ہیں۔ اس وقت بیلا اور بتول کی نگاہیں مجھ سے کچھ کہنے لگتی ہیں۔ میں ان نگاہوں کی تاب

نہیں لا سکتی۔ میں ٹھیک طرح سے ان کا سندیسہ بھی آپ تک نہیں پہنچا سکتی۔ آپ کیوں نہ خود ان نگاہوں کا پیغام پڑھ لیں۔ پنڈت جی میں چاہتی ہوں کہ آپ بتول کو اپنی بیٹی بنا لیں۔ جناح صاحب میں چاہتی ہوں کہ آپ بیلا کو اپنی دختر نیک اختر سمجھیں۔ ذرا ایک دفعہ انہیں اس فارس روڈ کے چنگل سے چھڑا کے اپنے گھر میں رکھئے اور ان لاکھوں روحوں کا نوحہ سنئے۔ یہ نوحہ جو نوا کھالی سے راولپنڈی تک اور بھرت پور سے بمبئی تک گونج رہا ہے۔ کیا صرف گورنمنٹ ہاؤس میں اس کی آواز سنائی نہیں دیتی' یہ آواز سنیں گے آپ؟

آپ کی مخلص

فارس روڈ کی ایک طوائف

---

مبشر عزیز حسن

# کنجری کی ڈائری سے چند اقتباسات

25 ستمبر 1999ء

میں ایسے مردوں کو بڑی اچھی طرح سے جانتی ہوں جو عورت کو جنسی لذت کے بام عروج پر پہنچا کر بھاگ جاتے ہیں۔ ان کا بھاگنا عین فطری نہیں ہوتا وہ دراصل یکسانیت کے خلاف برسرِ پیکار رہتے ہیں۔ وہ زندگی کو چاروں اور سے جان لیتے ہیں اور اس میں کرشمہ سازیاں کرتے ہیں۔ ہر وہ بات انہیں اچھی نہیں لگتی جس میں روز مرہ کی بے ہودہ زندگی کا بوجھ ہو۔ مثلاً "آج بہت گرمی ہے"۔ "مہنگائی نے کمر توڑ دی" "سیاستدان کتے ہیں" ایسے لوگ زندگی میں کسی بات پر سنجیدہ نہیں ہوتے اور نہ جذباتی ہو کر میز پر مکا مارتے ہیں۔ "اف اگر ایسا ہو جاتا تو کیا تھا۔" "وہ ہرگز ایسا نہیں کر سکتی۔" وہ ایسی باتیں نہیں کرتے جو سب کو پہلے سے معلوم ہوں گویا ان کی زندگی انوکھے پن کی کارستانی ہوتی ہے۔

2 اکتوبر 1999ء

تعفن سے پر میرا یہ کمرہ کوئی جنسی کلینک معلوم ہوتا ہے۔ جس میں غریب الحال جنسی مریض آتے ہیں۔ لمبے' موٹے' چھوٹے' ٹیڑھے میڑھے' بیٹھی ناک اور موٹی بھنوؤں والے۔ ان کے ساتھ سونا اور انہیں خوش رکھنا میرا فریضہ ہے۔ میں رتی بھر بھی اپنے اس فریضہ پر نادم نہیں ہوں۔ میری شکل کے مطابق گاہک بھی وہ آتے ہیں جن کے بدن سے مٹی کے تیل کی بدبو اور منہ سے مسواک کی ہمک آتی ہے۔

ایسے پھٹے پرانے حالوں میں یہ چھچھڑا گاہک دراصل میری ڈھلتی ہوئی عمر اور میرے چہرے کے مٹتے ہوئے خدوخال کا مقدر ہیں۔

15 اکتوبر 1999ء

کافی عرصہ ہوا وہ شخص نہیں آیا جس کا جسم بالوں سے بھرا ہوا تھا۔ کچھ ضرورت سے زیادہ ہی اس کے جسم پر بال تھے۔ میرا دل چاہتا تھا کہ اسے برہنہ کر کے اس کے گلے میں رسی ڈال کر لارنس گارڈن کا چکر

لگاؤں اور وہ چار پایوں پر ریچھ کی طرح میرے ساتھ ساتھ چلے۔ سیر وتفریح کے بعد گھر آ کر اسے اپنے پلنگ کے پائے کے ساتھ باندھ دوں۔ ویسے میں پندرہ سگریٹ روزانہ پیتی ہوں۔ ایسے میں سگریٹ کی تعداد پندرہ سے پچیس کر دوں اور ہر سگریٹ کا اختتام اس کی پشت پر بجھا کر کروں۔ یہ کوئی انتہا پسند خیالات نہیں ہیں نہ ہی ان کے پیچھے مردوں کے خلاف کوئی جذبہ نفرت کارفرما ہے اور نہ ہی کسی کو اذیت دینا میرا کبھی مسئلہ رہا ہے۔ یہ تو ممکنات سے ابال ہیں جو ان گھٹی ہوئی چھتوں کے نیچے پیدا ہوتے ہیں۔

21 اکتوبر 1999ء

دیوار پر خضاب مارکہ کمپنی کا کلاک لگا ہوا ہے جس میں صبح کے نو بجے ہیں۔ میں اپنے بستر پر ساکت لیٹی ہوئی دیوار پر لگے ہوئے ایک خوبصورت ایکٹرس کے پوسٹر کو دیکھ رہی ہوں وہ تصویر میں مسکرا رہی ہے۔ یہ پوسٹر دراصل میں نے اس لیے لگا رکھا ہے کہ دیوار کا پلستر اکھڑا ہوا ہے۔ میرے کمرے کے تین کونوں پر مکڑیوں نے چھوٹے چھوٹے جالے بن رکھے ہیں اور میں سوچ رہی ہوں کہ اس نحوست کو کل ختم کر کے رہوں گی کسی بانس کے آگے کپڑا لگا کر۔ ایسی سستی دل و دماغ پر چھائی رہتی ہے کہ میں روزانہ بھول جاتی ہوں۔ چھت پر ایک سبز رنگ کے بلب کا خول جھولتا رہتا ہے۔ عموماً ایک چڑیا اس پر بیٹھی جھولتی ہے اور پھر سے اس روشندان سے نکل جاتی ہے جس کی جالی ٹوٹی ہوئی ہے۔ بنگالی دروازے کو پیٹتا ہے۔ یہ میرا دلال ہے جو ہر صبح کو آ جاتا ہے۔ یہ کبھی تن کر کھڑا نہیں ہو سکتا۔ اس کے جسم کا آدھا دھڑ ہوا میں معلق پیچھے کو جھکا رہتا ہے۔ چہرے پر مردنی چھائی ہوئی ہے اور جینے میں زبردستی کر رہا ہے۔ میرے نزدیک وہ انسان نہیں بلکہ جاندار شے ہے۔ "لا ادھر کر تا تکیں تیری پنڈلیاں دبا دوں مائی۔" نہ جانے بنگالی کو میری ڈھلتی ہوئی عمر کو یہ مناسب الفاظ دے کر کیوں خوشی محسوس ہوتی ہے۔ میرے بار بار روکنے کے باوجود مجھے مائی کہتا ہے۔ بنگالی کی شکل میں کوئی انسانی شائبہ نہیں ملتا۔ جس زاویے سے چاہے اسے دیکھ لو ایک جیسا ہی لگتا ہے۔ یہ حالت نشے کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ شکل وصورت بناتے وقت خدا سے ناانصافی ہوئی لگتی ہے۔ اچھا بھلا انسانوں کا دکھ درد رکھنے والا آدمی بھی کبھی اس کے ساتھ سڑک پر دو قدم نہ چلے۔ بامر مجبوری اگر چلنا پڑ بھی جائے تو اس سے دو قدم آگے چلے گا یا دو قدم پیچھے اور سامنے سے آتے ہوئے راہ گیروں کو یہ بتانے کے لیے گردن کو اس طرح تھمائے گا کہ یہ غیر انسانی وجود میرے ساتھ تو نہیں چل رہا ہے۔ بنگالی جس کے منہ سے ہر وقت سڑی ہوئی مچھلی کی بدبو آتی رہتی ہے اپنے ہاتھوں کی موٹی موٹی انگلیوں سے میری پنڈلیاں دباتا ہے۔ خدمت کے اس عمل کے پیچھے پچاس روپے کارفرما ہوتے ہیں۔ کبھی کبھار ساٹھ ستر روپے لیتے ہوں تو بے جا خوشامد پر اتر آتا ہے۔ اسے کیا پتہ کہ میں ان عورتوں میں سے نہیں جو دل فریب باتوں اور جھوٹی تعریفوں کا شکار ہو کر ذرا سا مست ہو کر بھول جاتی

ہیں۔ان کے چہرے کھل اٹھتے ہیں۔تعریف ہمیشہ اس امر کی کی جاتی ہے جو چیز جس میں نہیں ہوتی۔ایسے تعریفانہ جملے پھینک کر محرومی کے ان خالی گڑھوں کو بھرا جاتا ہے۔جو کبھی بھر نہیں سکتے بلکہ اس پر صرف خوش فہمی کا پل تعمیر کیا جا سکتا ہے۔بنگالی میری پنڈلیوں کو اس انداز سے دباتا ہے کہ میں بہت دور ایک ایسی دنیا میں پہنچ جاتی ہوں جہاں فقط آزادی ہوتی ہے۔روح تک کا بوجھ محسوس نہیں ہوتا۔جی چاہتا ہے کہ ایسی نیند سو جاؤں کہ پھر کبھی نہ اٹھوں۔ایسی نیند تو بہر حال آ کر رہے گی۔زندگی خواہ کتنی ہی پر پیچ یا سر سبز ہو فی الحال مجھے بی بی پاکدامن جانا ہے۔بہت سے معاملوں سے نپٹنا ہے۔ہر ایک سے نپٹ لوں گی۔زندگی پڑی ہے دیکھا جائے گا۔

125 اکتوبر 1999ء

آج صبح بڑی پھیکی اور بے رنگ تھی۔علی الصبح مجھے اس بوڑھے کا خواب آیا جو کئی ماہ تک میرے سر پر سوار رہا۔وہ بوڑھا میرے کمرے میں موجود حواس باختہ اپنی ٹانگوں کو اوپر نیچے کرتا ہوا مجھے کہہ رہا تھا" چلو جلدی جلدی نکل چلیں۔"۔۔۔"لیکن مجھے کس بات کا ڈر ہے جلدی کس بات کی"۔"نہیں تم نہیں سمجھ سکتی"۔۔۔"میں کہتا ہوں۔۔۔۔۔۔"۔۔۔اچانک کمرے میں کچھ لوگ سیاہ لبادوں میں نمودار ہوتے ہیں اور بوڑھے کو گھیرے میں لے لیتے ہیں۔"تم کیسے جا سکتے ہو۔پہلے مسجد کے چندے والا ڈبہ واپس کرو جو تم اکھاڑ کر بھاگے ہو"۔"میرے پاس نہیں ہے"۔بوڑھا کرختگی سے کہتا ہے۔"تم مجھے اتنا ذلیل اور گھٹیا سمجھتے ہو کہ میں وہ ڈبہ اکھاڑ لے جاؤں گا"۔ایک سیاہ چڑیا جس کی دم سرمئی رنگ کی تھی بوڑھے کے کندھے پر بیٹھی ہوئی ہے تمام لوگوں کے غصے میں لہراتے ہوئے ہاتھوں سے ڈر کر بھی نہیں اڑتی۔"میں تمہارے معاشرے کو تسکین فراہم کرنے والی مشین چرانے آیا تھا۔اس چندے کے ڈبے سے میرا کوئی تعلق نہیں"۔ایک لمبے سے منہ والا آدمی اس کی طرف بڑھتا ہے۔"تو یہاں سے کچھ بھی نہیں لے جا سکتا" اور اسے دھکا دیتا ہے اور اپنے بوٹ کی نوک اس کے پیٹ پہ مارتا ہے۔اسی طرح تمام لوگ اس پر ٹوٹ پڑتے ہیں اور میں ایک طرف سہمی کھڑی رہتی ہوں۔بوڑھا چیختا ہے شور و غوغا کرتا ہے جیسے وہ لوگ ڈر جائیں گے۔"چھوڑ دو مجھے اخ تھو تمہاری زندگی گندی لغو اور بیہودہ ہے۔ماہواری کے چیتھڑو! تم لوگ منافق ہو۔تمہاری ناک کی سخت ہڈیوں پر لگے چشمے تمہارے مہذب ہونے کا ثبوت ہرگز نہیں۔تمہارے پاؤں اکھڑ جائیں گے اور تمہارے چشمے تمہارے ہی بوٹوں کی ایڑیوں کے نیچے آ کر چکنا چور ہو جائیں گے۔ہٹ جاؤ ہم دونوں کو جانے دو۔ہم آزادی کے سپاہی ہیں۔ہمارا نہ کوئی مذہب ہے اور نہ کوئی دین! ہم تو جسد خاک کے پیکر ہیں۔ہٹ جاؤ غاصبو! ہمارے راستے سے تمہاری روح تمہارے دل و دماغ شیطان کے قبضہ میں ہیں۔تم مذہب کا سہارا لے کر ہم جیسوں پر ستم ڈھا کر ہلکا ہوتا

چاہتے ہو۔تم اپنے ایمان کو محفوظ کرنے کے لیے روپے خرچ کرتے ہو۔تم اصل بات جانتے ہی نہیں۔ ہٹ جاؤ جانے دو ہمیں' ہم آوارہ اداس زخمی روحیں ہیں۔" میرے دل میں اس کے لیے ترس پیدا ہوتا ہے۔ میں اس کی طرف بڑھتی ہوں۔ بوڑھا اپنے آپ کو چھڑاتے ہوئے چیختا ہے۔" یہ گناہ!تم لذت کے لیے نہیں کرتے محض افسردگی ختم کرنا تمہارا مسئلہ ہے مگر یہ کبھی ختم نہیں ہو سکتی۔آخری دم تک نہیں! طوائفوں کے پاس افسردگی اور نحوست بڑی مقدار میں ہوتی ہے۔" بوڑھا صاحب کے ٹھڈوں سے گھسٹتا ہوا اٹھتا ہے کہ اچانک اس کی گردن لمبی ہو کر پنکھے کے پروں میں آجاتی ہے۔میں لرز کر بستر سے اٹھی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میرے جسم پر بوجھ ہے جیسے کسی نے کوئی بہت بڑا سیاہ پتھر میرے سینے پر رکھ دیا ہو۔میرا ذہن جاگ رہا تھا مگر جسم بے جان ہاتھ تک نہ اٹھایا جاتا تھا۔خواب کے فوراً بعد ایک سیاہ چڑیا کمرے میں خلاف توقع نمودار ہوئی مگر اس کی دم سرمئی رنگ کی نہ تھی۔

2 نومبر 1999ء

کتنا بدنصیب ہوتا ہے وہ شخص جسے مرنے کے بعد دنیا میں کوئی یاد کرنے والا نہیں ہوتا۔آج مدتوں کے بعد میں نے 10 بج کر 5 منٹ پر اسے یاد کر کے اس کی روح کی بدنصیبی کو ختم کر دیا۔اس دن بہت بارش ہو رہی تھی' تیز ہوا کا شور ہمارے بلند و بالا مکانوں سے کچھ یوں ٹکرا رہا تھا جیسے کسی بات پر احتجاج کر رہا ہو اور میں اپنے پلنگ پر لال پیلی گولیاں اور چاہے رس کھا کر لیٹی تھی۔میرا بخار ٹائیفائیڈ میں تبدیل ہو گیا تھا۔ میں پلنگ پر لیٹی ہوئی بڑی چڑچڑی طبیعت میں مبتلا موت کے بارے میں سوچتی رہتی۔زبان کے ذائقے مر چکے تھے جیسے کوئی سانپ کھا لیا ہو۔مجھے بچنے کی ذرا سی امید نہ تھی۔ان دنوں مجھے بڑے عجیب و غریب خواب آیا کرتے تھے۔کئی مرتبہ محسوس ہوا کہ میں بستر پر پڑی پڑی مر چکی ہوں۔میں ڈر کے مارے اماں کو آواز دیتی یہ پتہ کرنے کے لیے میں زندہ بھی ہوں کہ نہیں۔اگر میری آواز کا جواب نہ ملتا میرا دل مزید گھبراتا اور ان لمحوں تک میں اپنے آپ کو مردہ ہی سمجھتی جب تک آواز کا جواب نہ آتا۔ان دنوں ایک سبز آنکھوں والا پروفیسر میری ماں سے ملنے آیا کرتا تھا۔سبز آنکھوں والے پروفیسر نے مجھے بچانے کا عزم کیا اور وہ کامیاب ہو گیا۔ماں میں اس کی دلچسپی ختم ہو چکی تھی۔مجھے مجذوب بے ضرر دیوانوں کی طرح ہمیشہ کے لیے ایک چھوٹے سے شہر میں سرخ اینٹوں والے کوارٹر میں لے گیا۔اس شہر میں شام ہوتے ہی لوگ اپنے اپنے گھروں میں گھس جاتے۔رات کو ستارے صاف چمکتے ہوئے دکھائی دیتے اور کوارٹر میں ہر وقت چونے کی بو آتی رہتی جس کی دیواریں سیلن زدہ تھیں۔پنکھے سست رفتار سے چلتے اور رمضان کے دنوں میں سحری اٹھانے والا زور زور سے ڈبہ پیٹتا۔پروفیسر صبح کالج چلا جاتا اور میں گھر میں بور ہوا کرتی۔ مجھے بھی کتابیں پڑھنے کا شوق ہو

گیا۔ ایک عورت ہمارے گھر میں نوکرانی تھی۔ لکڑی کے تختے پر بیٹھے سبزیاں چھیلتی رہتی اور کوئی بات نہ کرتی جیسے کوئی بھید جبڑوں میں چھپایا ہو۔ کہتے کہتے رک جاتی۔ بات شروع کرتے وقت کئی مرتبہ اٹکتی لیکن میں نے بھی کبھی اس سے بات اگلوانے کی کوشش نہ کی۔ مجھے ذرا بھی دلچسپی نہیں تھی اس کی رکی ہوئی بات سے۔ میں نے زندگی کے ان سالوں میں بہت سی کتابیں پڑھ ڈالیں۔ ہر کتاب کے اختتام پر مجھے اس سے بحث کرنے کا موقع ملتا تو وہ مجھے اپنی طرف سے یوں زیر کرتا جیسے ساری ذہانت اسی کے دماغ میں گھسی ہو۔ زوردار دلائل دے کر مجھے چونکانے کی کوشش کرتا حالانکہ اس کی باتیں اور دلائل بالکل بے ربط ہوتے۔ میں نے کئی مرتبہ بات کو ڈھیلا کر دیا اور چہرے کے تاثرات ایسے بنالیے جیسے مجھے کچھ پتہ ہی نہ ہو تو پھر ساری جیت اس کے حق میں چلی جاتی۔ ایک دن مجھے اس پر بڑا غصہ آیا جب وہ اپنے دوست کو بتا رہا تھا کہ میں نے ایک ایسی عورت سے شادی کی ہے جو دھتکاری ہوئی ہے۔ یہ قدم اٹھانا کوئی چھوٹی بات نہیں ہوتی وہ اپنے دوست سے داد وصول کر رہا تھا کہ اچانک میں نے اس کی باتیں سن لیں۔ اس کے علاوہ اور نہ جانے کیا کیا بکتا جا رہا تھا۔ شام کو جب میرے پاس آیا تو بے ربط طریقے سے بولنے لگا کہ یہ جو مسرت ہوتی ہے یہ انسان کے ضمیر میں پوشیدہ ہوتی ہے۔ جس قدر ضمیر صاف اور اجلا ہوگا' اسی قدر انسان ہلکا اور چمکدار ہوگا۔ زندگی دراصل بڑی پرسکون چیز کا نام ہے۔ ہم محض اپنی ضرورتوں اور خواہشوں سے اسے بوجھل بناتے ہیں۔ ابھی کل میں عینیت پرستی۔۔۔ ''رک جاؤ بند کرو یہ بکواس۔ تمہیں کیا پتہ زندگی کیا ہوتی ہے۔ تم اس کی ابجد تک نہیں جانتے شراب پی لی' مطالعہ کر لیا ور ایسی عورت کے ساتھ ہم بستری کر لی جسے تم نے پچاس ہزار میں صرف اس لیے خریدا کہ تم اس پر زندگی بھر حق جتا سکو اور اس احساس سے بھرے رہو کہ جو کچھ تم نے کیا ہے کوئی چھوٹا قدم نہیں۔ اس کے لیے بڑی ہمت چاہیے۔ تم نے اپنے آئیڈیل ازم پر روپیہ خرچ کیا ہے اس کارزار دنیا میں تمہاری حیثیت فقط ایک گاہک کے سوا کچھ نہیں تم ایک نالائق شخص ہو جو اپنی نالائقی کو چھپانا بخوبی جانتا ہے اور چہرہ ایسا بنا رکھا ہے جیسے ہر چیز پر تمہاری نظر اور ادراک بڑا گہرا ہے۔''

تمام نظریات پانی میں تیرتے ہوئے تنکے کی طرح ہوتے ہیں جن کے اختیار میں کچھ نہیں ہوتا جو موجوں اور پانی کے بہاؤ کے دست نگر ہوتے ہیں۔ ہر شخص اپنے نظریات سے پیار کرتا ہے اس کی آبیاری کرتا ہے اور اس کا دل چاہتا ہے کہ ہر شخص ان نظریات میں ڈھل جائے جیسا وہ خود ہے۔ ان نظریات کو بڑے پیار سے ذہن کے مرتبانوں میں سنبھالنا اور دوسروں پر ٹھونس کر حظ اٹھانا اور دل ہی دل میں سمجھ لینا کہ میں راسخ العقیدہ ہوں۔ بھرپور خیالات کا مالک۔ ایک میں ہی ہوں اس سوسائٹی میں اعلیٰ درجے کا انسان! باقی سب خارش زدہ گدھے ہیں کتنی حماقت ہے ان باتوں میں جب کسی کو یہ ثابت کر دیا جائے کہ وہ کچھ نہیں سوائے اس

کے کہ ایک عام آدمی کے پر جو اپنے آپ کو دوسروں سے الگ سمجھ بیٹھا ہے اور اسی حماقت میں جئے چلا جا رہا اور ایک بھرپور اور مکمل کوشش سے دھوکہ دیتا چلا جا رہا ہے تو اس احساس دلانے سے دوسرے کی باطنی حسیں مجروح ہو جاتی ہیں پھر وہ اپنی اور وہ دوسروں کی تذلیل پر اتر آتا ہے۔ اس نے بھی میز پر پڑی ہوئی ایش ٹرے میرے سر پر دے ماری۔ اب تک منحوس نشان میرے ماتھے پر موجود ہے ذلیل' کمینہ' بزدل' میں نے آنکھیں بند کر لیں اور کانوں پر ہاتھ رکھ لیا یہ سب کچھ سوچ کر۔ جا چلا جا اپنی بدنصیبی میں واپس' میں تجھے یاد ہی نہیں کرتی اور نہ ہی تیرے لیے دعائے خیر کرتی ہوں۔

5 نومبر 1999ء

ایک وقت ایسا بھی تھا جب مجھے کہانی لکھنے کا بہت شوق تھا لیکن سمجھ ہی نہیں آتی تھی کہ کہاں سے شروع کروں اور کہاں ختم کروں کہ لفظ پکڑ میں ہی نہیں آتے تھے۔ گھنٹوں بیٹھے بیٹھے کاغذوں پر لکیریں مارتی رہتی جیسے یہ تجریدی آرٹ ہی میری زندگی ہو۔ میں جانتی تھی کہ ایک دفعہ قلم چل نکلا تو پھر رکے گا نہیں کیوں کہ بہت سے خیالات نے میرے اندر ہلچل مچا رکھی تھی۔ کبھی کبھی صفحوں پر کوئی چوپایا یا بلی بنا دیتی جو اس انداز سے بنتے کہ یہ بات صرف میرے ذہن میں ہوتی کہ یہ چوپا ہے یا بلی۔ میرے استاد جی مجھے کہتے کہ لکھو تم لکھ سکتی ہو تم شاعری کیا کرو لیکن مجھ سے شاعری ہوتی نہ کہانی لکھی جاتی۔ بس اس ڈائری کا سہارا لے لیا۔ اس پر لکھے الفاظ میرے دل کا سرمایہ ہیں۔ ان کو پڑھ کو کوئی یہ نہ سمجھ لے کے یہ بے معنی اور فضول ہیں۔ روحانی کرب اٹھانا اور زبان پر شکوہ تک نہ لانا بہت بڑی عبادت ہوتی ہے۔ اگر کوئی میری یہ ڈائری پڑھ لے تو اس کو یہ بات ضرور کھٹکے گی کہ یہ چھوٹے سے کمرے میں رہنے والی گھٹیا طوائف کس طرح کی پکی باتیں لکھتی ہے لیکن کیا بتاؤں غریبی اور بدحالی ایک ایسا کنواں ہے کہ اگر کوئی اس میں ایک خاص وقت تک پڑا رہے اور اتفاق سے کسی اجنبی کی پھینکی ہوئی دکھ کی بالٹی سے چمٹ کر باہر آ جائے تو خدا کی قسم وہ ایک نارمل انسان نہیں رہتا۔ اس مقام پر پہنچنے کے لیے ڈھیر ساری کتابیں پڑھنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں جو خوشحال ہوتے ہوئے بھی ان کی روح بیمار پڑ جاتی ہے۔ دماغ کا پچھلا حصہ سو جاتا ہے تو پھر وہ لوگ اس مقام تک پہنچ جاتے ہیں کہ اپنی ذات میں ایک غیر معمولی طاقت کا سرچشمہ بن جاتے ہیں جن کے ہر لکھے ہوئے لفظ اور ہر کہی ہوئی بات میں وزن ہوتا ہے۔

15 نومبر 1999ء

نہ جانے مجھے وہ بوڑھا کیوں نہیں بھولتا جس کے منہ سے ہر وقت تمباکو کی بو آتی رہتی جو یکسانیت کو توڑنے کا فن بخوبی جانتا تھا۔ کچھ ماہ پہلے بنگالی اس کو لے کر میرے پاس آیا۔ اس نے ایک لمبا سا اوورکوٹ

پہن رکھا تھا۔ آنکھیں بالکل ایسی کہ جیسے ناک کے دائیں بائیں دو شہد کی مکھیاں بیٹھی ہوں۔ اپنی طرف سے بڑا چالاک بنتا تھا" ایسا کر یہ لے پانچ سو روپیہ پیسے کی فکر مت کرنا میں بہت عجیب قسم کا شخص ہوں۔" اس نے دو مالٹے کوٹ کی جیب سے نکالے اور ان کو مداری کی طرح ہوا میں اچھالنا شروع کر دیا۔ ایک لمحہ کے لیے مجھے اس سے خوف سا آنے لگا کہ انسان جس طرح کا سوچنا شروع کر دے اسی طرح کے واقعات ہوتے ہیں اور اسی طرح کے لوگ اسے ملتے ہیں۔ یہ واقعی کوئی مجسم شے ہے یا میرا وہم ہے۔"تو کیا سمجھتی ہے میں کوئی خبطی قسم کا بوڑھا ہوں یہ لے چلغوزے کھا بہت ساری باتیں تم سے کرنی ہیں"۔ میں اپنے ناخنوں سے چلغوزے چھیل کر کھانے لگی۔"تو نے کبھی جہانگیر کا مقبرہ دیکھا ہے۔""نہیں""تو پھر نور جہاں کا مقبرہ بھی نہیں دیکھا ہوگا۔" "نہیں دیکھا""اچھا تو چلنا میرے ساتھ یہ بتا تجھے کہیں مردوں سے نفرت تو نہیں؟" میں نے کہا" اتنی بڑی بڑی باتوں کا میرے پاس کوئی جواب نہیں۔ مجھے چلغوزے کھانے دو""ہاں ہاں کھا یہ پستے بادام بھی لے۔ بچپن میں جب گھر میں خوبانیاں کھائی جاتیں تو میں ان کی گٹھلیوں کو سنبھالتا اور کسی پتھر سے توڑ کر اس میں سے مغز نکال کر کھاتا۔ ایک مرتبہ میری نانی نے مجھے کھجور کی گٹھلیاں اکٹھی کرنے کو کہا۔ میں نے سڑکوں پہ جا جا کر رمضان کے مہینے میں بہت سی گٹھلیاں اکٹھی کیں کم از کم دو ہزار۔ تین مہینے کے بعد نانی کے مرنے کے بعد دوسرے دن وہی گٹھلیاں لوگ سر جھکائے ہوئے بڑے خشوع و خضوع کے ساتھ پڑھ رہے تھے۔" مجھے بوڑھا ان احمقوں میں سے لگ رہا تھا جو صرف اپنی بات سنانا جانتے ہیں۔ پتہ نہیں انہیں کیا خبط ہوتا ہے باتیں کرنے کا۔ بس بولتے ہی چلے جاتے ہیں۔ پتہ نہیں دوسرا سن بھی رہا ہو یا نہیں۔ ایسے لوگوں کے واقعات بالکل بے ہودہ ہوتے ہیں۔ لیکن مجال ہے بوڑھا کوئی ایسی بات کہہ دے جو میرے لیے بوجھ بن جائے۔ مجھے لگتا تھا خدا نے بڑا سوچ سمجھ کر اسے میرے پاس بھیجا ہے۔" یہ جو تیرا نگالی ہے نا اس کی آنکھوں میں ضرور کوئی چمک ہے۔ پتہ نہیں کیا کیا کہے جا رہا تھا۔ اور کیا چاہتا تھا۔ محبت تخلیق کر کے ہی تجھے ہاتھ لگاؤں گا کیونکہ کسی کو نوچنا مجھے اچھا نہیں لگتا"۔" مجھے اس کے عزم پر ہنسی آنے لگی۔" پیسے کی فکر مت کرنا۔ جب تک تیرے دل میں میرے لیے محبت تخلیق نہ ہو جائے گی میں نہیں جاؤں گا۔ تو کنجری ہے تجھے شکست دینا کوئی آسان کام نہیں۔ اور پھر وہ بھی تجھے۔ لیکن دیکھ لینا کسی دن تو رو پڑے گی۔ تیرے اندر کی عورت اکھاڑ کر ہی دم لوں گا۔" ہنسی سے میرا برا حال ہو گیا۔ وہ کیا کہتا چلا جا رہا تھا اسے کیا ہو گیا تھا۔ باتیں کرنے کے دوران اپنی سوکھی سی انگلی میری طرف بار بار کرتا۔"تو ہار جائے گی میں تجھے لے اڑوں گا۔" پھر اچانک اس پر لرزہ طاری ہو جاتا اور وہ چلا جاتا۔ میں گھنٹوں اس کی اوٹ پٹانگ باتوں کے بارے میں سوچتے ہوئے ہنستی رہتی۔

22 نومبر 1999ء

بوڑھا ایک دن مٹی کا لٹو لے آیا۔ مجھے کہنے لگا۔ "ہاتھ آگے بڑھاؤ دایاں نہیں بایاں ہاتھ بڑھاؤ" میری بڑی انگلی کی پور کو پکڑ کر بے شمار کوشش کے بعد میرے ہاتھ پر لٹو کو ڈوری سے ایک جھٹکے کے ساتھ کچھ اس انداز میں پھینکا کہ لٹو کافی دیر تک گھومتا رہا۔ مجھے ہاتھ پر گدگدی ہونے لگی لٹو گھومنے کے دوران سگریٹ کے لمبے لمبے کش لے کر دھواں میرے منہ پر برابر مارتا رہا۔ واہ جی واہ جیسے اس بیہودہ زندگی میں کوئی نئی بات نکالنے میں کامیاب ہو گیا ہو۔ اس کے بعد بھی اس کھیل سے اس کا جی نہیں بھرا۔ وہ لٹو میرے پیٹ پر گھمانا چاہتا تھا۔ اس نے مجھے بستر پر لٹایا "بالکل اکڑ جاؤ۔ جیسے مردے ہوتے ہیں سانس بند کر لو" میں اکثر سوچتی ہوں کہ یہ مضحکہ خیز حرکتیں کیوں؟ نہ جانے ایسی حرکتوں سے مجھے بھی تسکین ہوئی مگر میں اس سے خفگی کا اظہار کرتی رہتی اور اس نے میری قمیض اوپر کی اور لٹو کو ایک جھٹکے سے میرے پیٹ پر پھینکا لیکن لٹو لڑکھڑاتا ہوا نیچے جا گرا دو تین مرتبہ کوشش کی لیکن ناکام رہا انہی لمحوں میں اس کی ضد بن گئی کہ وہ لٹو چلا کر ہی رہے گا۔ میں نے اس کی ضد کا فائدہ اٹھایا۔ تین سو روپے مزید اس سے نکلوا کر لیٹ گئی۔ پیٹ کی سطح ڈھلوانی ہوتی ہے۔ لٹو کبھی میری رانوں کے دائیں بائیں یا درمیان میں گر جاتا۔ میں تنگ آ گئی بس بہت ہو لیا۔ میں اٹھنے لگی اس نے اداسی کے ساتھ میرے اوپر جھک کر دیکھا جیسے خدا جانے اپنی نوعیت کی ایک عجیب بھیک مانگ رہا ہو۔ "صرف ایک موقع دے دے خدایا۔ اگر نہ چلا تو کم بخت لٹو کو چکنا چور کر دوں گا۔ توڑ دوں گا اس ذلیل لٹو کو صرف ایک موقع میری جان۔" پھر اس نے ڈوری لٹو کے گرد لپیٹی اور بڑی ناامیدی سے لٹو پھینکا۔ پھینکنے سے پہلے اس معلوم تھا یہ نہیں گھومے گا۔ لٹو میرے پیٹ پر تھوڑا سا اچھلا اور اس طرح فراوانی میں گھومنے لگا کہ بس میرے پورے جسم میں ایسی سنسنی دوڑی کہ زندگی میں کبھی ایسا مزہ نہیں آیا۔ خدا جانے دکھ کی کن کن رگوں پر گھومتا رہا کہ میں کسی مست سپنی کی طرح لرز اٹھی میرے پورے بدن میں گداز لہریں دوڑتی رہیں۔ چند ساعتوں میں مجھے ایسے معلوم ہوا جیسے پوری دنیا میرے پیٹ پر گھوم رہی ہو۔

2 دسمبر 1999ء

ایک دن بوڑھا بڑے واعظانہ انداز میں کچھ یوں گویا ہوا کہ مجھے اس کی باتوں سے چڑ ہو گئی۔ وہ گھبرائے ہوئے انداز میں کمرے میں ٹہلتا رہا۔ باتیں کرنے کے دوران آنکھوں کو باہر نکالتا اور لفظوں کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ ہاتھوں کو ہوا میں ہلاتا رہا اور جھنجلائے ہوئے انداز میں کہنے لگا۔ "میں جسمانی تعلق کو برا نہیں سمجھتا بشرطیکہ دونوں افراد کی رضامندی اس میں شامل ہو تو ہاں کسی کے ساتھ زبردستی یا کسی کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر زیادتی کرنا بہت بڑا گناہ ہے بلکہ گناہ کبیرہ ہے۔ باقی جو لوگ شادی کی بات کرتے ہیں ایسے لوگ معاشرتی قوانین کے زبردست حامی ہوتے ہیں ایک کاغذ کے ٹکڑے پر دستخط چار گواہ اگر یہ عمل انسان

شادی سے پہلے باہمی ذوق وشوق سے کر بیٹھے تو گھر والے اور اردگرد کے انسان ایسے نافرمان جوڑوں کو سنگین سے سنگین سزاؤں میں دھکیل دیتے ہیں۔ انہیں حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور ایسے میں ہونے والی اولاد کو ناجائز یا حرام قرار دیا جاتا ہے اور اگر یہی عمل تمام گھر والوں کی رضامندی اور سوسائٹی کی پاسداری کی حدود میں رہ کر کیا جائے تو گھر کے وہ افراد جنہوں نے اپنی بیٹیوں کو بڑا سنبھال کر رکھا ہوتا ہے وہ باقاعدہ اہتمام کرتے ہیں۔ نئے کپڑے سلوائے جاتے ہیں گھر قلعی کروائے جاتے ہیں۔ چہروں پر خوشی ہوتی ہے۔ ہر فرد خوش وخرم مطمئن نظر آتا ہے ایک بڑے توازن میں حق تلفی کئے بغیر قدم اٹھایا جارہا ہوتا ہے کیونکہ وہ جو لڑکیاں دوسروں کو دے رہے ہوتے ہیں اس کے بدلے میں انہوں نے بھی لڑکیوں کو اپنایا ہوتا ہے یا پھر اپنانا ہوتا ہے۔ یہ لین دین کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ خاندانوں کو خاندانوں سے ملایا جاتا ہے تاکہ گھر کی دولت گھر میں رہے۔ یہ تو ہوئے ناریاستی قوانین اور اس سوسائٹی میں کنجری تو لوٹ کا مال ہوتی ہے۔ بالکل ٹھیک یاد آیا۔ ہاں لوٹ کا مال' کیونکہ پہلے جنگوں میں مال وزر کی فتح کے ساتھ جو چیز لذت کی ہوتی تھی اسے لونڈی کہا جاتا۔ جس قدر چاہو اس کی ہڈیاں جھنجوڑو ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا کنجری جو لوٹ کا مال ہوتی ہے۔ بدشکل سے بدشکل انسان صرف کمبخت روپے کی وجہ سے اس پر سبقت لے جاتا ہے۔ اس کھیل میں کوئی فرق نہیں پڑتا سبقت لے جانے والے کا ناک چوڑا ہے یا چھوٹا' ٹیڑھا ہے یا چپٹا' صرف روپوں کی وجہ سے اس کے جسم پر راج کرتا ہے اور ایسی حرکتیں اس سے کرواتا ہے جو اگر وفادار پالتو بیوی سے کہی جائیں تو دوسرے دن وہ عورت طلاق لے لے۔ میں بہت پہلے سمجھ چکا ہوں کہ یہ سب کچھ طاقت اور روپے کی وجہ سے ہوتا ہے اور کنجری تھکتی ہی نہیں اس کا پیٹ ہی نہیں بھرتا بنا روپیوں کے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کنجری جسمانی مشقت کے معاملے میں غیر معمولی طاقت کی مالک ہوتی ہے اور یہ غیر معمولی طاقت خدا کو پسند نہیں۔ دھمکیاں ملتی ہیں۔ بس کرو ورنہ جہنم رسید ہو جاؤ گے اور شیطان بچوں کی طرح کنجری کے کندھوں پر چڑھ کر خدا کو منہ چڑاتا ہے۔ خدا کی اس بدترین مخلوق کی کوئی مجبوری نہیں ہوتی۔ بلکہ کسی کے اختیار میں کچھ نہیں ہوتا۔ ہمیں دنیا میں اپنی مرضی کے خلاف جنا جاتا ہے۔ بس کچھ بنے بنائے اصول ملتے ہیں۔ یہ جیل خانے' پاگل خانے' ہسپتال' دارالامان' دارالشفقت' بازار حسن آخر انہیں کئی برسوں سے انسانوں نے ہی آباد کر رکھا ہے اور ان کی جگہ بھی تو کسی دوسرے انسانوں نے لینی ہوتی ہے۔ انسان آخر کس کس بات پر چیخے' کسی نہ کسی نے تو یہاں ہونا ہی ہوتا ہے۔ گلے شکوے کس بات کے' کوئی امیری میں پیدا ہوتا ہے' کوئی غریبی میں' دراصل انسان کی بدبختی کی بنیاد اس کی پیدائش پر ہوتی ہے یا پھر اتفاقات پر۔ اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہوتا۔ اس لیے انسان جو کچھ ہو وہی رہ کر اس پر فخر کرنا چاہیے۔ جب سب کچھ لٹ رہا ہو تو کم از کم انسان کو اپنی انا کو بچا لینا چاہیے اور اتارنا

چاہیے اپنی بات پر خواہ دوسروں کی نظر میں وہ بات جہالت ہو یا حماقت آخری دم تک اپنی بات سے منحرف نہیں ہونا چاہیے۔ بس اسی سے روح کو بالیدگی ملتی ہے۔ ایسی پستی میں خواہشوں کو پروان چڑھا کر کوشش کرو گے تو کچھ حاصل نہ ہوگا سوائے دکھ کے اور ٹوٹ پھوٹ جاؤ گے اپنی خواہشوں اور وسوسوں کے ساتھ۔ مجھے ان سارے گورکھ دھندوں سے کیا لینا۔ ہم دونوں اس سوسائٹی میں کھوکھلے درخت ہیں" مجھے اس کی بات پر غصہ آنے لگا ہو" مجھے اپنے ساتھ کیوں شامل کر رہا ہے۔ خود کو بھلا جو مرضی کہے میری مرضی کے بغیر ہی پتہ نہیں کیا کیا کہے جا رہا تھا اور کن کن خطابوں سے نوازتا چلا جا رہا تھا۔ جذباتی قسم کی باتیں جو سب کو پہلے سے ہی معلوم ہوں انہیں دہرانے کی ضرورت کیا ہے۔ لیکن دکھی لوگ بھی کیا کریں دل کی بھڑاس بھی تو نکالنی ہوتی ہے۔ بوڑھا کہنے لگا" آؤ نا پھر ہم نافرمان جوڑوں کی طرح شادی کر لیں۔ اوہو یاد آیا تو کنجری ہے لوٹ کا مال لونڈی! شادی کے کیا معنی ہوئے۔" میں اسے پیچھے دھکا دیتی ہوں اور بوڑھا قہقہے مارتے ہوئے پلنگ پر گرتا ہے اور گرتے ہوئے بھی ہنستا ہے۔ کیا معلوم مجھ پر یا اس معاشرے پر۔ جب مجھے محسوس ہوتا ہے مجھ پر ہنس رہا ہے تو میں اچانک اسے اٹھا کر شادی کا اہتمام کرنے لگتی ہوں۔ لیکن اسے دستخط کرنے کے لیے قلم نہیں ملتا۔ اور ہم دونوں بستر کے اردگرد اس قلم کو ڈھونڈتے ہیں جو خدا جانتا ہے یا پھر میں جانتی ہوں کہ ایسا قلم میرے کمرے میں ہے ہی نہیں۔ اس کے باوجود تلاش اور حماقت کے اس عمل میں بوڑھے کا ساتھ دیتی ہوں۔

31 دسمبر 1999ء

ایک دن بوڑھا کہنے لگا" اب میں کبھی نہیں آؤں گا۔ تو دیکھ لینا کبھی بھی نہیں۔" مجھے ایسے کہہ رہا تھا جیسے ان باتوں کا میرے دل پر بہت گہرا اثر ہو رہا ہو۔ میں جان بوجھ کر معصوم سا منہ بنا کر بولی۔" ایسا مت کرنا میرے لنگڑ بھگو۔" بوڑھا انکار کرتے ہوئے نہیں نہیں کہتا ہوا اپنے آپ کو ہیروازم سے بھر رہا تھا۔" نہیں آؤں گا تو دیکھ لینا۔ یہ لے میرا ایک خط اسے ضرور پڑھ لینا۔" بوڑھے نے جانے سے پہلے میری سگریٹ کی ڈبیا اٹھائی اور اس میں سے دو سگریٹ نکال لیے۔ اس میں کل چار سگریٹ تھے۔" یہ لے مساوی حقوق ہونے چاہئیں۔" دو سگریٹ تمہاری ڈبی میں ہیں اور دو میں نے رکھ لیے۔" میں نے کہا" اے بوڑھے! میری رات کیسے گزرے گی۔ لا ادھر کر میرے سگریٹ"" بس تجھے دیکھنا تھا۔ یہ لے پوری ڈبی۔" اس نے ایک نیا پیکٹ نکال کر میرے سامنے رکھ دیا۔" مگر اس کے باوجود تمہارے یہ دو سگریٹ میرے پاس ہی رہیں گے۔" ہاں یہ سودا مجھے منظور تھا۔ بوڑھے نے جذباتی ہو کر اپنے سوکھے کمزور نحیف ہاتھوں سے کوٹ کا بٹن اکھاڑ کر مجھے دے دیا" یہ لے رکھ لے میرے کوٹ کا بٹن۔ وہ یہ کوٹ کا بٹن ہے جسے لگایا نہیں جاتا۔ جو اگر کوٹ سے اترا ہو

اور اس کے دھاگے لٹک رہے ہوں تو برا لگتا ہے۔ مگر جسم کے لیے سردی تھوڑا ہی روکتا ہے۔ یہ رکھ بے معنی سا سیاہ بٹن۔ تم اس میں سے معنی نکال لینا رکھ لے۔'' میں نے بٹن پکڑ لیا۔ بوڑھا اداس نظروں سے مجھے دیکھتا رہا اور پھر چلا گیا۔ میں نے پہلی ڈبی میں سے سگریٹ نکال کر سلگایا۔ رات کے کوئی تین بجے تھے اور سردی بڑھ رہی تھی۔ کتنے بدقسمت ہوتے ہیں وہ لوگ جن کے پاس اس قدر سردی میں کوئی ٹھکانہ نہیں ہوتا۔ اور وہ چائے کے گندے ہوٹلوں اور بند ہوتی ہوئی دکانوں کے باہر سے گزر رہے ہوتے ہیں اپنی سرمستی اور قلندرانہ کیفیت میں۔ اور ایسے لوگوں نے خدا جانے کتنا سفر طے کرنا ہوتا ہے۔ آہ خدا انہیں اپنی امان میں رکھے۔ اور ایسے لوگ کہیں نہیں ٹھہرتے۔ چلتے ہی رہتے ہیں نئی نئی مہمات ایجاد کرتے ہیں۔ زندگی کو تو تو میں میں کر کے نہیں گزارتے بس انہیں اپنے سفر سے غرض ہوتی ہے۔ منزل سے نہیں۔ میں نے خط کھول کر سیدھا کیا۔ سگریٹ پھینک کر اسے پڑھنے لگی۔

میری بیوقوف چڑیا۔

تم یہ مت سمجھنا کہ تم جیت گئی ہو۔ دراصل میرے پاس روپے ختم ہو گئے ہیں۔ بس ذرا کاسے پیسے ہوتے تو مجھے ایک منصوبہ سوجھا تھا۔ پھر میں تمہیں رلا کر ہی دم لیتا۔ تجھے پریشان کر کے ہی رہتا۔ کم بخت زندگی میں مجھے ہمیشہ ان روپوں نے ہی مروایا ہے۔ آج ہی چلا جاؤں گا اس شہر سے۔ لاہور بڑا پھیکا اور بے ہودہ شہر ہے۔ یہاں دو قسم کے لوگ مجھے نظر آئے۔ ایک وہ جو مجھتے ہیں دوسرے وہ جو مجھے جاتے ہیں۔ میں تجھے یہ کیوں بتاؤں کہ میں کون تھا اور کہاں جا رہا ہوں۔ یہ بتا کر بھلا میں نے اپنی معنویت ختم کرنی ہے۔ بس اتنی سی بات پر یقین رکھنا کہ میں بہت جلد آؤں گا۔ بہت سے روپے لے کر۔ بس تو مرمت جانا اس وقت تک۔ میں ضرور روپے لاؤں گا تجھے حیران کر دوں گا۔ انسانوں کی اتنی بڑی تعداد میں یہ مت سمجھو ہر شخص تمہاری ہی طرح ذہین و فطین ہو گا۔ بہت سے پاگل بھی ہوتے ہیں میری طرح۔ منصوبہ کیا ہے تمہیں یہ بھی نہیں بتاؤں گا۔ بس میرے جیسے کرداروں کو آ کر چلا جانا چاہیے۔ کوئی چیز بہت دیر تک آنکھوں کے سامنے ٹھہر جائے تو اس کی کشش معدوم ہو جاتی ہے۔ میری جان تو خلاء میں معلق ہے۔ تو او نچائی سے لوگوں کو دیکھتی ہے ایک اچھے بھلے انسان کی اکڑ تمہارے آگے کیا ہے۔ میں نے تجھے جان لیا۔ تو پیار کی خواہاں کبھی بھی نہیں رہی۔ تجھے صرف روپے چاہئیں تاکہ بہت سے لوگ تیری عزت کریں۔ یہ احساس محرومی صرف تیرا ہی نہیں بلکہ ہمارے معاشرے کے ہر فرد کا ہے۔ اس بار تو پنشن کے جمع کیے ہوئے پیسے لٹا دیئے۔ اف یہ کیا مجھ سے لکھا گیا پنشن کے روپے؟ خیر میں اپنے ان لکھے لفظوں کو کاٹ کر بزدلی نہیں دکھاتا۔ میں جا رہا ہوں۔ اب اپنا آبائی مکان بیچ کر ہی آؤں گا۔ وہ جس پر بہت عرصہ سے میری نظر ہے۔ بس اب جذبات کی جنگ شروع

ہے۔ بیچ ڈالوں گا وہ دو منزلہ مکان اور تیرے اندر محبت جگا کر ہی دم لوں گا۔ تجھے حیران کر کے ہی چھوڑوں گا۔ شائد تجھے یقین نہ آئے اور آنا بھی نہیں چاہیے کیونکہ تم نے مجھے ایسی حالت میں دیکھا ہے۔ جو دیکھا یا وہی اخذ کر لیا۔ مگر میں مصیبت زدہ نہیں ہوں۔ میں روپے لے کر ہی آؤں گا تجھے راولا کوٹ کشمیر لے جاؤں گا۔ وہاں میں نے ایک عرصہ گزارہ ہے۔ ہر طرف سبزہ ہی سبزہ ہوگا۔ چیڑ اور یوکلپٹس کے درختوں کے سائے ہوں گے۔ گملوں سے لدا ہوا گھر۔ انگوروں کی بیلیں۔ انار اور امرودوں کے درختوں کی بھینی بھینی خوشبوئیں۔ بلخ کا پلاؤ اور دوڑتے پھرتے نیلی آنکھوں والے خرگوش، تمہیں لے چلوں گا اپنے ساتھ مگر اس وقت جب تیرے اندر یہ لعنتی روپے نہیں بلکہ دل سے محبت جاگ اٹھے گی۔ میں جانتا ہوں کہ انسان بنیادی طور پر معصوم ہوتا ہے اگر اس کی زندگی سے یہ کم بخت روپے نکال دو تو۔۔۔۔ فقط تمہارا۔۔

میں خط پھینک کر سوچنے لگی اگر میں ابھی سے ذہن بنا لوں کہ بوڑھا آئے گا تو اس کے ساتھ ہی نکل جاؤں گی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر۔ ایسی پختہ سوچ میرے ذہن میں بیٹھ جائے تو بوڑھا کبھی نہ آئے گا۔ اگر میں ان سب باتوں کو مذاق میں اڑا کر بھول بھال جاؤں تو بوڑھا اپنی گٹھڑی سمیت چند ہی مہینوں میں آیا ہوگا اور کہے گا چلو بھاگ چلیں اپنے خوابوں میں۔ یہ ہے قسمت کا ہیر پھیر جو عام آدمی کو سمجھ نہیں آتا۔ لیکن میں سمجھتی ہوں اس لیے بہتر یہی ہے کہ میں اسے بھول کر اپنے غلاف میں چھپی رہوں تا کہ وہ آ جائے اور پھر میں اور وہ اسی مکان میں چلے جائیں جہاں پرندوں کا شور ہوتا ہے اور شامیں شفق مائل رنگا رنگ خوبصورتی سے بھیگی ہوتی ہیں۔ بھلا میں کیا بتاؤں بوڑھا ایک ایسی سٹیج پر ہے جہاں پر اسے دھوکا دینا بہت آسان ہے۔ دھوکا دینے کے عمل کے پیچھے لذت ہوتی ہے۔ دھوکے سے روپیہ کمانے میں مزہ ہی بہت آتا ہے۔ اگر بوڑھا اس بار روپے لے کر آیا تو مارا جائے گا۔ مجھے صرف روپے چاہئیں روپے۔ کم بخت ہر مرض کا علاج ہیں اگر اس طرح کے چار پانچ لوگ مجھے مل جائیں تو میں ان سے کبھی نہ ہاروں مگر انہیں ہار کے دکھا دوں۔ میں کبھی حیرانی کے راستے پر نہ چلوں۔ مگر انہیں حیران ہو کر دکھا دوں۔ اپنی فطرت کے عین مطابق کبھی محبت نہ کروں مگر انہیں محبت کر کے دکھا دوں۔ اپنے خوابوں اور خوفناک عزائم کے بارے میں سوچتے ہوئے مجھے سگریٹ کی طلب ہوئی کیونکہ سوچ اور بیزاری سے سگریٹ کی طلب ہوتی ہے۔ میں نے بوڑھے والا پیکٹ اٹھایا یہ کیا اس کی پیکنگ اوپر سے ہے۔ ڈبیا تو وہی ہے جو میں پیتی ہوں۔ مگر اس کے نیچے والا پلاسٹک اوپر کیسے چڑھا ہے۔ میں نے ڈبیا کھولی اور دیکھا سگریٹ کی اس ڈبیا میں ایک خط پڑا تھا اور اس میں سستے والے پانچ سگریٹ دھنسائے ہوئے تھے۔ یہ بھلا کیا نامعقول حرکت ہوئی۔ میں نے خط سیدھا کیا اور اسے پڑھنے لگی۔

میری نحیف چڑیا!

میں جانتا تھا کہ تو یہ پیکٹ کھولے گی۔ اس لیے میں نے تیری ڈبیا سے دو سگریٹ نکال لیے تھے ۔ میں جانتا تھا تو میرا پہلا خط پڑھ کر خواب دیکھے گی۔ خیالوں میں اڑے گی۔ بس میں تیرے خیالات کو رقص کروانا چاہتا تھا۔ بہت ہو لیا صرف اتنا جان لے کہ میں ایک پھوکٹ انسان ہوں جس کے پاس کچھ نہیں سوائے اس شکستہ جسم اور ٹوٹی پھوٹی سانسوں کے ابھی چند منٹ پہلے میں نے تجھے عورت بنا ڈالا۔ عورت جو بھر پور طاقت کے ساتھ خواب دیکھتی ہے اچھے عمدہ اور آئیڈیل گھروں کا۔ اور دوسری بات مجھ جیسے آدمی کو منزل بنا کر خواب دیکھنا تمہاری شکست ہے باقی رہا تمہارے اندر کی عورت کا اکھاڑنا 'تو سن'۔ میں ایک مفلوک الحال انسان ہوں جس کے بوٹوں کا تسمہ پہلے سوراخ سے آخری سوراخ میں سے نکلتا ہے اور اتنا خستہ ہے یہ تسمہ کہ ذرا سا کس کر باندھوں تو ٹوٹ کر میرے ہاتھ میں آ جائے۔ میں ایک بد قسمت شخص ہوں بقیہ زندگی بھی ناکامی و نامرادی میں گزار دوں گا۔ میں وہ بد قسمت شخص ہوں جسے ہمیشہ لڈو کے کھیل میں اٹھانوے کے ہندسے پر سانپ نے کاٹ لیا۔ تیری قسمت میں بس ایسے ہی چیتھڑے ہیں۔ تو بوڑھی ہو چکی ہے۔ تو دو سو روپے والی کنجری ہے اور ایسے گاہک بھی تیرے پاس خود نہیں آتے بلکہ انہیں بھی گھسیٹا جاتا ہے۔ اپنے دلالوں کے ذریعے۔ تو بیک وقت تسکین اور نحوست پیدا کرنے والی مشین ہے......مشین۔

اس کا خط پڑھتے ہی میرے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ مجھے محسوس ہوا کہ جیسے میرے سارے جذبات اندھے کنوئیں میں اتر گئے ہوں۔ مرد ذہانت میں عورت سے زیادہ قوی ہوتا ہے مان لیا اور عورت جس قدر چالاک بننے کی کوشش کرتی ہے اتنی ہی احمق لگتی ہے۔ میں چڑچڑی ہو کے غصے سے بھرنے لگی۔ ایک مرتبہ میرے سامنے آ جائے تو اس کی ٹانگیں توڑ دوں اور اسے مار کر بھوسا بھر کے ہمیشہ کے لیے کپڑے لٹکانے والی کلی میں لٹکا دوں۔ ذلیل کتا۔

صبح کے چار بج رہے تھے۔ میں ساکت و بے جان دکھ میں مبتلا ہو کر بڑے مزے سے بستر پر گری کہ اچانک ٹائم پیس میری ریڑھ کی ہڈی میں جا لگا۔ دکھ میں الجھن کا بھی ایک الگ مزہ ہوتا ہے۔ ریڑھ کی ہڈی میں ٹائم پیس لگتے ہی میری ساری کیفیت میری سوچ درد میں ڈوب گئی اور طبیعت میں تلخی پیدا ہو گئی جو ناحق خون بہانے والوں میں ہوا کرتی ہے۔ اس کے بعد جو خیالات آئے وہ انتہائی مایوس کن اور مریضانہ سے تھے جو مجھے ٹائیفائیڈ کے دنوں میں آیا کرتے تھے۔ آوارہ سرکش بے قابو خیالوں کا ہجوم طائرانہ انداز میں آنکھوں کے سامنے سے ہو کر گزرنے لگا۔ ایکٹرس کا پوسٹر دیوار سے اکھڑ کر ایک ٹیپ کے سہارے نیچے لٹک رہا تھا۔ اور سامنے دیوار سے جو پلستر اکھڑا ہوا تھا اسے دیکھ کر معلوم ہوتا تھا جیسے دیوار پر بھیڑیا نما کتا بنا ہو۔ لوگوں کے پاس ایک زندگی ہوتی ہے جس کا استعمال وہ بڑا سوچ سمجھ کر کرتے ہیں۔ فیصلہ کرتے وقت اچھی

ذات میں اہم ہوئے ہوتے ہیں۔ دیوار پہ لگے کیلنڈروں دنوں ہفتوں کی اہمیت ہوتی ہے۔ تاریخوں کے مطابق خوشیاں ان کے اندر اترتی ہیں۔ لیکن میری زندگی میں وہی جمود۔۔۔۔۔۔ ایک ہی ڈھب سے دگڑ گوں دگڑ گوں بیل کی رفتار کی طرح زندگی کی۔ اب تمام خیالات میرے دماغ سے نکل کر روشندان اور کمرے کے مختلف سوراخوں سے باہر جا رہے تھے اور میں ذہنی طور پر ہلکی ہو رہی تھی۔ ذلت و رسوائی کے بعد خیالات کا ہجوم ٹھہر جائے تو انسان پاگل ہو جاتا ہے اور اگر نکل جائے تو ہلکا اور ان لوگوں کے ذہن میں یہ ہجوم نہیں ٹھہرتا۔ جنہیں ذلت کے مدمقابل اور بہت سی جگہوں سے خوشیوں کی توقعات ہوتی ہیں۔ مجھے کسی بھی انسان سے کسی قسم کی کوئی توقع ہے نہ تبدیلی کا امکان اس کے باوجود میرا سر ہلکا ہو رہا تھا اور میں ہوا میں تحلیل ہو رہی تھی۔ میں صبح سورج نکلنے تک جاتے ہوئے خیالات میں غرق بے جان و بے حس دیوار پر بنے بھیڑیا نما کتے کو دیکھتی رہی جیسے دم نکل رہا ہو۔

---

مرزا حامد بیگ

# جانکی بائی کی عرضی

کے ایل رلیا رام ریٹائرڈ سیکرٹری بہاور میونسپل کمیٹی لاہور' آج پھر رات گئے اپنی اسٹڈی میں پرانے اخباری تراشوں' بیانات اور نجی یادداشتوں پر مبنی فائل لیے بیٹھے تھے۔ یہ ایک ایسی دستاویز تھی جسے انہوں نے اپنے گھر میں بھی ہمیشہ انڈر لاک اینڈ کی رکھا۔

آج انہیں سانس کی تکلیف نہ ہونے کے برابر تھی' ڈاکٹر کے مطابق ان کا بلڈ پریشر نارمل تھا اور شوگر ٹیسٹ کی رپورٹ اے ون۔

گزشتہ کئی برسوں میں تو ایسا کم کم ہی ہوا' لیکن جب کبھی ایسا ہوتا' اس روز وہ رات کا کھانا وقت سے پہلے کھا لیتے اور بیڈ روم کا رخ کرتے۔ پھر تا دیر کروٹ لیے بستر پر پڑے رہتے۔ جب بیگم گھر کا کام نمٹاتے ہوئے ملازمہ کو آخری ہدایات دے کر کمرے میں آتیں تو ہمیشہ دھیرج سے صرف ایک ہی سوال پوچھتیں۔ "کیا سو گئے؟" جواب میں وہ چپ چاپ پڑے رہتے اور جب وہ گہری نیند سو جاتیں تو اٹھتے اور اپنی اسٹڈی کا رخ کرتے۔

آج بھی ایسی ہی ایک رات تھی۔ جب جانکی بائی کی یاد چہار جانب سے امڈی پڑتی تھی اور انہیں سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کریں؟ اس وقت کہاں ہو گی وہ؟ کن حالات سے گزر رہی ہو گی؟ انہوں نے سوچا۔

اسٹڈی کی میز پر ان کے سامنے جھکے ہوئے ٹیبل لیمپ کی دودھیا روشنی میں برسا برس پرانے اخباری تراشوں بیانات اور نجی یادداشتوں پر مبنی فائل دھری تھی۔ وہ تادیر اسے الٹ پلٹ کر دیکھتے رہے۔ پھر کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس کا ربن کھولا۔ فائل کے شروع میں مختلف پرانے اخبارات کے تراشے تھے' جن میں انجمن اصلاح بدکاراں لاہور کی جانب سے جاری کردہ بیانات کے علاوہ شراب فروش الٰہی بخش کنجر کے خلاف لالہ کرم چند پوری کے مشہور مقدمہ 1915ء کی تفصیل موجود تھی۔ 1921ء کے روزنامہ "سیاست" کا ادارتی نوٹ کچھ یوں تھا:

صد افسوس کہ میونسپل کمیٹی لاہور نے 1913ء میں قرارداد نمبر 472 کے ذریعے ہیرا منڈی کو ممنوعلاقہ قرار دے کر کوچہ شہباز خاں کو اس حکم سے مستثنیٰ کر دیا۔ یہی سبب ہے کہ شہر لاہور کی تمام طوائفیں کوچہ شہباز خاں اور اس کے نواحی علاقہ جات میں پھیل گئیں۔ اب کیا ہی اچھا ہو کہ کوچہ شہباز خاں اور اس کے نواح کو بھی اس گندگی سے پاک کر دیا جائے۔

ریٹائرڈ صاحب بہادر نے اس اوارتی نوٹ کو پڑھنے کے بعد سوچا' کیا ہنگامہ خیز زمانہ تھا 1921ء کا جب محمد علی جوہر کی خلافت تحریک زوروں پر تھی' گاندھی جی نے تحریک کا بڑھ چڑھ کر ساتھ دیا تھا مسلمانوں نے گئو ہتیا سے ہاتھ روک لیا تھا' خالق دینا ہال کراچی میں جوہر پر بغاوت کا مقدمہ چلا تھا اور انہیں دو سال قید سخت ہو گئی تھی۔ لیکن اس ہنگامے کے اندر ایک اور ہنگامہ پل رہا تھا' لاہور شہر کے بازار حسن کی ایک کلاسیکی داستان۔ لیکن ہوا سب کچھ آنا فاناً ہی۔

ان دنوں میونسپل کمیٹی لاہور کے حکام بالا کے نام ایک محضر نامہ موصول ہوا۔ ہندو' مسلمان اور سکھوں کے سیکڑوں دستخطوں پر مشتمل اس درخواست میں استدعا کی گئی تھی کہ لاہور کی مختلف آبادیوں میں قائم شدہ چکلے ختم کیے جائیں اور پیشہ ور عورتوں کو شریف آبادیوں سے نکال باہر کیا جائے۔ اس کے بعد تو کمیٹی کے نام اس نوع کے محضر ناموں کا جیسے تانتا بندھ گیا۔ تب بھی کمیٹی ان درخواستوں کا نوٹس نہ لیتی پر ایک مصیبت اور آن پڑی۔ انجمن اصلاح بدکاراں کے رضا کاروں نے پیشہ ور عورتوں کے کوٹھوں کے سامنے کھڑے ہو کر بدکاری کے خلاف تقاریر شروع کر دیں۔ جس کے جواب میں کوٹھوں پر سے تقریر کرنے والوں پر کوڑا کرکٹ پھینکا جانے لگا۔ انجمن اصلاح بدکاراں کے متحرک کارکن پہلوان امیر بخش کے ساتھ دوران تقریر جب ایسا ہی ایک واقعہ پیش آیا تو ان کے ساتھیوں اور کوٹھے کے تماش بینوں کے بیچ ہاتھا پائی شروع ہو گئی۔ معاملہ بڑھا تو نقص امن کے خطرے کے پیش نظر میونسپل کمیٹی لاہور کی جنرل باڈی میٹنگ منعقدہ نومبر 1921ء میں زیر دفعہ 218 میونسپل ایکٹ 3 بابت 1911ء کے تحت انارکلی (عقب کمرشل بلڈنگ) دھوبی منڈی (عقب پرانی انارکلی)' دہلی دروازہ' لاہوری دروازہ' لوہاری منڈی' لنڈا بازار' تا سرائے سلطان' شالا مار روڈ' فورٹ روڈ اور موتی بازار کو عام پیشہ ور رنڈیوں کے لیے ممنوعہ علاقہ جات قرار دے دیا گیا۔ اگلے روز میکیگن پریس سے شائع کردہ یہ اہم فیصلہ عوامی اشتہار کی صورت شہر لاہور کی دیواروں پر چسپاں ہو چکا تھا۔

اس اشتہار کے اجرا کے چند روز بعد جملہ طوائفوں اور کوٹھی خانوں کے مالکان کو فرداً فرداً نوٹس ملنے شروع ہو گئے۔ اس سلسلے کے ایک نوٹس کی کاربن کاپی فائل میں موجود تھی۔

فارم نمبر 1

از سررشتہ سیکرٹری میونسپل کمیٹی لاہور

بنام نازو بنت نامعلوم ساکن لاہور محلہ دھوبی منڈی نمبر 701

چوں کہ میونسپل کمیٹی لاہور نے اس رقبے کو جو شارع رہائشی سے زیر دفعہ 152 میونسپل ایکٹ نمبر 3-1911ء کوٹھی خانہ یا چکلہ رکھنے یا عام پیشہ رنڈی کی رہائش کے لیے ممنوع قرار دیا ہے۔ پس آپ کو بذریعہ اطلاع نامہ ہذا مطلع کیا جاتا ہے کہ عرصہ ایک ہفتے میں شکایت مذکور دور کر دیویں یعنی مذکورہ بالا رقبہ ممنوعہ میں سے اپنی رہائش چھوڑ دو۔ ورنہ آپ کے خلاف کارروائی کی جاوے گی۔

المرقوم۔۔۔۔ماہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔1921ء

نوٹ

مگر آپ کو کوئی اعتراض نسبت نہ دور کرنے شکایت مذکور ہو تو ہمارے پاس علاحدہ تحریری جواب بھیج دیویں۔ پشت نوٹس ھذا پر تحریر کیا ہوا عذر قابل غور نہ ہوگا۔

صاحب بہادر کو اچھی طرح یاد تھا کہ کمیٹی کے اس اقدام کے خلاف سب سے پہلے دھوبی منڈی عقب پرانی انارکلی کی طوائفوں نے چارہ جوئی کی تھی اور میونسپل کمیٹی کے علاوہ ڈپٹی کمشنر، کمشنر اور گورنر پنجاب کو درخواستیں گزاری تھیں۔ کاغذات کو الٹتے پلٹتے سے 21 نومبر 1921ء کو لالہ نتھو لال وکیل کی معرفت لکھی گئی ایک عرض داشت سامنے آگئی۔ جس میں لکھا تھا:

ہم برسوں سے اس محلے میں رہ رہی ہیں اور یہاں کے لوگوں کو ہم سے کبھی کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی ہے۔ یہ محلہ گھرانوں سے بہت دور ہے اور سکھوں کے عہد سے طوائفوں کے لیے مخصوص چلا آ رہا ہے۔ آج سے چھ سات برس پہلے شراب فروش الٰہی بخش کنجر کے خلاف لالہ کرم چند پوری کے دائر کردہ مقدمے میں ڈپٹی کمشنر نے ذاتی معائنے کے بعد یہ فیصلہ دیا تھا کہ چکلہ اور شراب خانہ جہاں ہیں وہیں رہنے چاہئیں۔ لیکن یہاں کوئی پانچ چھ آدمی ایسے ہیں جو ذاتی وجوہ کی بنا پر ہمیں پریشان کرنے کی ترکیبیں سوچتے رہتے ہیں۔ حد یہ ہے کہ وہ اس محلے کے رہنے والے بھی نہیں ہیں۔ یہ لوگ بڑے معمولی قسم کے ہیں اور تحریک خلافت کے کارکن ہیں۔ انہوں نے درخواست گزاروں سے خلافت کمیٹی کے لیے روپیہ حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن اس میں ناکامی کے بعد انھوں

نے میونسپل کمیٹی کو ہمارے خلاف درخواستیں دینی شروع کر دی ہیں اور ان لوگوں کی غلط رہنمائی میں کمیٹی نے ہمیں محلہ خالی کرنے کے نوٹس جاری کر دیے ہیں۔ لیکن کوئی متبادل جگہ تجویز نہیں کی ہے۔

-------------- آپکی یہ ناچیز درخواست گزاران عمر کے اس مقام پر جا پہنچی ہیں کہ طویل عرصے تک یہ پیشہ کرنے کے بعد اب کوئی ان سے بیاہ کرنے کو تیار نہیں اور نہ ہی انہیں کسی گھر میں ملازمت مل سکتی ہے۔ عمر رسیدگی کی وجہ سے وہ اب کوئی اور نیا کام بھی نہیں کر سکتیں۔ انہی وجوہ کی بنا پر انہیں کسی دوسری جگہ کرائے پر مکان بھی نہیں مل سکتے۔

ان سب وجوہ اور واقعات و کوائف کے باوجود ہم اس خشک اور مایوسیوں کی زخم خوردہ زندگی میں ہزاروں انسانوں کے لیے امید اور طمانیت کی شمع جلائے بیٹھی ہیں۔

ہم جو بہت غریب ہیں اور آئے دن کے جرمانوں نے ہمیں افلاس کی آخری حدوں تک پہنچا دیا ہے آپ سے رحم کی درخواست کرتی ہیں۔

متعدد نام اور نشان ہائے انگوٹھا جات

لیکن ہونا کیا تھا۔ دھوبی منڈی عقب پرانی انارکلی کی جسم فروش اور مغنیہ دیرو' جیواں' کرم نشاں' افضلاں' سردار' وبدرو' پارو' تیجو' مالو' زیبو' راکھی' عزیزو' اور سردار پٹھانی وغیرہ کی یہ درخواست سارنگی کے ٹوٹے ہوئے تار سے بھی زیادہ بے اثر ثابت ہوئی اور انہیں ان کے گھروں سے نکال باہر کیا گیا۔ یہی حال لوہاری منڈی' دہلی دروازہ' لنڈا بازار' تا سرائے سلطان' شالا مار روڈ' فورٹ روڈ اور موتی بازار کی طوائفوں کا ہوا۔

جسم فروشی کے الزام کی بنیاد پر کمیٹی کی جانب سے نوٹس کردہ طوائفوں کی صحیح تعداد تو ریٹائرڈ صاحب بہادر کو یاد تھی اور نہ فائل میں کہیں مذکور تھا البتہ اتنا یاد تھا کہ چھ سو طوائفیں ایسی تھیں جن پر نوٹس کی تعمیل نہ کرنے کی صورت میں مقدمات چلائے گئے اور انہیں پانچ روپے سے لے کر پچاس روپے تک کے جرمانے کی سزا ہوئی۔

فائل میں اگلے صفحے پر صاحب بہادر کی اپنے ہاتھ سے لکھی یادداشتیں درج تھیں۔ روز بہ روز مدھم پڑتی ہوئی نیلی روشنائی سے انھوں نے کبھی گئے وقتوں میں لکھا تھا "میونسپل کمیٹی کے ایک کونسلر محمد گھسیٹا نے رائے ظاہر کی ہے کہ موتی بازار اور دوسری جگہوں سے جو خانگیاں نکل کر گزر شہباز خاں (اندرون ٹکسالی دروازہ) میں آباد ہو گئی ہیں انہیں وہاں سے نکال دیا جائے اور یہاں پہلے سے رہنے والی مالک مکان

طوائفوں سے کہا جائے کہ وہ کھڑکیوں کے سامنے پردے لٹکا دیا کریں۔ دھوبی منڈی کی بعض خانگیوں نے پان سگریٹ کی دکانیں کھول لی ہیں اور یہ دکانیں دلالی کے اڈے بن گئی ہیں۔ ان کا بھی کوئی انتظام کرنا ضروری ہے۔"

ایسے میں صاحب بہادر کو چیت رام روڈ کی جانکی بائی کی کھڑکی کا جالی دار پردہ یاد آیا اور پان بیڑی سگریٹ کی دکان کے باہر کھڑا لال رومال والا دلال 'مودا کنجر'۔ وہ تا دیر سر نیہوڑائے بیٹھے رہے۔ پھر جیسے پرانی یادوں کا ایک سلسلہ تھا جو چل نکلا۔ انہیں یاد آیا کہ موسم سرما کی وہ ایک حسین شام تھی جب تعلیم سے فراغت کے بعد ملازمت کی تلاش میں کان پور سے لاہور آیا ہوا ایک نوجوان ریلوے اسٹیشن سے سانجھے کے تانگے میں بیٹھ کر بھاٹی دروازے کے سامنے اترا تھا اور بھاٹی سے لوہاری تک کی چہل قدمی کرتے کرتے بے خیالی میں ٹکسالی گیٹ کی طرف نکل گیا تھا۔ پھر گھومتے گھومتے چیت رام روڈ تک آیا۔ اس وقت چیت رام روڈ کے لیمپ پوسٹ روشن ہو چکے تھے اور بازار حسن جوبن پر تھا۔ یوں ہی گھومتے گھامتے اس نے سارے پر نگاہ کی۔ ہیجڑوں کی بیٹھکیں' نکیائیوں والی گلی اور ڈیرہ دارنیوں کا بازار۔ ایک گلی میں سے گزرتے ہوئے قریب ہی کی بیٹھک سے کسی مغنیہ نے تان لگائی "تمہارے نیناں نے جادو کیا" طبلے کی تھاپ اور سارنگی کی سنگت پر گھنگرو جھنجھنا اٹھے تو وہ تیز قدم اٹھاتا "پوری تھیٹر" کی طرف نکل لیا۔

ابھی اس نے "پوری تھیٹر" کے برابر والے پان بیڑی فروش سے خوش بو والا بجگی والا پان بنوایا ہی تھا کہ گلے میں سرخ رومال اڑسے ایک دلال نے اسے آ لیا۔

"باؤ جی' کیا رکھا ہے یہاں۔ آیئے میرے ساتھ۔"

"لیکن کہاں؟ میں تو یوں ہی نکل آیا اس طرف بنا کچھ سوچے سمجھے۔"

"پہلی بار ایسا ہی ہوتا ہے صاحب۔۔۔ چلیے تو۔۔۔۔"

"لیکن کہاں؟"

"جہاں میں آپ کو لے کر جاؤں۔ صاحب' ہیرا ہے ہیرا۔"

"نہیں بھائی۔ میں بہت معمولی آدمی ہوں اور فی الوقت جیب کا بہت ہلکا۔"

"کوئی بات نہیں۔ آپ آیئے تو سہی۔ دیکھ تو لیجیے' فیصلہ بعد میں کیجیے گا۔"

سرخ رومال والا اسے "پوری تھیٹر" سے اچک کر ایک بار پھر چیت رام روڈ پر لے آیا۔ پھر یکایک اس نے بائیں ہاتھ کی گلی میں مڑتے ہوئے کہا "آیئے صاحب آیئے" اس کے پیچھے ایک مکان کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے نوجوان قدرے ہچکچاہٹ کا شکار تھا لیکن سرخ رومال والا تو جیسے چھلاوہ تھا چھلاوہ۔ اس نے

جھٹ پٹ بیرونی دروازہ کھول کر آواز لگائی "جانکی! او جانکی۔۔۔ دیکھ تو! تیرے ملنے والے آئے ہیں۔"

سیڑھیوں پر کھڑے کھڑے نوجوان نے اندر نگاہ کی۔ سپید و سیاہ ٹائلوں والے صاف ستھرے دالان میں طاقچے پر لیمپ روشن تھا۔ دالان کی داہنی جانب دو جڑواں کمرے تھے اور بائیں جانب ایک صاف ستھرا باورچی خانہ۔ سامنے توشہ خانے کے ساتھ ایک اجلا غسل خانہ تھا' جس کے نیم وا دروازے میں سے ایک سانولی سی لڑکی نے لحظہ بھر کو باہر کی سمت جھانکا تو وہ دونوں دالان میں کھڑے تھے۔

"جانکی! تیرے ملنے والے۔" سرخ رومال والے نے برابر کا کمرہ کھول دیا۔

"آیئے صاحب! آیئے آرام سے بیٹھیے۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔ اس علاقے میں مودے کنجر کی مرضی کے بغیر ہوا بھی نہیں چلتی۔ میں یہ گیا اور یہ آیا۔" سرخ رومال والے نے چٹکی بجاتے ہوئے مڑ کر کمرے کا دروازہ بھیڑ دیا۔

اب نوجوان نے کسی قدر گھبراہٹ کے ساتھ کمرے کا جائزہ لینا شروع کیا۔ دائیں ہاتھ دیوار سے جڑا تکیے والا سرخ روغنی پلنگ' ایک چھوٹی سی تپائی کے ساتھ جوڑ کر رکھی ہوئی آرام کرسی' فرش پر بچھی ہوئی دری اور دیواروں پر اداکارہ بلوریا کی فلموں کے متعدد پوسٹرز "پردیسی" "بیرسٹرز وائف" "طوفان میل" ۔ابھی وہ فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ کرسی پر بیٹھے یا پلنگ پر یا چپکے سے نکل لے کہ دروازہ کھلا۔

"آپ بیٹھتے کیوں نہیں۔ تشریف رکھیے نا۔ میں ہوں جانکی۔ بس جیسی بھی ہوں' آپ کے سامنے ہوں۔"

نوجوان نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے جانکی کی طرف مڑ کر دیکھا۔ وہ اس وقت دالان کی سمت کھلنے والے دروازے میں قدرے جھک کر کھڑی تولیے سے جھٹک جھٹک کر اپنے سینے کے رخ پر پڑے ہوئے گیلے بال خشک کر رہی تھی۔

"رام جانے آپ کو کیسی لڑکی کی تلاش ہے؟ میں نہ تو گوری چٹی ہوں اور نہ بناؤ سنگھار ہی آتا ہے مجھے۔ بس ایسی ہی ہوں۔" جانکی نے سلسلہ کلام جاری رکھا۔

"یہ مودا کنجر کون ہے؟"

"وہی جو آپ کو یہاں چھوڑ کر گیا ہے۔ اب اس نے پلٹ کر نہیں آنا۔"

"اے جانکی! تیرا مہمان رات رہے گا یا ایک آدھ بار بیٹھنے کو آیا؟" برابر والے کمرے سے چھالیہ کترتے ہوئے سروتے کی کھٹ کھٹ کے ساتھ کسی بزرگ خاتون کی آواز ابھری۔

جواب میں جانکی چپ رہی اور اسی تولیے سے گیلے بال خشک کرتی رہی۔

''اے جانکی بولے کیوں نہیں؟''

تب بھی جواب میں جانکی چپ رہی۔

''رات رہوں گا میں۔'' نوجوان نے شب بسری کا فیصلہ کرتے ہوئے اونچی آواز میں جواب دیا۔

اس کے بعد کمرے میں چپ کی چادر پھیلتی گئی۔ نوجوان کے چہرے سے گھبراہٹ عیاں تھی۔ جانکی کا رخ دیوار میں جڑے آئینے کی طرف تھا اور وہ رخ بدل بدل کر کنگھی کر رہی تھی۔

''جانکی' اس کوچے میں نیا آدمی ہوں۔ لاہور میں آج میری پہلی رات ہے اور جیب میں بہت زیادہ روپے بھی نہیں۔''

''روپیہ پیسہ تو ہاتھ کی میل ہے بابو جی۔ یہ بات تو کرو ہی نا۔ مجھے اجی بلھوریا پسند ہے' اس لیے آپ بھی پسند ہیں۔ کوئی منڈوا دیکھا اس کا؟ پنجاب میل' میں ڈاکٹر بنا تھا۔''

''نہیں ابھی تک نہیں۔ صرف نام سنا ہے اس کا یا تصویریں دیکھی ہیں۔ سینما کے باہر۔''

''آپ کا قد کاٹھ' چہرہ مہرہ۔۔۔۔ مونچھیں تو بالکل بلھوریا جیسی ہیں۔''

''شاید'' نوجوان پہلی بار ہلکا سا مسکرایا۔

جانکی نے دروازہ بھیڑتے ہوئے کمرے میں روشن لالٹین گل کر دی۔ اس وقت گلی کے سمت کھلنے والی کھڑکی سے چوراستے میں روشن لیمپ پوسٹ کی ہلکی زرد روشنی کے ساتھ خنک ہوا باریک جالی دار پردے سے چھن چھن کر اندر آ رہی تھی۔

''تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوق نظر ملے''

برابر والی کسی بیٹھک سے ڈوبتی ابھرتی' کسی مغنیہ کے گانے کی آواز آ رہی تھی۔

''کیسا ہے تمہارا گھر۔ مجھے نہیں دکھاؤ گی؟''

میرا گھر؟ وہ کھلکھلا کر ہنسی۔ ''چلیں اگر آپ ایسا سمجھتے ہیں تو یوں ہی سہی۔ کس نے روکا ہے آپ کو گھر دیکھنے سے۔ آئیں میرے ساتھ۔''

اور وہ جانکی کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ برابر والے کمرے میں اندھیرا تھا۔ توشہ خانے میں ایک مریل سا طبلچی لالٹین کے مدھم روشنی میں اکڑوں بیٹھا جانے کیا کر رہا تھا۔ والان سے لوہے کی گول سیڑھی سیدھی چھت کو نکل جاتی تھی۔ جس کے ذریعے وہ دونوں چھت پر چلے گئے۔ ہلکی پروا میں ریلنگ کا سہارا لیے وہ بہت دیر تک پوری تھیٹر سے اٹھنے والی آوازیں سنتے اور بادشاہی مسجد کے فلک بوس میناروں کا نظارہ کرتے رہے۔ جب چیت رام پر مجرے کی بیٹھکیں اجڑ گئیں اور ہر طرف مکمل سکوت چھا گیا تو وہ نیچے اتر آئے۔

اب کمرے میں ٹھنڈک بڑھ گئی تھی۔

"کھڑکی بند کردوں یا کھلی رہے؟" جانکی نے پلنگ پر لیٹتے اور اپنے برابر میں اس کے لیے جگہ بناتے ہوئے پوچھا۔

"بے شک کھلی رہے"

اگلے روز علی الصبح ان کے کمرے کا دروازہ ایک چھپاکے کے ساتھ کھلا اور ہنسی ٹھٹھا کرتی نوجوان لڑکیوں کا ایک غول کا غول اندر امڈ آیا۔ انھوں نے آتے ہی ان دونوں پر سے ریشمی رضائی کھینچ کر دور پھینک دی اور ہنستے ہنستے دوہری ہوگئیں۔ جتنی دیر میں یہ دونوں ہڑبڑا کر اٹھے اور اپنے اوپر بستر کی چادر لی اتنی دیر میں وہ ساری کی ساری قہقہے لگاتی اور اک دوجی کے کولھوں پر چٹکیاں کاٹتی' نیچے دری پر بیٹھ چکی تھیں۔

پھر ایک لڑکی کہیں سے ہارمونیم اٹھا لائی اور دوسری نے ڈھولک سنبھال لی۔ پھر وہ ساری کی ساری تالیاں بجا بجا کر شادی بیاہ کے گیت گانے لگیں۔ بہت دھما چوکڑی مچائی انھوں نے اور یہ دونوں اپنے اوپر چادر تانے بس مسکراتے رہے۔ تا وقتیکہ مودا کنجر حلوا پوری کا ناشتا تھامے آ دھمکا۔

"ارے یہ کیا؟ یہ کھٹ راگ کرنا اپنی اپنی نتھ اترائی پر۔ چلو بھاگو یہاں سے۔ کشتیاں نہ ہوں تو" مودے نے لڑکیوں کو گھر کی دی تو وہ اٹھ کر بھاگ کھڑی ہوئیں۔ مودے کنجر کو اپنے انعام سے غرض تھی جو اسے مل گیا اور وہ نکل لیا۔

ناشتے کے بعد نوجوان نے بھی وہاں سے نکلنا تھا اور اس وقت تک خوب دن چڑھ آیا تھا۔ اس لیے جب وہ نہا دھو کر جانے کے لیے تیار ہوا تو اس نے کنگھی کرتے ہوئے اپنا بٹوہ جانکی کے ہاتھ میں تھما دیا۔

"جا ہو تو سب کے سب رکھ لو۔"

"نہیں۔ آپ پردیسی ہیں اور بے روزگار بھی۔ آپ مجھے اچھے لگے۔ میری ایک عرضی ہے کہ مجھ سے ملتے رہیے گا۔ جب افسر بن جائیں نا تو جو جی میں آئے دیجیے گا یا میں خود مانگ لیا کروں گی۔ لیکن آج کچھ نہیں لوں گی۔"

نوجوان نے بہت چاہا کہ جانکی اپنا معاوضہ یا انعام لے لے لیکن وہ مسلسل انکار میں سر ہلاتی رہی۔ پھر وہ وہاں سے نکل آیا۔

بے روزگاری کے دنوں میں ہفتے عشرے وہ جانکی سے ملنے جاتا رہا۔ اس سے شادی کے عہد و پیماں بھی کیے۔ جس کی قطعاً کوئی ضرورت نہ تھی اور جانکی ہر بار اس کی آمد پر اپنے گاہکوں کو یہ کہہ کر ٹالتی رہی کہ بیمار ہے' خدمت کے قابل نہیں۔

صاحب بہادر کو گئے وقتوں کی ایک چلچلاتی دوپہر اب تک یاد تھی۔ جب مودے کی معرفت امی بلوریا کا پیغام ملنے پر سفید چادر میں لپٹی لپٹائی جانکی بہانے سے لیڈی ولنگڈن ہسپتال چلی آئی تھی اور وہاں سے وہ دونوں تانگے پر نور جہاں کے مقبرے کی طرف نکل گئے تھے۔

اس روز شاہدرہ کے گوالوں کی کچی آبادی میں گھومتے پھرتے ان دونوں کو جس کسی نے بھی دیکھا میاں بیوی ہی سمجھا اور اس آوارہ گردی کے دوران کتنی بھوک لگی تھی دونوں کو۔۔۔ اور ہاں' وہ نیک دل بڑھیا' جس نے لسی کے ساتھ باسی روٹی سے ان کی تواضع کرتے ہوئے پوچھا تھا'' کے دن ہوئے شادی کو۔ کوئی بچی بچہ؟''

تب جانکی کس طور پر لجائی تھی۔ چادر کے پلو میں منھ چھپائے اور سر نیوڑائے کتنی دیر تک ہنستی رہی تھی۔

ایک طویل سلسلہ تھا یادوں کا' جس کا اور چھور کوئی نہ تھا۔ جیسے طوفان میل دھواں اگلتی' چیختی چنگھاڑتی چلی جا رہی تھی اور اس کی چھت پر امی بلوریا کے ہاتھ سے مس سلوچنا کا ہاتھ چھنا چاہتا تھا۔

حالات کچھ کے کچھ ہوتے چلے گئے۔ کچھ بس میں بھی تو نہیں تھا ان دنوں' انہوں نے سوچا۔ اچھی ملازمت مل گئی میونسپل کمیٹی میں تو سفید پوشی آڑے آئی اور جانکی کی طرف جانا یکسر چھٹ گیا۔ یہ بتائے بغیر کہ ملازمت مل گئی۔ کس کس سے نہ پوچھا ہوگا اس نے۔

یہ سوچتے ہوئے وہ تادیر سر نیوڑائے بیٹھے رہے۔ فائل کا اگلا صفحہ پلٹا تو ان کے سامنے ان کے اپنے ہی ہاتھ کی لکھی ایک اور یادداشت آ گئی:

> سب حالات ٹھیک جا رہے تھے کہ اچانک 28 جنوری 1922ء کی صبح کونسلر لالہ اشناک رائے نے کمیٹی میں اک نیا ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ اس نے میرے روبرو بتایا کہ اندرون ٹکسالی ایک ایسے مکان کی نشان دہی کی گئی ہے جو لینڈ اینڈ (Land End) کے نام سے مشہور ہے اور جہاں باقاعدہ چکلہ قائم ہے۔ جب کہ اس سے قبل یہاں بظاہر ڈیرہ دارنیاں قیام پذیر تھیں۔ پھر لالہ جی نے زور دے کر کہا کہ یہ مکان چوں کہ ایک ایسے رستے پر ہے جہاں سے شریف گھرانوں کی مستورات ڈیرہ صاحب کی زیارت اور راوی پر اشنان کو جاتی ہیں اس لیے اس مکان کو فوراً مشکوک چال چلن والی عورتوں سے خالی کروایا جائے۔ افسوس کہ کمیٹی نے ایک اور قرارداد کے ذریعے یہ فیصلہ کر لیا کہ

اندرون ٹکسالی کے تمام بازار اور محلے' کوچہ شہباز خاں سمیت طوائفوں سے
خالی کروائے دیے جائیں۔ اس فیصلے کے تحت میں نے یہاں کی طوائفوں کو
نوٹس جاری کر دیے ہیں اور ایک اطلاع عام بھی جاری کر دی ہے' جسے
بازاروں میں چسپاں کروا دیا گیا۔ رلیا رام بہ قلم خود۔

اس یادداشت کے ساتھ اطلاع نامہ عام کی کاپی منسلک تھی۔

حسب ریزولیشن 196 جنرل کمیٹی منعقدہ 3 اگست 1922ء
اطلاع نامہ ہذا زیر دفعہ 152 (1) الف' ب' میونسپل ایکٹ 1911ء جاری
کیا جاتا ہے کہ میونسپل کمیٹی لاہور نے رقبہ جات مندرجہ ذیل میں عام پیشہ ور
رنڈیوں اور پیشہ کرنے والی عورتوں کے رہنے اور کوٹھی خانوں کے جاری رکھنے
کی ممانعت کر دی ہے۔ جو عام رنڈی یا پیشہ ور عورت اس علاقہ ممنوعہ میں
رہائش رکھے گی یا جو شخص اس علاقے میں کوٹھی خانہ جاری کرے گا۔ اس کے
ساتھ بموجب دفعہ 152 (2) قانونی سلوک کیا جاوے گا۔ ان رقبہ جات
ممنوعہ میں' ان مکانات میں عام رنڈیوں کی رہائش و کوٹھی خانہ جاری رکھنا
ممنوع ہے جو شارع عام پر واقع ہے۔

رقبہ جات ممنوعہ (1) از قبر نوگزہ تا ٹکسالی دروازہ (2) از پوری تمیز
تا چورستہ بازار جج عبداللطیف واقع ہیرا بازار (3) از قبر نوگزہ بہ جانب تاحد
بمعہ مکان موسومہ "لینڈا ینڈ"۔

25 اگست 1922ء

دستخط

مسٹر کے رلیا رام ایم ایل سی
سیکرٹری صاحب' بہادر میونسپل کمیٹی لاہور

اس اطلاع نامے کے نچلے کونے میں مدھم نیلی روشنائی کے ساتھ لکھا تھا "لیکن میں نے جانکی کو
بے دخلی کا یہ نوٹس جاری ہونے سے بچا لیا۔ رلیا رام۔"

فائل میں میونسپل کی اس وسیع مہم سے متعلق اس وقت کے مختلف اخبارات کے تبصروں کے ساتھ
'حبیب جلال پوری کے اخبار "سیاست" کا اداریہ بہ عنوان "بلدیہ لاہور اور سیہ کاری" بھی منسلک تھا۔ جس پر

صاحب بہادر نے سرسری نظر ڈالی:

ہمیں معلوم ہوا ہے کہ ہیرا منڈی اور ٹبی لاہور کی بازاری اور فاحشہ عورتیں اس سلوک کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے والی ہیں۔۔۔۔۔ اس میں شک نہیں کہ موجودہ انگریزی قانون کھلے بندوں حسن فروش عورتوں کے بالا خانے پر ایسے حیا سوز افعال کے ارتکاب کی اجازت دیتا ہے جو انسانیت کے لیے باعث ننگ و عار ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ کیا لاہور کے ہندوؤں' مسلمانوں' سکھوں اور عیسائیوں کا مذہب اور حمیت و غیرت کا قانون انہیں اس امر کی اجازت دیتا ہے۔ آج سوراج اور خلافت کے اغراض ومقاصد کی تکمیل کے لیے قوم کے ذمہ دار اور سربرآوردہ افراد کو ایک ایک پیسے کی ضرورت ہے۔ لیکن خدا ہی جانتا ہے کہ رات کے آٹھ بجے سے دو بجے تک خاص لاہور میں ہر روز کتنے ہزار روپیہ حسن کی ناپاک اور مخرب اخلاق قربان گاہ پر بطور نذر کے چڑھایا جاتا ہے۔۔۔۔ آفریں ہے صد آفریں ان نوجوان رضا کاروں پر جو گم راہوں کو گم راہی سے بچانے کے لیے شہر کے ان مقامات میں بلا معاوضہ چوکی پہرہ کا کام دیتے ہیں اور اس طرح اپنے دین' اپنے ملک اور اپنی ملت کی حقیقی خدمت بجا لاتے ہیں۔ باشندگان لاہور کو انجمن اصلاح بدکاراں کی خدمت کا سچے دل سے اعتراف کرنا پڑے گا۔

یہ اخباری تراشہ دیکھ کر وہ یک لخت اٹھ کھڑے ہوئے بغیر کوئی آہٹ پیدا کیے ننگے پاؤں اپنے بیڈ روم کی طرف نکل گئے' یہ اطمینان کر لینے کو کہ کہیں بیگم جاگ تو نہیں رہی۔ واپسی پر وہ کچن میں سے بھی ہوتے آئے محض یہ سوچ کر کہ بعض اوقات سنک کی ٹونٹی ہلکی سی کھلی رہ جاتی ہے اور رہ رہ کر ٹپکنے والا پانی کا قطرہ نیند میں خلل پیدا کرتا ہے۔

یوں ہر طرح اطمینان کر لینے کے بعد وہ ایک بار پھر اسٹڈی میں آ بیٹھے۔

ایسے میں صاحب بہادر کو یاد آیا کہ ستمبر 1922ء کے آواخر میں کوچہ شہباز خاں' بازار شیخوپوریاں' ٹبی اور اس کے گردونواح کے علاقے میں آباد طوائفوں کو جب بے دخلی کے یہ نوٹس موصول ہوئے تھے تو انہوں نے بھی انجمن اصلاح بدکاراں کے جواب میں مقامی باشندوں کے دستخطوں پر مشتمل محضر نامے کمیٹی کو بھجوائے تھے۔ ان محضر ناموں کے دستخط کنندگان میں زیادہ تر دکان دار تھے۔ چند پروفیسروں' ایک امام مسجد

اور ایک روزنامہ کے ایڈیٹر کے دستخط بھی نظر سے گزرے۔

اندرون ٹکسالی کی طوائفوں نے کمیٹی کی جانب سے فرداً فرداً نوٹس موصول ہونے پر جو انفرادی جوابات بھجوائے ان کی بیسیوں نقول فائل میں موجود تھیں۔ ہر درخواست ایک داستان غم تھی، جس میں جسم فروش عورت کا مجبور دل دھڑک رہا تھا۔

بازار شیخو پوریاں مکان نمبر 1120 میں رہائش پذیر طوائف، صاحب جان نے 17 جنوری 1923ء کو سیکرٹری میونسپل کمیٹی کے نام جواب نوٹس میں لکھا تھا:

عالی جاہ! سائلہ ہمیشہ سے پیشہ ور عورت نہیں۔ طوائف ہوں، گانے بجانے کا کام کرتی تھی۔ اگر کسی رئیس کی نوکری ملی تو کر لی ورنہ خیر اللہ تعالیٰ نے سائلہ کو ایک لڑکا دیا ہے جو دیال سنگھ اسکول میں جماعت پنجم پڑھتا ہے۔ ۔۔۔۔ چونکہ سائلہ سن رسیدہ ہو گئی ہے اس لیے گانا بجانا اور نوکری بائے ترک کر دی ہے۔ سائلہ پر رحم کیا جائے۔

اندرون ٹکسالی بازار شیخو پوریاں کی عیدو نے جواب میں لکھا تھا:

میں نے کئی برس سے پیشہ اور گانا بالکل چھوڑ دیا ہے۔ ککے زئی قوم کے ایک معزز سے نکاح پڑھا لیا تھا مگر عرصہ تین برس سے سائلہ کو خون جاری ہو گیا۔ جس کی وجہ سے خاوند نے طلاق دے دی۔ سائلہ اب تک اس مرض میں مبتلا ہے۔ اگر حضور کو شک ہو تو سائلہ کا طبی معائنہ کرایا جائے۔ بہتر ہو گا اگر حضور خود معائنہ کریں اور اس کے بعد میرے خلاف نوٹس واپس لیا جائے۔

یہ پڑھ کر صاحب بہادر کو یاد آیا کہ موتی بازار کی ضعیف العمر طوائف دارو نے کمیٹی میں آ کر ان کے روبرو یہ فریاد کی تھی کہ اسے نقل مکانی میں کوئی عذر نہیں، لیکن موتی بازار سے اس کا سامان لادنے کے لیے کوئی تانگے ریڑھے والا تیار نہیں ہوتا۔ بچے اس پر آوازے کستے ہیں اور بڑے بوڑھے اسے دیکھ کر ناک پر رومال رکھ لیتے ہیں۔

فائل میں ایک درخواست کے ساتھ منسلک ایک یادداشت ایسی بھی ملی جس میں سیکرٹری بہادر کی اپنی ہینڈ رائٹنگ میں لکھا تھا:

اندرون ٹکسالی کے مختلف محلوں کی طوائفوں نے کمیٹی کے اس اقدام کے خلاف قانونی چارہ جوئی بھی شروع کر رکھی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ جا کی

کو بے دخلی کے نوٹس سے کب تک بچا پاؤں گا۔ عجیب مشکل میں ہوں۔ رلیا رام بہ قلم خود۔

اندرون ٹکسالی گیٹ کی طوائفوں کی طرف سے میونسپل کمیٹی' ڈپٹی کمشنر' کمشنر اور گورنر پنجاب کے سامنے گزاری گئی ایک درخواست کی نقل پر سرخ ٹیگ لگا تھا۔ صاحب بہادر نے اسے پڑھنا شروع کیا۔

ہم لوگ یہاں دورِ مغلیہ سے رہ رہے ہیں اور اس طویل عرصے میں کسی بھی حکمران نے ہمیں پریشان نہیں کیا ہے۔ یہاں تک کہ سکھوں کے عہد حکومت میں بھی ہم محفوظ رہے۔

سرکار انگلشیہ کا عہد حکومت تو وہ ہے جس میں شیر اور بکری ایک گھاٹ پر پانی پیتے ہیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ہم لوگ شادی بیاہ کی تقریبات میں بلائے جاتے رہے' راجوں' مہاراجوں' روٴسا اور مہاجنوں نے ہمیں اپنی خوشی کے موقعوں پر بلایا اور ہم نے وہاں گانے اور رقص سے محفل کی رنگینی کو دوچند کیا۔

حال ہی میں جنگ عظیم کے خاتمے پر جو دربار ہوا' اس میں بھی ہم لوگوں کو شرکت کی سعادت ملی۔ پرنس آف ویلز کی آمد کے موقعے پر ان کے سامنے دہلی میں ہم نے گانے اور رقص کا شاندار مظاہرہ کیا جو مدتوں یاد رہے گا۔

ہم لوگ برطانوی راج میں بھی بد اخلاق اور معاشرے کے لیے خطرناک تصور نہیں کیے گئے تھے لیکن اب کچھ عرصے سے جب کہ تحریک خلافت' کانگریس کمیٹی اور اس طرح تحریکیں شروع ہوئی ہیں' ہمیں لعن طعن کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ گلیوں اور بازاروں میں بڑے پرجوش گیت گائے جا رہے ہیں۔ جب کہ گیت سیاسی اور سرکار کی نافرمانی کا عکس نہیں ہیں۔ ہم صرف فن موسیقی کے پرستار اور اس کے رکھوالے ہیں۔

ہمارے مخالف' ممبران کمیٹی' کانگریس یا خلافت سے تعلق رکھتے ہیں۔

ہماری درخواست ہے کہ آپ یورپین افسروں پر مشتمل تحقیقاتی کمیٹی مرتب کریں جو ہمارے حالات کا جائزہ لے۔ ہم سرکار کے وفادار اور پرامن شہری

ہیں اس لیے ہمیں حسب سابق تمام تحفظات حاصل ہونے چاہییں۔

در کوئے نیک نامی مارا گزر نہ دادند
گر تو نمی پسندی' تغیر کن قضارا

اس درخواست پر متعدد طوائفوں کے دستخط اور انگوٹھے کے نشان ثبت تھے اور سب سے آخر میں درخواست کے نچلے کونے پر بالکل الگ کر کے ایک انگوٹھے کے نشان کے نیچے بریکٹ میں لکھا تھا'

''جانکی بائی''

اس درخواست پر جانکی کا نام دیکھ کر رلیا رام برسا برس سے سخت حیران تھے کہ اسے تو بے دخلی کا نوٹس جاری ہی نہیں ہوا تھا پھر اس نے یہ دستخط کیوں کیے؟ صاحب بہادر نے سوچا شاید حفظ ماتقدم کے طور پر اس نے ایسا کیا ہو یا شاید اپنی ہم پیشہ برادری کو رعایت دلانے کی خاطر۔ اگر یہ دوسری بات تھی تو یقیناً اسے ایک مان تھا' پرانے تعلق کی بنیاد پر۔

رلیا رام کو یاد آیا کہ جس روز یہ درخواست کمیٹی میں پہنچی تھی تو اسی روز چپراسی نے اطلاع دی کہ شاہی محلے سے مودا کنجر شرف باریابی چاہتا ہے۔ دفتر میں طلب کرنے پر اس نے کہا تھا ''حضور! چیت رام روڈ کی جانکی بائی کی ایک عرضوی ہے۔ مجھے تفصیل تو اس نے بتائی نہیں' بس اتنا کہا کہ حضور کا اقبال بلند رہے۔ کئی برس پہلے ایک عرض گزاری تھی ای بلوریا کے حضور' اس پر عمل درآمد نہیں ہوا۔ اگر نظر کرم کریں تو آپ کے لیے آپ کی بیگم صاحبہ اور بچوں کے لیے دعا گو رہوں گی۔ حضور! وہ خود کمیٹی میں حاضر نہیں ہو سکتی۔ بیمار ہے۔''

مودے کی بات سن کر جواب میں رلیا رام نے ٹیبل پر رکھی درخواست پر سے نظریں اٹھائے بغیر ایک لمبی ''ہوں'' کی تھی اور بس۔ مودا کچھ دیر ہاتھ باندھے کھڑا رہا اور اس کے بعد فرشی سلام کرتے ہوئے پلٹ گیا تھا۔

جانکی کی اس ایک عرضوی نے کہیں کا نہیں رکھا۔ رلیا رام ---- صاحب بہادر نے تاسف سے دونوں ہاتھ ملے۔ پھر انہوں نے فائل بند کر دی۔ انہیں اچھی طرح یاد تھا کہ کمشنر لاہور کی عدالت میں بازار ٹبی کی اللہ جوائی اور بڈھاں نے جو اپیل 17 اکتوبر 1922ء کو دائر کی تھی' اس کا فیصلہ 4 دسمبر 1922ء میں ہوا' جس میں اپیل نامنظور کر دی گئی اور لنڈا بازار کی چھوٹی جان اور جانو وغیرہ کی اپیل 19 جنوری 1923ء کو کمشنر کی عدالت سے رد ہوئی۔ البتہ ہائی کورٹ میں دائر کردہ اپیل پر یہ فیصلہ ہوا کہ طوائفیں صرف کوچہ شہباز خاں اور بازار شیخوپوریاں میں رہ سکتی ہیں۔

یہ سب سوچتے کرتے اس روز بھی وہی کچھ ہوا جو برسا برس سے ہوتا آیا تھا۔ اس روز بھی ان کا جی

چاہا کہ ادھر جا نکلیں، ہو ہی آئیں۔ شاید کوئی پتا نشانی مل ہی جائے۔ ایک موہوم سی امید تھی جو ہر بار یوں اچانک یقین میں ڈھلنے لگتی کہ ہو نہ ہو اب جانکی کا کھوج مل ہی جائے گا۔ یہ خیال آنا تھا کہ رلیا رام کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ یہ سوچے بغیر کہ اب جوانی کا کس بل نہیں رہا اور دوسرے ہارٹ اٹیک کے بعد معالج نے اوورا ایگزرشن سے بچنے کا مشورہ دیا ہے۔

بیڈ روم میں بیگم کو گہری نیند سوتا چھوڑ کر وہ واش روم تک گئے، کھونٹی پر جھولتی پتلون پہنی اور برآمدے میں سے اپنی چھڑی اٹھا کر صحن میں نکل آئے۔ آج خلاف معمول صرف یہی بات تھی کہ انہیں اپنی اسٹڈی کی ٹیبل پر رکھی فائل الماری میں سنبھال کر رکھنا یاد نہ رہا۔

رات کا دوسرا پہر ہوگا جب انھوں نے بھاری آہنی گیٹ کی زنجیر احتیاط سے نکالی، مبادا بیگم جاگ جائے۔ پھر گھر سے باہر نکل کر بھاری پھاٹک کے سہارے انھوں نے کسی طور گیٹ کو اندر سے بند بھی کر دیا۔ اس وقت گلی میں کوئی نہیں تھا اور اس بات کا یقین سا تھا کہ گھر سے نکلتے اور سڑک تک آتے انہیں کسی نے نہیں دیکھا۔

بیڈن روڈ کے پچھواڑے سے مال تک آتے آتے انھوں نے چھڑی کے سہارے اپنی چال کو ایک حد تک متوازن بنا لیا تھا۔ اس وقت انہیں دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا، جیسے وقت کے احساس سے بے خبر کوئی مخبوط الحواس بڈھا صبح کی سیر کو نکل کھڑا ہوا ہے۔ وائی ایم سی اے بلڈنگ کی بالائی منزل کی یک ادھ کھلی کھڑکی کے ساتھ لگ کر کھڑی ایک انگریز لڑکی نے دونوں بازو پیچھے کی سمت موڑتے ہوئے اپنے بریزیئر کی ناٹ باندھی اور مال کی سمت جھک کر نیچے دیکھتے ہوئے ہلکی سے مسکان کے ساتھ کمرے کی لائٹ آف کر دی۔ اس وقت وہ اپنی دھن میں تھے اور نیلا گنبد کو نکل جانے والا موڑ مڑ چکے تھے۔

انارکلی بازار تک آتے آتے، میو ہسپتال کی جانب نکل جانے والی ایک تیز رفتار ایمبولینس گاڑی کے سوا ان کی توجہ کا مرکز کوئی اور شے نہیں رہی۔ ایمبولینس کے ہوٹر کی آواز نے ان کو وہ لحظہ بھر کو روکے تھے اور سرخ جلتی بجھتی لائٹ کو دور تاریکی میں معدوم ہوتے دیکھتے رہے تھے پھر آگے بڑھ آئے۔ اونگھتے ہوئے انارکلی بازار کے ایک تھڑے پر جاگتے ہوئے چوکیداروں نے یوں ہی وقت گزاری کی خاطر چھیڑی گئی آپس کی گپ شپ کو لحظہ بھر کے لیے روکا، ایک نظر بھر کر ان کی طرف دیکھا اور پھر آپس میں الجھ گئے۔

ادھر وہ، اپنے آپ میں مگن چلے جا رہے تھے۔ ٹک، ٹک، ٹک۔۔۔ دھیرج سے بڑھتے ہوئے قدم کے ساتھ سڑک پر چھڑی ٹیکتے ہوئے۔ پھر وہ شاہ عالم گیٹ کی طرف سیدھا نکلنے کی بجائے بائیں ہاتھ کی گلی مڑ گئے۔ اب وہ بری طرح ہانپ گئے تھے اور "نیا ادارہ" کے بازو میں رکھے ہوئے سیمنٹ کے بینچ پر ذرا

"اچھا۔ تو چلو۔ آج لے ہی چلو۔" وہ بنچ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

تانگہ داتا صاحب کے سامنے سے نکل کر راوی روڈ پر ہولیا۔ سڑک سنسان تھی اور دونوں اطراف میں گہری تاریکی۔ وہ ابھی چیت رام روڈ کا موڑ مڑے ہی تھے کہ صاحب بہادر نے پچھلی نشست سے ہاتھ بڑھا کر کوچوان کو کرایہ تھماتے ہوئے کہا "تانگہ روک لو میاں! ہمیں یہیں اترنا ہے" تانگہ رکا تو وہ دونوں نیچے اتر آئے۔

"پر باباجی! ابھی تاریکی ہے اور آپ کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں لگ رہی۔ تانگے پر آگے تک چلے چلتے۔"

"نہیں بس"۔

"اچھا! فرمایئے کس سے ملنا ہے۔۔۔ میں معلوم کیے دیتا ہوں۔"

"کوئی تھا۔ کیا بتاؤں۔ بس یہیں کہیں ایک گلی تھی۔ بس اب آپ ہی آپ ڈھونڈ لوں گا میں۔"

"اندھیرے میں کہیں ٹھوکر لگ گئی تو۔۔۔۔"

"نہیں بس آپ کا بہت شکریہ۔ رام جی خوش رکھے۔"

"جیسے آپ کی مرضی۔"

ابھی فجر کی اذانیں نہیں ہوئیں تھیں۔ تانگہ بھاٹی کی طرف پلٹ گیا تھا اور وہ نیک دل رہبر آگے بڑھ گیا تھا۔

ٹک، ٹک، ٹک۔۔۔ وہ سڑک پر چھڑی ٹیکتے ہوئے آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے کہ یکا یک ٹھٹک کر ایک جگہ ٹھہر گئے۔

"ارے یہ وہی گلی تو نہیں۔" وہ بڑبڑائے۔

چیت رام کی ایک تاریک گلی ان کے سامنے تھی۔ تاریک اور ویران۔ انہوں نے اپنی دھندلائی ہوئی آنکھوں پر سے چشمہ اتار کر رومال سے صاف کیا۔ بے شک، یہ وہی جگہ تھی جہاں وہ کبھی گئے وقتوں میں سرخ رومال والے سودے کی معیت میں چلے آئے تھے۔ سامنے وہی چوکھٹ؟۔ سرخی مائل سیمنٹ کے چبوترے کے وسط میں سے اوپر کو اٹھتی ہوئی وہی سیڑھیاں۔ لیکن گھر کا دروازہ بند تھا اور بند دروازے پر ایک زنگ آلود قفل جھول رہا تھا۔ برابر میں بھی دونوں جانب دروازوں پر تالے پڑے تھے۔

کہاں گئے یہ سب لوگ؟ شاید بے دخل کر دیے گئے؟ اب کہاں ڈھونڈوں اسے؟ وہ چکرا گئے۔

دور گلی کے دوسرے سرے پر، جہاں کبھی ایک لیمپ پوسٹ روشن رہتا تھا، اسٹریٹ لائٹ کا ایک

زردی مائل بلب روشن تھا۔ جس کی مدھم روشنی اس سیمنٹ کی ٹوٹی پھوٹی چوکھٹ تک آنے سے پہلے دم توڑ دیتی تھی۔ اس وقت اس سیمنٹ کے چبوترے کے وسط میں سے اوپر اٹھتی ہوئی خستہ سیڑھیوں کے علاوہ کوئی اور جگہ نہ تھی جہاں وہ کچھ دیر کے لیے بیٹھ جاتے۔

انہوں نے گلی کے دونوں طرف نگاہ دوڑائی۔ کوئی بھی تو نہیں تھا۔ کوئی راہ گیر‘ کوئی ذی نفس‘ کچھ بھی تو نہیں یا شاید انھیں ایسا محسوس ہوا تھا۔ پھر وہ ان سیڑھیوں پر بیٹھ گئے‘ بند دروازے سے ٹیک لگا کر۔ کچھ دیر گم سم بیٹھے رہے۔ تب یکا یک انھیں سینے کی بائیں جانب پسلیوں کے نیچے درد کی اک ٹیس سی اٹھتی محسوس ہوئی۔ پھر رفتہ رفتہ ان کی آنکھیں مندتی چلی گئیں اور ہونٹ بھنچ گئے۔

ایسے میں انہیں بس اتنا یاد تھا کہ اس بند دروازے کے پیچھے ایک کھلا دالان ہے‘ سپید و سیاہ لشکتی ہوئی ٹائلوں سے مزین۔ دالان کی داہنی جانب دو جڑواں کمرے ہیں۔ بائیں ہاتھ ایک صاف ستھرا باورچی خانہ‘ توشہ خانہ اور ایک اجلا غسل خانہ‘ جس کے کونے سے لوہے کی ایک گول سیڑھی اوپر چھت کو نکل جاتی ہے اور چھت پر جانکی کے ساتھ‘ ہلکی پروا میں ریلنگ کا سہارا لیے لیے پوری تھیٹر سے اٹھنے والی آوازیں سنی جا سکتی ہیں اور بادشاہی مسجد کے مینار بغیر کسی جتن کے دیکھے جا سکتے ہیں۔

کچھ دیر بعد جب صبح کے آثار جاگے تو میونسپل کارپوریشن کے خاکروب وکٹر مسیح کی نظر ان پر پڑی۔ وہ یہ سمجھا کہ صاحب بہادر صبح کی چہل قدمی کے بعد بیٹھے سستا رہے ہیں۔

اسے کیا معلوم کہ ابھی کچھ دیر قبل جانکی بائی کی سیڑھیوں پر بیٹھے صاحب کے ذہن میں باہم گڈمڈ ہوتی ہوئی قدیم یادوں کا تصویری فیتہ چلتے چلتے اب لحظہ بلحظہ تھمتا جا رہا تھا۔ آیا شاید تھم ہی گیا تھا۔

---

ممتاز مفتی

# سمے کا بندھن

آپی کہا کرتی تھی "سنہرے سمے کی بات ہوتی ہے۔ ہر سمے کا اپنا رنگ ہوتا ہے' اپنا اثر ہوتا ہے۔ اپنا سمے پہچان۔ سنہرے اپنے سمکے سے باہر نہ نکل۔ جو نکلی تو بھٹک جائے گی۔"

اب سمجھ میں آئی آپی کی بات۔ جب سمجھ لیتی تو رستے سے نہ بھٹکتی۔ آ لنے سے نہ گرتی۔ سمجھ تو گئی پر کتنی قیمت دینی پڑی سمجھنے کی۔ آپی مجھے سنہرے کہہ کر بلایا کرتی تھی۔ کہتی تھی "تیرے پنڈے کی جھال سنہری ہے۔ جب رس آئے گا تو سونا بن جائے گی۔ کٹھالی میں پڑے رہنا۔ پھر یہ جھال کپڑوں سے نکل نکل کر جھانکے گی۔"

پتا نہیں میرا نام کیا تھا۔ پتا نہیں میں کس کی تھی۔ کہاں سے آئی تھی۔ کون لایا تھا۔ بال پن ہی میں آپی کے ہاتھ بیچ گیا تھا۔ اسی کی گود میں پلی۔ اسی کی سرتال بھری بیٹھک کے جھولنے میں جھول جھول کو جوان ہوئی۔ پھر سنہر اللہ اللہ آیا چھپائے نہ چھپتا۔ آپی بولی "نہ دھیے۔ چھپا نہ۔ جو چھپائے نہ چھپے اسے کیا چھپانا۔"

کبھی کھڑکی سے جھانکتی تو آپی ٹوکتی "یہ کیا کر رہی ہو بیٹی؟ سیانے کہتے ہیں جس کا کام اسی کو ساجھے۔ تیرا کام دکھنا ہے۔ تو نظر نہ بن' منظر بن اور جو دیکھے بھی تو' تو دکھنے کا گھونگھٹ نکال کر اس کی اوٹ سے دیکھ۔ پھر سمے دیکھ۔ سنہرے ابھی تو شام ہے۔ یہ سمے تو اداسی کا سمے ہے۔ دکھ کا سمے ہے۔ شام بھی گھنشام نہ آئے۔" آپی گنگنانے لگی۔ "یاد ہے نا یہ بول؟ شام تو نہ آنے کا سمے ہے۔ تیرا آنے کے سمے ہے۔ پگلی ذرا رک جا۔ اندھیرا گاڑھا ہونے دے۔ پھر تیرا ہی سمے ہوگا پچھلے پہر تک۔"

ایک دن آپی کا جی اچھا نہ تھا۔ مجھے بلایا۔ گئی۔ لیٹی ہوئی تھی۔ سرہانے تپائی پر سوڈے کی بوتل دھری تھی۔ ساتھ نمک دانی تھی۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب سوڈے کی بوتل کے گلے میں شیشے کا گولا پھنسا ہوتا تھا۔ ٹھا کر کے کھلتا تھا۔

بولی۔ "سنہرے بوتل کھول۔ گلاس میں ڈال چٹکی بھر نمک گھول کر مجھے پلا دے۔" میں نے نمک ڈالا تو جھاگ اٹھا۔ بلبلے ہی بلبلے۔ آپی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ بولی "دیکھ لڑکی۔ یہ ہمارا سمے ہے۔ ہمارا سمے وہ

ہے جب جھاگ اٹھے۔ ہم میں نہیں' دوجے میں اٹھے۔ دوجے میں جھاگ اٹھانا۔ یہی ہمارا کام ہے۔ خود شانت' دوجا بلبلے ہی بلبلے۔ جب تک جھاگ اٹھتا رہے۔ ہمارا ہے۔ جب کہ دوجا شانت ہو جائے' ہمارا سے بیت گیا اور جب سے بیت جائے تو دھیرج پاؤں ٹھک نہ کرنا۔ ٹھک کاہے گیا۔ چمک نہ مارنا۔ چمک کاہے گیا۔ پائل نہ جھنکارنا۔ پائل جھنکار بیرن بجی۔"

پھر وہ لیٹ گئی۔ بولی "ستبھرے۔ میری باتیں پھینک نہ دینا۔ دل میں رکھنا۔ یہ بھیتر کی باتیں ہیں۔ اوپر کی نہیں۔ سنی سنائی نہیں۔ پڑھی پڑھائی نہیں۔ وہ سب چھلکے ہوتی ہیں۔ بادام نہیں ہوتیں۔ جان لے بٹی بات وہ جو بھیتر کی ہو۔ گری ہو' چھلکا نہ ہو۔ جو بیتی ہو' جگ بیتی نہیں۔ آپ بیتی ہو۔ بڈ بیتی نہیں۔ باقی سب جھوٹ۔ دکھلاوا۔ بہلاوا۔"

آج مجھے باتیں یاد آ رہی ہیں۔ بیتی باتیں۔ بسری باتیں۔ سانپ گزر گئے۔ لکیریں رہ گئیں۔ لکیریں ہی لکیریں۔ سانپ تو صرف ڈراتے ہیں۔ پھنکارتے ہیں۔ لکیریں کاٹتی ہیں۔ ڈستی ہیں۔ پتا نہیں ایسا کیوں ہوتا ہے۔ لکیروں نے مجھے چھلنی کر رکھا ہے۔ چلتی ہیں' چلے جاتی ہیں جیسے دھار چلتی ہے۔ ایک ختم ہوتی ہے' دوجی شروع ہو جاتی ہے۔

آپی کی بیٹھک میں ہم تین تھیں۔ پہلی' روپی اور میں۔ پہلی بڑی "روپ" منجھلی اور میں چھوٹی۔ پہلی میں بڑی آن تھی پر مان نہ تھا۔ اس آن میں جھب تھی۔ سندرتا بھرا ٹھیراؤ تھا۔ یوں رعب سے بھری رہتی جیسے غبارہ رس سے بھری رہتی ہے۔ گردن اٹھی رہتی مورتی سمان۔

روپ سر ہی سر تھی۔ شدھ سر تاروں سے بنی تھی۔ اس کے بند بند میں تار لگے تھے۔ سرتیاں سرتیاں اور وہ گونجتے مدھم میں گونجتے اور پھر سننے والوں کے دلوں کو جلا دیتے۔ تیجی میں تھی۔ آپی کہتی تھی "ستبھرے۔ تجھ میں دکھ کی بھیگ ہے۔ تو بھگو دیتی ہے۔ خود بھی ڈوب جاتی ہے۔ دوجے کو بھی ڈبو دیتی ہے۔ پگلی دوجے کو ڈبویا کر۔ خود نہ ڈوبا کر۔ مجھے تجھ سے ڈر لگتا ہے ستبھرے۔ کسی دن تو ہم سب کو نہ لے ڈوبے۔"

آپی کی بیٹھک کوئی عام بیٹھک نہ تھی کہ جس کا جی چاہا' منہ اٹھایا چلا آیا۔ بیٹھک پر دھن دولت کا زور تو چلتا ہی ہے۔ وہ تو چلے گا ہی ہر بیٹھک پر۔ پر آپی نے برتاؤ کا ایسا رنگ چلا رکھا تھا کہ خالی دھن دولت کا زور نہ چلتا تھا۔ تو دولتیے آتے تھے پر ایسے بدمزا ہو کر جاتے کہ پھر رخ نہ کرتے۔ آپی کی بیٹھک میں نگاہیں نہیں چلتی تھیں۔ اس نے ہمیں سمجھا رکھا تھا کہ لوگ نگاہوں پر اچھالیں گے تو بڑے اچھالیں۔ لڑکیو نہ اچھلنا۔ جو نگاہوں پر اچھل جاتی ہیں' وہ منہ کے بل گرتی ہیں اور جو گر گئی۔ وہ سمجھو' نظروں سے گر گئی۔ پھر نہ اپنے جوگی

رہی نہ دوسروں جوگی۔"

آپی کی بیٹھک میں جسم نہیں چلتے تھے آواز چلتی تھی۔ دل دھڑکتے تھے۔ وہاں ملاپ کا رنگ نہ ہوتا تھا۔ رنگ رلیاں نہیں ہوتی تھیں۔ نہ تماشا ہوتا نہ تماش بین۔

مجھے وہ دن یاد آتے ہیں جب وہاں ٹھاکر کی بیٹھک لگتی تھی۔ دو مہینے میں ایک بار ضرور لگتی تھی۔ ٹھاکر کی بیٹھک لگتی تو کوئی دوجا نہیں آسکتا تھا۔ صرف ٹھاکر کے سنگی ساتھی۔

ٹھاکر بھی تو عجیب تھا۔ اوپر سے دیکھو تو ریچھ۔ طاقت سے بھرا ہوا اور جھانکو تو بچہ۔ نرم نرم گرم گرم۔ ویسے تھا آن بھرا۔ سنگیت کا رسیا۔ یوں لگتا جیسے بھیتر کوئی لگن لگی ہو۔ دھونی رمی ہو۔ آرتی سجی ہو۔

ٹھاکر کی ہمارے ہاں بڑی قدر تھی۔ آپی عزت کرتی تھی۔ بھروسا کرتی تھی۔ ٹھاکر نے بھی کبھی نظر اچھالی نہ تھی۔ جھکائے رکھا۔ پیتا ضرور تھا پر ایسی کہ جوں جوں پیتا جاتا۔ النا دھم پڑتا جاتا۔ آنکھ کی چمک گل ہو جاتی۔ آواز کی کڑک بھیگ جاتی۔ اس کا نشہ ہی انوکھا تھا۔ جیسے بوتل کا مت ہو بھیتر کا ہو۔ بوتل اک بہانہ ہو۔ بوتل چابی ہو بھیتر کے پٹ کھولنے کی۔

"ڈرو سکھیو ڈرو۔ بھیتر کے نشے سے ڈرو۔ بھیتر کے نشے کے سامنے بوتل کا نشہ ہاتھ جوڑے کھڑا ہے جیسے راجا کے روبرو نیچ کھڑا ہو۔ بوتل کا تو خالی سر چکراتا ہے۔ بھیتر کا من کا جھولنا جھلا دیتا ہے۔ بھیتر کا کسی جوگا نہیں چھوڑتا۔ خود جوگا بھی نہیں۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ ٹھاکر کے نشے کا ریلا مجھے بھی لے ڈوبے گا۔"

ہاں تو اس روز ٹھاکر کی بیٹھک ہو رہی تھی۔ بول تھے "کوٹھری میں کون جتن کر کھولوں۔ مورے پیا کے جیا میں پڑی رہی۔" گیت نے کچھ ایسا سماں باندھ رکھا تھا کہ ٹھاکر جھوم جھوم رہا تھا۔ "پھر کہو۔ پھر بولو۔" کا جاپ کئے جا رہا تھا۔ نہ جانے کس گرہ کو کھولن کی آرزو جاگی تھی۔ اپنے من یا محبوب کے من کے ہے پیتا جا رہا تھا۔ سے کی سدھ بدھ نہ رہی تھی۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ سمے جیون سے نکل جاتا ہے کہ کون ہیں' کہاں ہیں' کیا کر رہے ہیں۔ کسی بات کی سدھ بدھ نہیں رہتی۔ اس روز وہ سمے ایسا ہی سمے تھا۔

دفعتاً گھڑی نے تین بجائے۔ آپی ہاتھ جوڑے اٹھ بیٹھی۔ بولی۔ "شما کرو ٹھاکر جی۔ معافی مانگتی ہوں۔ ہمارا سمے بیت گیا۔ اب بیٹھک ختم کرو۔"

ٹھاکر پہلے تو چونکا پھر مسکایا۔ "نہ آپی۔" وہ بولا "ابھی تو رات بھیگی ہے۔" آپی بولی۔ "ٹھاکر ہم سوکھے پروں والے پنچھی ہے۔ جب رات بھیگ جاتی ہے تو ہمارا سمے بیت جاتا ہے۔ جو ہمارے پر بھیگ گئے تو اڈاری نہ رہے گی۔ فن کار میں اڈاری نہ رہے تو باقی کیا رہا؟" ٹھاکر نے بڑی منتیں کیں۔ آپی نہ مانی۔ محفل ٹوٹ گئی تو ہم تینوں آپی کے گرد ہو گئیں۔ "آپی یہ سمے کا گورکھ دھندہ کیا ہے؟"

آپی بولی۔ "لڑکیو سے بڑی چیز ہے۔ ہر کام کا الگ سے بنا ہے۔ رات کو گاؤ بجاؤ۔ پیو پلاؤ۔ ملو ملاؤ۔ موج اڑاؤ۔ تین بجے تک بھر بھور سے اس کا سے ہے۔ اس کا نام جپو۔ اسے پکارو فریاد کرو دعائیں مانگو۔ سجدے کرو۔ اس سمے میں تم عیش نہیں کر سکتے۔ گناہ نہیں کر سکتے۔ قتل نہیں کر سکتے۔ یہ دھندا جو ہمارا ہے اس کے سمے میں نہیں چل سکتا۔ اس کے سمے میں پاؤں نہ دھرنا۔ اس نے برا مانا تو ماری جاؤ گی۔ جو اچھا مانا تو بھی ماری جاؤ گی اور دیکھو۔ اس کے سمے کے تیز بے تیز بے بھی ایسا گیت نہ گانا جو اسے پکارے۔ بھجن نہ چھیڑنا۔ ڈرتے رہنا۔ کہیں وہ تمہاری پکار سن کر ہنکارا نہ بھر دے۔"

پھر وہ دن آ گیا جب میں نے ان جانے میں سمے کا بندھن توڑ دیا۔ اس روز ٹھاکر آئے۔ آپی سے بولے۔ "بائی کل خواجہ کا دن ہے۔ خواجہ کی نیاز سارے گاؤں کو کھلاؤں گا۔ آج رات خواجہ کی محفل ہو گی۔ ادھر حویلی میں صرف اپنے ہوں گے گھر کے لوگ۔ تجھے لینے آیا ہوں۔ چل میرے ساتھ میرے گاؤں۔"

آپی سوچ میں پڑ گئی۔ "روپ ماندی ہے وہ تو نہیں جا سکے گی کسی اور دن رکھ لینا نذر نیاز۔"

"خواجہ کا دن میں کیسے بدلوں؟" وہ بولا

"تو کسی اور کی منڈلی کو لے جا۔"

"اونہوں" ٹھاکر نے منہ بنا لیا۔ "خواجہ کی بات نہ ہوتی تو لے جاتا۔ ان کا نام لینے کے لائق کوئی تو ہو۔"

"میں کس لائق ہوں جو ان کا نام منہ پر لاؤں۔"

"بس اک تیری بیٹھک ہے جہاں پوتر تا ہے۔ جسم کا نہیں من کا ٹھکانا ہے۔"

آپی مجبور ہو گئی۔ اس نے روپ کا دھیان رکھنے کے لیے چلی کو وہاں چھوڑا اور مجھے لے کر ٹھاکر کے گاؤں چلی گئی۔

رات بھر حویلی میں خواجہ کی محفل لگی۔ وہ تو گھریلو محفل تھی۔ ٹھاکر کی بہنیں بہویں بیٹیاں ٹھاکرانی سب بیٹھے تھے۔ وہ تو سمجھو بھجن منڈلی تھی۔ "خواجہ میں تو آن کھڑی تورے دوار" سے شروع ہوئی تھی۔

آدھی رات کے سمے محفل اتنی بھیگی کہ سب کی آنکھیں بھر آئیں۔ دل ڈولے۔ آپی کا من ڈوب ہی گیا۔ ٹھاکر اسے محفل سے اٹھا کر اندر لے گیا۔ شربت شیرا پلانے کو۔ پھر وہیں لٹا دیا۔

پھر خواجہ کے گیت چلے تو میں بھی بھیگ گئی۔ آنکھیں بھر بھر آئیں۔ میں حیران۔ میں تو کچھ مانگ نہیں رہی۔ میں تو التجا نہیں کر رہی۔ میں تو اک تاجر ہوں۔ پیسہ کمانے کے لیے آئی ہوں۔ میری آنکھیں بھر بھر آتی رہیں۔ دل کو کچھ کچھ ہوتا رہا۔ پر میں بھیگ بھیگ کر گاتی گئی۔ سمے بیت گیا اور مجھے دھیان ہی نہ آیا

کہ میں اس کے سے میں پاؤں دھر چکی ہوں۔ آپی تھی نہیں جو مجھے ٹوکتی۔

اور پھر مجھے کیا پتہ کہ خواجہ کون ہے۔ میں نے تو صرف نام سن رکھا تھا۔ اس کے گیت یاد کر رکھے تھے۔ میں تو صرف یہ جانتی تھی کہ وہ غریب نواز ہے۔ میں تو غریب نہ تھی۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ مجھے بھی نواز دے گا۔ خواہ مخواہ۔ زبردستی۔ مجھے کیا پتا تھا کہ اس میں اتنی بھی سدھ بدھ نہیں کہ کون پکار رہا ہے۔ کون گا رہا ہے۔ کون منگتا ہے۔ کون خالی جھولی پھیلا رہا ہے۔ کون بھری جھولی سمیٹ رہا ہے۔ میں تو یہی سنتی آئی تھی کہ دکھی لوگ پکار پکار کر ہار جاتے ہیں۔ پر کوئی سنتا نہیں۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ اتنا دیالو ہے۔ اتنا نیڑے ہے۔ اتنے کان کھڑے رکھتا ہے۔

پھر تھا کر بولا "سنہرے بائی۔ بس اک آخری فرمائش۔ خواجہ پیا موری رنگ دے چنریا۔ ایسی بھی رنگ دے رنگ نہ چھوٹے۔ دھوبیا دھوئے جائے ساری عمریا۔"

پھر مجھے سدھ بدھ نہ رہی۔ ایسی رنگ پچکاری چلی کہ میں بھیگ بھیگ گئی اور میں ہی نہیں محفل رنگ رنگ ہو گئی۔ انگ انگ بھیگا۔ خواجہ نے رنگ کھاٹ بنا دیا۔

گھر پہنچی تو گویا میں میں نہ تھی۔ دل رویا رویا۔ دھیان کھویا کھویا۔ کسی بات میں چت نہ لگتا۔ بے گانہ دکھتی۔ ساز میں طرب نہ رہا۔ سارنگی روئے جاتی۔ استاد ٹکو خان بجاتے پر وہ روئے جاتی۔ طبلہ پیٹتا۔ گھنگھرو کہتے پاؤں میں ڈال اور بن کو نکل جا۔ وہاں اس کا جھومر ناچ جو پتے ڈال ڈال سے جھانک رہا ہے۔

روز دن میں تین چار بار ایسی رقت طاری ہوتی کہ بھیں بھیں کر کے روتی۔ پھر حال کھیلنے لگتی۔ پہلی حیران روپ کا منہ کھلا آپی چپ۔ یہ کیا ہو رہا ہے۔ جب آٹھ دن یہی حالت رہی بلکہ اور بگڑ گئی تو آپی بولی۔ "بس پتر۔ تیرا اس بیٹھک سے بندھن ٹوٹ گیا۔ دانہ پانی ختم ہو گیا۔ تو نے اس کے سے میں پاؤں دھر دیا۔ اس نے تجھے رنگ دیا۔ اب تو اس دھندے جوگی نہیں رہی۔"

"پر کہاں جاؤں آپی؟ اس بیٹھک سے باہر پاؤں دھرنے کی کوئی جگہ بھی ہو میرے لیے۔"

"جس نے بلایا ہے اس کے دربار میں جا۔" روپ بولی۔

"اس بھیڑ میں جائے۔ آپی بولی" یہ لڑکی جائے جس کا سنہری پنڈا کپڑوں سے باہر جھانکتا ہے نہیں۔ یہ کہیں نہیں جائے گی۔ اسی کوٹھڑی میں رہے گی۔ بیٹھک میں پاؤں نہیں دھرے گی۔"

پھر پتا نہیں کیا ہوا۔ رقت ختم ہو گئی۔ دل میں ایک جنون اٹھا کہ کسی کی ہو جاؤں۔ کسی ایک کی تن من دھن سے اسی کی ہو جاؤں۔ ہو رہوں۔ وہ آئے تو اس کے جوتے اتار دوں۔ پنکھا کروں۔ پاؤں دابوں۔ سر میں تیل مالش کروں۔ اس کے لیے پکاؤں۔ میز لگاؤں۔ برتن رکھوں۔ اس کی بنیانیں دھوؤں۔ کپڑے

استری کروں۔ آرسی کا کول بناؤں۔ پھر سرہانے کھڑی رہوں کہ کب جاگے۔ کب پانی مانگے۔

ایک دن آپی بولی "اب کیا حال ہے دھیے؟" میں نے رورو کے ساری بات کہہ دی کہ کہتے ہیں کسی ایک کی ہو جا۔

بولی۔ "وہ کون ہے؟ کوئی نظر میں ہے کیا؟"

"اونہوں۔ کوئی نظر میں نہیں۔"

"ناک نقشہ دکھتا ہے کبھی؟"

"نہیں آپی"

"کوئی بات نہیں۔" وہ بولی۔ "جو کھونٹی پر لٹکنا مقصود ہے تو آپ کھونٹی بھیجے گا۔؟"

دس ایک دن کے بعد جب بیٹھک راگ رنگ سے بھری ہوئی تھی تو میری کوٹھڑی کا دروازہ بجا۔ آپی داخل ہوئی۔ بولی۔ "خواجہ نے کھونٹی بھیج دی۔ اب بول کیا کہتی ہے؟"

"کون ہے؟"

"کوئی زمیندار ہے۔ ادھیڑ عمر کا ہے۔ کہتا ہے بس ایک بار بیٹھک میں آیا تھا۔ منبری بائی کو سنا تھا۔ جب سے اب تک اس کی آواز کانوں میں گونجتی ہے۔ دل کو بہت سمجھایا۔ توجہ ہٹانے کے بہت جتن کیے۔ کوئی پیش نہیں گئی۔ اب ہار کے تیرے در پر آیا ہوں۔ بول کیا کہتی ہے۔ منہ مانگا دوں گا۔ چاہے ایک مہینے کے لیے دے دے۔ ایک سال کے لیے یا ہمیشہ کے لیے بخش دے۔ جیسے تیری مرضی۔" آپی ہنسنے لگی۔ بولی۔ "چل بیٹھک میں اسے دیکھ لے ایک نظر۔"

"اونہوں۔" میں نے سر ہلا دیا۔ "نہیں آپی انہوں نے بھیجا ہے تو ٹھیک ہے۔ دیکھنے کا مطلب؟"

"کتنی دیر کے لیے مانوں؟"

"جیون بھر کے لیے۔"

"سوچ لے۔ جواوباش نکلا تو؟"

"پڑا نکلے۔ کیسا بھی ہے جیسا بھی نکلے۔"

اگلے دن بیٹھک میں ہمارا نکاح ہو گیا۔ زمیندار نے پیسے کا ڈھیر لگا دیا۔ آپی نے رد کر دیا۔ بولی۔ "سودا نہیں کر رہی۔ دھی وداع کر رہی ہوں اور یاد رکھ یہ خواجہ کی امانت ہے۔ سنبھال کر رکھیو۔"

حویلی یوں اجڑی تھی جیسے دیو پھر گیا ہو۔

ویسے تو سبھی کچھ تھا۔ سازوسامان تھا۔ آرائش تھی۔ قالین بچھے ہوئے تھے۔ صوفے لگے ہوئے تھے۔ قدآدم آئینے' جھاڑ فانوس۔ سبھی کچھ پھر بھی حویلی بھائیں بھائیں کر رہی تھی۔

برآمدے میں آرام کرسی پر چھوٹی چودھرانی بیٹھی ہوئی تھی۔ سامنے تپائی پر چائے کے برتن پڑے تھے مگر اسے خبر ہی نہ تھی کہ چائے ٹھنڈی ہو چکی ہے۔ اسے تو خود کی سدھ بدھ نہ تھی کہ کون ہے۔ کہاں ہے۔ کیوں ہے۔

اوپر سے شام آ رہی تھی۔ بے کوسے سے ٹکراتی۔ اداسیوں کے جھنڈے گاڑتی۔ یادوں کے دیئے جلاتی۔ بیتی باتوں کے الاپ گنگناتی۔ دبے پاؤں۔ مدھم یوں جیسے پائل کی جھنکار بیر نیا ہو۔

دور اس کوارٹر کے باہر کھاٹ پر بیٹھے ہوئے چوکیدار کی نظریں چھوٹی چودھرانی پر جمی ہوئی تھیں۔ حقے کا سوٹا لگاتا اور پھر سے چھوٹی چودھرانی کو دیکھنے لگتا۔ یوں جیسا اسے دیکھ دیکھ کر دکھی ہوا جا رہا ہو۔

دوسری جانب گھاس کے پلاٹ کے کونے پر بوڑھا مالی پودوں کی تراش خراش میں لگا ہوا تھا۔ ہر دو گھڑی کے بعد سر اٹھاتا اور چھوٹی چودھرانی کی طرف ٹکٹکی باندھ کر بیٹھ جاتا پھر چونک کر لمبی ٹھنڈی سانس بھرتا اور پھر سے کاٹ چھانٹ میں لگ جاتا۔

جنت بی بی' چودھرانی کا کھانا پکاتی تھی۔ دو تین بار برآمدے کے پرے کنارے پر کھڑی ہو کر اسے دیکھ گئی تھی۔ جب دیکھتی تو اس کی آنکھیں بھیگ بھیگ جاتی تھیں۔ پلو سے پونچھتی پھر لوٹ جاتی۔

سارے نوکر کمیں چھوٹی چودھرانی پر جان چھڑکتے تھے۔ اس کے غم میں گھلے جا رہے تھے لیکن ساتھ ہی وہ اس پر سخت ناراض بھی تھے۔ اس نے اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی کیوں ماری تھی؟ کیوں خود کو دوجوں کا محتاج بنا لیا تھا؟ اپنی اولاد ہوتی تو پھر بھی سہارا ہوتا۔ اپنی اولاد تو تھی نہیں۔

جب چودھری مرنے سے پہلے بتائی ہوش و حواس اپنی آدھی غیر منقولہ جائیداد چھوٹی چودھرانی کے نام کر گیا تھا تو اسے کیا حق تھا کہ اپنا تمام حصہ بڑی چودھرانی کے دونوں بیٹوں میں تقسیم کر دے۔ اگر ایک دن بڑی چودھرانی نے اسے حویلی سے نکال باہر کیا تو وہ کیا کرے گی؟ کس کا در دیکھے گی۔

ایک طرف اتنی بے نیازی کہ اتنی جائیداد اپنے ہاتھ سے بانٹ دی۔ اور دوسری طرف یوں سوچوں میں گم تصویر بن کر بیٹھی رہتی ہے۔ سارے ہی نوکر حیران تھے کہ چھوٹی چودھرانی کس سوچ میں کھوئی رہتی ہے۔ چودھری کو مرے ہوئے تین مہینے ہو گئے تھے۔ جب سے یونہی حواس گم تیاس گم بیٹھی رہتی ہے اور پھر ٹوٹی رات سے اس کے کمرے سے گنگنانے کی آواز کیوں آتی ہے؟ کس خواجہ پیا کو بلاتی ہے؟ خواجہ پیا موری لیجو خبریا۔ کون خبر لے؟ کیسی خبر لے؟ چھوٹی چودھرانی پر انہیں پیار ضرور آتا تھا پر اس کی باتیں سمجھ میں

نہیں آتی تھیں۔ پتا نہیں چلتا تھا کہ کس سوچ میں پڑی رہتی ہے۔

چھوٹی چودھرانی کو صرف ایک سوچ لگی تھی۔ اندر سے ایک آواز اٹھتی۔ بول تیرا جیون کس کام آیا؟ وہ سوچ سوچ ہار جاتی۔ پر اس سوال کا جواب ذہن میں نہ آتا۔ الجھے الجھے خیال الجھاتے۔ مجھے چمن سے اکھیڑا۔ بیل بنا کر اک درخت کے گرد گھما دیا اور اس درخت کو اکھیڑ پھینکا۔ بیل مٹی میں مل گئی۔ اب یہ کس کے گرد گھومے؟ بول میرا جیون کس کام آیا؟

دفعتاً اس نے محسوس کیا کہ کوئی اس کے روبرو کھڑا ہے۔ سر اٹھایا سامنے گاؤں کا پٹواری کھڑا تھا۔

"کیا ہے؟" وہ بولی۔

"میں ہوں پٹواری۔ چودھرانی جی۔"

"تو جا۔۔۔۔ جا کر بڑی چودھرانی سے مل۔ مجھ سے تیرا کیا کام؟"

"آپ ہی سے کام ہے۔" وہ بولا۔

"تو بول کیا کہتا ہے؟"

"گاؤں میں دو درویش آئے ہیں۔ گاؤں والے چاہتے ہیں انہیں چند دن یہاں روکا جائے۔ جو آپ اجازت دیں تو آپ کے مہمان خانے پر ٹھہرا دیں۔"

"ٹھہرا دو" وہ بولی۔

"نوکر چاکر بندوبست۔۔۔۔۔۔" وہ رک گیا۔

"سب ہو جائے گا۔"

پٹواری سلام کر کے جانے لگا تو پتا نہیں کیوں اس نے سرسری طور پر پوچھا "کہاں سے آئے ہیں؟"

پٹواری بولا۔ "اجمیر شریف سے آئے ہیں۔ خواجہ غریب نواز کے فقیر ہیں۔" اک دھما کا ہوا۔ چھوٹی چودھرانی کی بوٹیاں ہوا میں اچھلیں۔

اگلی شام چھوٹی چودھرانی نے جنت بی بی سے پوچھا "جنت۔ یہ جو درویش ٹھہرے ہوئے ہیں یہاں ان کے پاس گاؤں والے آتے ہیں کیا؟"

جنت بولی۔ "لو چھوٹی چودھرانی۔ وہاں تو سارا دن لوگوں کا تانتا لگا رہتا ہے۔ بڑے پہنچے ہوئے ہیں۔ جو منہ سے کہتے ہیں ہو جاتا ہے۔"

"تو تیار ہو جنت۔ ہم بھی جائیں گے۔ تو اور میں۔"

"چودھرانی جی وہ مغرب کے بعد کسی سے نہیں ملتے۔"

"تو چل تو سہی۔" چودھرانی نے خود کو چادر میں لپیٹتے ہوئے کہا۔ "اور دیکھ وہاں مجھے چودھرانی کہہ کر نہ بلانا۔ خبردار۔۔۔۔۔!"

جب وہ مہمان خانے پہنچیں تو دروازہ بند تھا۔ جنت نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ "کون ہے؟" اندر سے آواز آئی۔ جنت نے پھر دستک دی۔ سفید ریش بوڑھے خادم نے دروازہ کھولا۔ جنت زبردستی اندر داخل ہو گئی۔ پیچھے پیچھے چودھرانی تھی۔ سفید ریش گھبرا گیا۔ بولا "سائیں بادشاہ مغرب کے بعد کسی سے نہیں ملتے۔ وہ اس کمرے میں مشغول ہیں۔"

"ہم سائیں بادشاہ سے ملنے نہیں آئے۔" چھوٹی چودھرانی بولی۔

"تو پھر؟" سفید ریش گھبرا گیا۔

"ایک سوال پوچھنا ہے۔" چودھرانی نے کہا۔

"سائیں بابا اس سے سوال کا جواب نہیں دیں گے۔"

"سائیں بابا نے جواب نہیں دینا انہوں نے پوچھنا ہے" وہ بولی۔

"کس سے پوچھنا ہے؟" خادم بولا۔

"اس سے پوچھنا ہے جس کے وہ بالکے ہیں۔" یہ سن کر سفید ریش خادم کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔

"ان سے پوچھو" چھوٹی چودھرانی نے کہا۔ "ایک عورت تیرے دوار پر کھڑی پوچھ رہی ہے۔ اے غریب نواز بتا کہ میرا جیون کس کام آیا؟"

کمرے پر منوں بوجھل خاموشی طاری ہو گئی۔

چھوٹی چودھرانی بولی۔ "کہو وہ عورت پوچھتی ہے۔ تو نے جیٹھک کے گملے سے ایک بوٹا اکھیڑا۔ اسے بیل بنا کر درخت کے گرد لپیٹ دیا کہ جا اس پر نثار ہوتی رہ۔" وہ رک گئی۔ کمرے کی خاموشی اور گہری ہو گئی۔ "اب تو نے اس درخت کو اکھیڑ پھینکا ہے۔ بیل مٹی میں رل گئی۔ وہ بیل پوچھتی ہے۔ بول میرا جیون کس کام آیا؟" یہ کہہ کر وہ چپ ہو گئی۔

"تیرا جیون کس کام آیا۔ تیرا جیون کس کام آیا۔" سفید ریش خادم کے ہونٹ لرزنے لگے۔ "تو پوچھتی ہے تیرا جیون کس کام آیا؟" وہ رک گیا۔ کمرے کی خاموشی اتنی بوجھل ہو گئی کہ سہاری نہیں جاتی تھی۔

"میری طرف دیکھ۔" سفید ریش خادم نے کہا "سنہری بائی۔ میری طرف دیکھ کہ تیرا جیون کس کام آیا۔ مجھے نہیں پہچانتی؟ میں تیرا سارنگی نواز تھا۔ میں کیا تھا کیا ہو گیا۔"

چھوٹی چودھرانی کے منہ سے چیخ نکلی۔ "استاد جی آپ ۔۔۔۔۔۔؟" وہ استاد کے چرن چھونے کے لیے آگے بڑھی۔

عین اس وقت ملحقہ کمرے کا دروازہ کھلا۔ ایک بھاری بھرکم نورانی چہرہ برآمد ہوا۔

"سنہری بی بی۔" وہ بولا۔ "مجھ سے پوچھ۔ تیرا جیون کس کام آیا۔"

چھوٹی چودھرانی نے مڑ کر دیکھا۔ "ٹھاکر۔۔۔۔۔۔۔۔۔" وہ چلائی۔

ٹھاکر بولا۔ "اب ہمیں پتہ چلا کہ سرکار نے ہمیں ادھر آنے کا حکم کیوں دیا تھا۔" اس نے سنہری بی بی کے سامنے اپنا سر جھکا دیا۔ بولا۔ "بی بی۔ ہمیں آشیرباد دے۔"

---

# نیلم احمد بشیر

## شریف

''ایکسکیوزمی! آپ کہیں کمیلہ تو نہیں؟''

سمکی نے اپنی لانبی' حسین گردن کو ہولے سے خم دے کر سوال کرنے والے کی طرف دیکھا۔

بہت شاندار مرد تھا۔ گرے سوٹ' سرخ سلک شرٹ' گلے میں نفیس پولکا ڈاٹ سکارف' اس پر خوب جچ رہا تھا۔

شاید نیا آیا تھا' کیونکہ اس سے پہلے سمکی نے اسے کسی پارٹی میں نہیں دیکھا تھا۔ لانبا قد' متوازن' صحتمند جسم' عمر کوئی پنتالیس کے قریب رہی ہوگی لیکن کم عمر دکھتا تھا۔ سمکی بھی کچھ کم پرکشش نہ تھی۔

یوں تو پارٹی میں ایک سے ایک خوبصورت عورت موجود تھی' لیکن سمکی کی چھب تو سب سے نرالی تھی۔ وہ مشرق اور مغرب کا ایک حسین امتزاج تھی۔

جدید طرز کے باب کٹ میں ترشے ہوئے بال' لوری آل کی امپورٹڈ ہیر ڈائی میں بہت پرکشش دکھائی دے رہے تھے۔

اس کا لباس بھی مکمل طور پر ماڈرن سٹائل کا تھا۔ بہت سی کلیوں والا کرتہ یوں تو بہت کھلا تھا لیکن کمر کے پاس جا کر خود بخود تنگ ہو جاتا تھا۔ خوبصورت سیاہ' چست پاجامے میں اس کی ٹانگیں جہاں اپنا سڈول پن بھرپور انداز میں نمایاں کر رہی تھیں' وہیں اس کے سندھی کھسے اور سواتی چاندی کے زیورات اسے اپنی ایک علیحدہ انفرادیت عطا کر رہے تھے۔ وہ اپنے شوہر نعیم حسن کے ساتھ اپنی دوست شیریں کے گھر نیو ائیر کی پارٹی اٹینڈ کرنے آئی ہوئی تھی۔ وہاں آئے سب لوگ ایک دوسرے کے جاننے والے' دوست' یار' ملنے جلنے والے تھے۔

آپس میں بے تکلفیاں' دوستیاں' یارانے تھے۔ اچھا وقت گزارنا ان کا مشغلہ اور مقصد حیات تھا۔

ہیونگ اے گڈ ٹائم ان کی زندگی کا ماٹو تھا۔

نیا سال صرف ایک گھنٹہ دور تھا۔ مہمان موسیقی سے محظوظ ہونے کے ساتھ ساتھ ملنے ملانے، پینے پلانے میں مصروف و مشغول تھے۔

سمکی نے ایک کونے میں کھڑے اپنے شوہر نعیم پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی۔ وہ کسی دوست خاتون سے ڈانس کی درخواست کر رہا تھا۔

"ہیلو!" نو وارد نے کھنکار کر سمکی کی توجہ چاہی۔

"کمٹ مینٹس توڑی بھی جا سکتی ہیں!" سمکی نے مسکرا کر جواب دیا۔

"ارے ارے! میں بھلا آپ کو کمٹ مینٹس توڑنے کی پریشانی میں ڈالنے کی جسارت کیوں کرنے لگا! کبھی کبھار کمٹ مینٹس بدل لینے سے بھی تو کام چلایا جا سکتا ہے نا!"

اس نے مشروب کو لبوں سے لگا کر اور سمکی کے سراپا کو آنکھوں سے پی کر شوخی سے جواب دیا اور سمکی کی طرف تعریفی نظروں سے دیکھنے لگا۔ سمکی ہنس پڑی۔ اس کا نقرئی قہقہہ، ماحول کو ایک مضراب کی طرح چھو کر جلترنگ بنا گیا۔

"مجھے وحید قریشی کہتے ہیں!" مرد نے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔۔۔۔۔۔"میں سمکی ہوں؟"

"صرف سمکی؟"

"صرف سمکی!" اس نے اپنی کڑھائی والی چادر بڑے سٹائل سے کھسکائی۔ اس کا چاندی کا زیور جھنجھنا اٹھا اور وحید قریشی اس کی خوبصورت کالربون کو تعریفی نظروں سے دیکھنے سے خود کو باز نہ رکھ سکا۔ جس کی وجہ سے اس کی گردن بہت پروقار لگ رہی تھی۔

"لگتا ہے آپ دونوں مل چکے ہیں۔ ویری گڈ آپ نے اچھا کیا۔ جو یہ کام خود ہی کر لیا۔ اب مجھے آپ دونوں کو متعارف کروانے کے تکلفات پورے نہیں کرنے پڑیں گے۔ ویسے یہ ضرور بتا دوں وحید جی! کہ سمکی میری بڑی خاص دوست ہے اور آپ تو خاص چیزوں اور خاص بندوں میں ہی دلچسپی رکھتے ہیں نا!"

زریں نے خوشدلی سے کہا۔

"بھئی سمکی، یہ وحید صاحب احسن کے پرانے دوست ہیں۔ بہت عرصے سے ان سے رابطہ نہ تھا۔ اب انہوں نے ہمیں خود ہی ڈھونڈ نکالا ہے۔ معمولی آدمی نہیں، بہت بڑے آرکیالوجسٹ ہیں ہمارے!"

"او ریئلی! آرکیالوجی سے تو مجھے بھی بہت دلچسپی ہے! ہاؤ نائس!" سمکی کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

چند ہی لمحوں میں وہ بے تکلف ہو گئے۔ وحید اسے لاہور کے تاریخی مقامات، عجائب گھر، نوادرات کے بارے میں معلومات دینے لگا۔ سمکی اس کی قابلیت اور ذہانت سے تو متاثر ہو رہی تھی مگر خود کو وحید کی اس کی

ذات میں دلچسپی لینے سے خوش ہونے سے بھی بہت مسرور و مطمئن پا رہی تھی۔

"گریٹ پارٹی یار!" کرنل حفیظ کسی بات پر اونچے اونچے قہقہے لگاتا جا رہا تھا۔ ابھی تو پینے کا ایک گھنٹہ اور باقی تھا۔ اسے تو ہلکا سا نشہ بھی ہو جاتا تو معمولی معمولی باتوں پا تنی زور زور سے ہنستا کہ اس پر شیکسپیئر کے فول ہونے کا گمان ہونے لگتا۔

"اور آپ کیا کرتی ہیں؟ میرا مطلب ہے خوبصورت لگنے کے علاوہ؟"

وحید قریشی کی سمکی کی ذات میں دلچسپی بڑھنے لگی۔

سمکی ہنس دی۔ وہی نقرئی قہقہہ وہی جلترنگ کا سا سماں۔

"میں بہت مصروف رہتی ہوں۔ کئی سوشل ویلفیئر اداروں سے میرا تعلق ہے اور پھر میں اپنی بوتیک "می اینڈ یو" کے نام سے بھی چلا رہی ہوں۔ گھر شوہر بچے یو نو زندگی بہت مصروف گزرتی ہے۔"

"یہ تو ہے۔ اسی لیے آج کل کی زندگی میں تو جو لمحہ خوشی کا میسر آ جائے اسی کو غنیمت جانیے۔ میں بھی دن بھر آرکی آلوجی اور ریسرچ ورک میں کبھی کبھار تو خود کو بھی کوئی آثار قدیمہ لگنے لگتا ہوں۔ لیکن شام کو جم خانہ میں سومنگ یا ٹینس کھیلی اور میرا سسٹم ریلیکس ہو گیا۔"

"اور رات کو!"

"رات ہمیں تنہائیوں کا احساس دلانے کو ہر چوبیں گھنٹے بعد ہی چلی آتی ہے۔ کیا کریں؟ چاند اور میں ہمیشہ سے اکیلے ہیں!"

"آپ کی مسز؟" سمکی نے کچھ جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"وہ اور میں علیحدہ علیحدہ دنیاؤں میں رہتے ہیں۔ ان کو رات کو پونے نو بجے ہی نیند آ جاتی ہے وہ ڈاکٹر ہیں ہسپتال میں کام کر کر کے تھک جاتی ہیں۔ ویسے بھی۔۔۔۔۔۔۔۔!" وہ خلاؤں میں گھورنے لگا۔

"آئی انڈرسٹینڈ! دراصل ذہنی ہم آہنگی ہونا بہت ضروری ہے!"

"بالکل ٹھیک کہا آپ نے!" وہ جلدی سے بولا۔

"اور وہ تو قسمت سے ہی ملتی ہے! لیکن زندگی ضائع کرنے کی چیز تو نہیں نا' میں تو خود ایسا ہی سوچتی ہوں ورنہ میں تو ڈپریشن کی اس سٹیج پر پہنچ جاؤں کہ ویلیئم کی ملی گرامز برات ہی بڑھانی پڑ جائیں!"

یکا یک میوزک تیز ہو گیا۔ "I Wanna live Forever,,

نغمہ بھی ہیجان خیز تھا۔ ڈیک کا والیوم ناچتے ہوئے جوڑوں کو دیوانہ بنائے دے رہا تھا۔

لائٹنگ والوں نے سٹروب لائٹس کا بڑی خوبصورتی سے استعمال شروع کر دیا تھا۔ سٹروب لائٹس

کلا نیلا نیلا رنگ جب ٹکڑوں میں ناچتے ہوئے جوڑوں پر پڑتا تو یوں محسوس ہوتا گویا جسموں کے نیلے نیلے ٹکڑے فضا میں بکھرا کر رہ گئے ہوں چند لمحوں کے لیے منجمد ہو کر سانس لینا بھول چکے ہوں۔ نیلا رنگ نیزہ بن کران کے متحرک جسموں کو بار بار چھلنی کیے دے رہا تھا اور نیلے رنگ کے خون میں تڑپتے جسم اذیت کی لذت میں ڈوبے "واو" "اوہ" چیخ رہے تھے۔

یہ ہجوم زندہ اور زندہ دل لوگوں کا تھا۔ غم' فکر اگران کی زندگی میں تھے بھی تو دور کسی طاق میں' کسی مناسب وقت کے لیے انہوں نے سنبھال رکھے تھے۔ خوشیاں البتہ انہیں عزیز تھیں' اتنی کہ وہ ان کے حصول کے لیے چاہے وہ چند لمحوں کی ہی کیوں نہ ہوں' کچھ بھی کرنے کو تیار تھے۔

زریں کی دوست پونی بھی نیو ائیر پارٹی میں اپنے نئے ساتھی کے ساتھ موجود تھی۔ پونی امریکہ میں پندرہ سال گزارنے کے بعد پاکستان دوبارہ آ کر سیٹل ہوئی تھی۔ اس کا میاں پاکستان کو رہنے کے قابل نہیں سمجھتا تھا اور مصر تھا کہ پونی واپس چلی چلے لیکن پونی امریکہ کی مشینی زندگی اور مادی لذتوں سے بور ہو چکی تھی۔ ویسے بھی اس کا خیال تھا کہ بچوں کو امریکہ کے آزادانہ معاشرے سے بچانے کی پوری پوری کوشش کرنی چاہیے۔ اس لیے وہ امریکہ کو چھوڑ آئی تھی۔ اس کا میاں سال میں ایک دو چکر لگا لیتا اور گرمیوں کی چھٹیوں میں وہ امریکہ ہو آتی۔ اللہ اللہ خیر صلا۔ شادی کو گھسیٹا جا رہا تھا حالانکہ اس کے بے جان جسم میں اب جا بجا تکلیف دہ پھوڑے اور پھنسیاں نکلنا شروع ہو چکی تھیں۔

فاصلے صرف جغرافیائی نہیں رہے تھے۔

مزاجوں کے تضاد کا بہت بڑا سا بحر اوقیانوس' طرز زندگی کے فرق کا ٹھنڈا ٹھار آئس لینڈ' دلچسپیوں اور ضروریات کی تبدیلیوں کا' رنگ برنگے ٹکڑوں پہ مشتمل یورپ' راستے میں حائل ہو چکا تھا۔ مگر پونی مشکلات کا مقابلہ کرنا جانتی تھی۔ اس لیے ڈٹی ہوئی تھی۔ "ہائے بیلی! ادھر آؤ میں تمہیں وحید قریشی دی گریٹ آرکی آلو جسٹ سے ملاؤں۔"

سمکی نے بیلی کا بازو کھینچا۔ بیلی بھی اس کی بے تکلف دوست تھی۔ میوزک کافی تیز تھا۔ اس لیے بیلی نے اشارہ کیا اور تینوں کمرے سے ملحقہ ٹیرس پہ چلے آئے۔ بیلی بھی بڑی دیر سے اس ہینڈسم سے آدمی کے بارے میں دل ہی دل میں متجسس ہو رہی تھی۔ اب سمکی نے اس کا تعارف کروایا تو وہ بہت خوش ہوئی۔

"خلیل آپ سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔ آج کل وہ سیا چن پر ایکسر سائز کے لیے گئے ہوئے ہیں۔ بے چارے سردی میں ٹھٹھر رہے ہیں اور میں یہاں۔ آج تو نیو ائیر کے شروع ہونے پر میں انہیں بہت مس کر رہی ہوں! کاش وہ یہاں ہوتے!" ........ وہ سچ مچ اداس ہو گئی۔

بلی کا خاوند خلیل چھٹہ فوج میں کرنل تھا۔ بلی اور خلیل کا جوڑا ان بہت خوش نصیب اور نادر جوڑوں میں سے ایک تھا جن کی شادی شدہ زندگی ابھی تک خوشگوار کہلائی جاسکتی تھی' کیونکہ شادی کے کچھ ہی سال بعد اکثر میاں بیوی ایک دوسرے سے بے گانہ ہو کر رہ جاتے ہیں۔ سمجھوتوں کی رسی سے بندھے ہچکولے کھاتے' خطرناک پل پر احتیاط سے قدم جمائے' ایک پل سے دوسرے پل کا سفر کرتے دعائیں مانگتے رہتے ہیں کہ خیریت ہو خیریت رہے۔

''انہیں بھلا سیاچن جانے کی کیا ضرورت تھی؟ کالا گلاب تو ان کے پاس تھا!''

ڈاکٹر وحید نے بلی کی سانولی سلونی رنگت کی تعریف کر کے اس کا تو من ہی لوٹ لیا۔

''ہائے اللہ! واٹ اے جنٹلمین یو آر! ہاؤ سویٹ! آئی لائک یو! ناسمکی تم نے!''

بلی کے چہرے پر بتیاں روشن ہو گئیں' اداسی کا غبار یکایک چھٹ گیا۔

''چلیں اچھا ہے! آپ کچھ چیر اپ تو ہوئیں ورنہ کرنل صاحب کی فرقت کا غم دور کرنے کے لیے تو ہم سمجھنے لگے تھے کہ ہمیں سیاچن جا کر انہیں خود ہی آپ کے لیے لانا ہو گا۔!'' وحید شوخ ہوتا جارہا تھا۔

بلی سانولی سلونی مگر تیکھے نقوش والی لڑکی تھی۔ اوپر سے سخت اور کھردری مگر اندر سے تازہ بھنی ہوئی مونگ پھلی کی طرح نرم اور خستہ تھی۔ کرنل صاحب جونہی ایکسرسائز پر شہر سے باہر جاتے' وہ اداس ہو کر اپنی سہیلیوں کو ملنے چلی آتی۔ اس کی سہیلیوں کا حلقہ اسے روز روز پارٹیوں' گیٹ ٹو گیدرز میں مصروف رکھتا اور وہ اپنا دل بہلانے میں کامیاب ہو جاتی۔ وہ اپنی سہیلوں میں گروپ لیڈر کی سی حیثیت رکھتی تھی۔

بلی زیادہ تر ٹیلی فون فرینڈ شپ میں یقین رکھتی تھی۔ اس نے اپنی سہیلیوں کے لیے کچھ ان لکھے قانون بھی بنا رکھے تھے جن پر وہ ان سب کو سختی سے عمل کرواتی تھی۔ اس کا سب سے ضروری قانون یہ تھا کہ کوئی سہیلی کسی بھی مرد دوست سے سنجیدگی سے انوالو نہیں ہو سکتی۔ اگر کوئی جذباتی وابستگی کا شکار ہونے لگتی یا دوسری طرف سے اسے ایسا خدشہ محسوس ہونے لگتا کہ دوست حضرت زیادہ ہی ملکیت کا حق جتانے لگے ہیں تو بلی فوراً ہی ایک کانفرنس بلاتی۔ مجرم کو سمجھایا بجھایا جاتا۔ رولز آف دی گیم بتائے جاتے حتیٰ کہ گروپ میں سے نکال دیئے جانے کا بھی ڈراوا دیا جاتا۔

وہ کہتی تھی ہم سب لوگ خوشیوں کی تلاش میں رہتے ہیں اس لیے سرسری سی بے ضرر میل ملاپ دوستیاں تو کر سکتے ہیں' سنجیدہ افیئرز چلانے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتے۔ اگر ہم لوگ ایسا نہ کریں تو بہت بھاری نقصان ہوتا ہے۔ گھر بار' بچے' ساری زندگی اپ سیٹ ہو جاتی ہے اور ایسا ہونے دینا تو کوئی عقلمندی نہیں۔ مناسب یہی ہے کہ صرف لمحے کی مسرت کے تعاقب اور حصول میں ہی جئیو۔ اس کے بعد اپنے اپنے محفوظ

ٹھکانوں عزت دار گھرانوں کو لوٹ جاؤ۔

یوں تو سب سہیلیاں اس کی اس بات سے متفق ہو جایا کرتی تھیں لیکن ڈولی ہر بار ایک مسئلہ کھڑا کر دیتی تھی۔ تین بچوں کی ماں ہونے کے باوجود اس میں جذباتی ناپختگی ابھی تک موجود تھی۔ کسی مرد دوست نے دو تین ٹیلی فون اور اس کے حسن و جمال' کپڑوں کے سٹائل کی تعریف کی نہیں کہ ڈولی صاحبہ چاند کو دیکھ دیکھ کر آہیں بھرنا شروع ہو گئیں۔ بیلی اور فرینڈز نے اس کا نام ٹین ایجر رکھ چھوڑا تھا۔

جیسے ہی ڈولی کو کسی نئی محبت کا عارضہ لاحق ہوتا۔ جھٹ سے کانفرس کے ارکان اپنی اپنی کرسیاں سنبھال لیتے۔ بیلی اپنے عہدے کا پورا پورا فائدہ اٹھاتی۔

"ڈولی ڈارلنگ! ہم یہ نہیں چاہتے کہ تم زندگی کو انجوائے نہ کرو۔ بھئی ہم ظالم نہیں ہیں لیکن تمہارے دشمن بھی نہیں ہیں۔ تمہیں سمجھانا ہمارا فرض بنتا ہے۔ دیکھو فون پہ گپ شپ کرو۔ لانگ ڈرائیوز پر جاؤ۔ تحفے قبول کرو۔ پرفیومز اور بوتیک شاپس کے کپڑے لے کر دیتا ہے تو لو۔ ہم کب منع کرتے ہیں۔ ٹھیک ہے بندہ وانٹڈ محسوس کرے تو اس کی انا کی تسکین ہوتی رہتی ہے مگر اس سے آگے جانا غلط ہے۔ پھر ممنوعہ علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔ اگر پارٹی میں سے ایک ساتھی بھی اکیلا اپنے خود متعین کردہ راستے پر چل نکلا تو وہ یقینی طور پر گھنے جنگل میں بھٹک کر رہ جائے گا اور کان کھول کر سن لو۔ پھر کوئی سرچ پارٹی اس کی تلاش میں اس کے پیچھے نہیں جائے گی۔ ہاں اور ویسے بھی ہم انسان نہیں کوئی سارس تو نہیں ہیں۔ کیونکہ انسان تو اشرف المخلوقات ہے اسے زندہ رہنے کے لیے ہر حال میں سروائیو کرنا ہوتا ہے۔ صرف سارس ہی ایسا جاندار ہے جو اپنی پوری زندگی میں صرف ایک بار اپنا جوڑ کسی دوسرے سارس سے بناتا ہے۔ اگر اس کا ساتھی مر جائے تو زندگی بھر اکیلا رہتا ہے مگر دوسرا ساتھی نہیں بناتا مگر ہم سارس نہیں ہیں' ہمیں انسانوں کی' ساتھ کی ضرورت رہتی ہے۔"

ڈولی یہ سب باتیں عقل سے تسلیم کرتی تھی مگر اپنی طبعی نرم دلی کے ہاتھوں ہر بار مجبور ہو جایا کرتی تھی۔

بارہ بجنے میں چند لمحے باقی رہ گئے تھے۔ کاؤنٹ ڈاؤن شروع ہو گیا۔ ایک دو تین۔۔۔۔۔ بارہ بجتے ہی ہر طرف شور بپا ہو گیا۔ ہیپی نیو ائیر! ہیپی نیو ائیر! جام ٹکرانے لگے۔ رنگ برنگ غبارے کمرے میں ادھر ادھر تیرنے لگے۔ خاوند بیویاں ایک دوسرے سے بغلگیر ہو گئے۔ کچھ خاوند اور کچھ بیویاں ذہنی طور پر کسی اور سے بغلگیر ہو رہے تھے۔ کچھ یونہی نظروں سے سلام' پیام' نئے سال کی مبارکباد اور تنہائی میں گلے ملنے کے وعدے لے کر کام چلا رہے تھے۔ سب لوگ بہت خوش تھے۔

کھانے کا انتظام ہو چکا تھا اس لیے رقص و موسیقی فی الحال روک دی گئی تھی۔

"کھانا لگ گیا ہے! پلیز اپنی مدد آپ کیجئے۔ کوئی تکلف نہ کیجئے۔"

زریں کے شوہر نے اعلان کیا۔ اس نیو ائیر پارٹی میں کھانے کو بہت کچھ تھا۔ تکے' کباب' روسٹ' چرغے' سلاد' پھل اور منہ کا مزا بدلنے کے لیے طرح طرح کی مٹھائیاں بھی۔

زریں اور اس کا شوہر مہمانوں کو کھانے کا بار بار پوچھنے کے ساتھ ساتھ انکا ایک دوسرے سے تعارف بھی کرواتے جا رہے تھے۔

شہر کے سب سے مہنگے اور اونچی کلاس کے ہوٹل کے مالک سعید گردیزی اور اس کی بیوی شالیزا' ملتان روڈ پر واقع ٹی شرٹ ایکسپورٹ فیکٹری کا مالک ناصر خان اور اس کی بیوی حمیرا بھی وہاں موجود تھے۔

حمیرا اپنے ساتھ اپنا نیا نیا لندن ریٹرن بھائی ٹونی بھی لے آئی تھی۔ ٹونی بہت کھلنڈرا اور من چلا تھا۔ بیس سال یورپ میں گزار لینے کے بعد اب اس کا دل گوری چمڑی سے اکتا گیا تھا۔ حمیرا اور اس کی سہیلیاں اکثر اسے اس کی یورپین بیوی کے پھیکے پھیکے حسن کی وجہ سے چھیڑا کرتی تھیں اور وہ علی الاعلان اپنی اس بیوقوفی کا اعتراف کرلیا کرتا تھا۔ اب اسے اپنے دیس کے سانولے سلونے مشرقی حسن کی قدر آئی تھی اور اب تو ہر نمکین گندمی رنگ اور کالی زلفوں والی لڑکی اسے دیوانہ بنا دیتی تھی اور لڑکی دیکھتے ہی کتے کی طرح دم ہلاتا' رال ٹپکاتا' اس کے گرد بھنورے کی طرح منڈلانے لگتا۔

ڈولی' بلی ہمکی' حمیرا' زریں سب کا ہنستے ہنستے برا حال ہو جاتا اور اس کا خوب بھری محفل میں مذاق اڑایا جاتا۔ بہت لطف رہتا۔

پارٹی چل رہی تھی۔ رات لحہ لحہ رنگ بدل رہی تھی۔ کچھ ساتھی بدلے کچھ پرانے قائم رہے۔ نئے ٹیلیفون نمبرز کا تبادلہ ہوا' کچھ نے صرف معنی خیز نظروں کے تبادلے پر ہی اکتفا کی۔ کچھ محتاط رہے اور کچھ کی احتیاطوں کے خون میں مشروب کی آمیزش نے فلیتے اڑا کر رکھ دیے۔

صبح چار بجے کے قریب پارٹی ختم ہوئی۔ سب لوگ ایک دوسرے کو نئے سال کی بار بار مبارک باد دیتے رخصت ہونے لگے۔

"بھابی! واپسی پر آپ ڈرائیو کر رہی ہیں نا!" ٹونی نے ایک مہمان کو ڈولتے' ڈگمگاتے قدموں سے چلتے دیکھ کر کہا۔

"جب پتہ ہے زیادہ ڈرنک ہینڈل نہیں کر سکتے' تو پھر اپنی حد کیوں پار کر جاتے ہیں۔؟"

بھابھی مصنوعی غصے سے بولیں۔

"ڈونٹ مائنڈ اٹ بھابی! آخر نیو ائیر ہے۔ سیلی بریٹ تو کرنا تھا نا! ویسے آپ بھی ذرا احتیاط سے ہی گاڑی چلایئے گا آپ بھی مجھے!"

اس نے مسکرا کر بات بیچ میں چھوڑ دی۔

"جی نہیں میں بالکل ٹھیک ہوں۔ اپنے حواس میں ہوں۔ میں نے تو بس لائٹ سا ہی لیا تھا۔ ڈونٹ وری! ویسے مشورے کا شکریہ آپ اپنی بیگم کی خبر لیں۔ ہماری فکر چھوڑیں۔"۔۔۔وہ بھی مسکرا دی۔

سمکی اور اس کا شوہر جب ملگجے اندھیرے میں گھر پہنچے تو ان کے بچے سو رہے تھے۔ وہ دونوں دبے قدموں ان کے کمرے میں گئے۔ ان کی معصوم جبینوں پہ پیار کیا' انہیں ہیپی نیو ائیر وش کیا اور اپنے بیڈ روم میں سونے کے لیے چلے گئے۔

سمکی سکون سے دوپہر کے 2 بجے تک سوتی رہی۔ اس کی ملازمہ شیداں نے اس کے بچوں کو ناشتہ کھانا وغیرہ دے دیا تھا۔ گھر کی صفائی بھی کروائی تھی۔ بچوں کو اور اسے بھی پتہ تھا کہ جب بیگم صاحب پارٹی سے رات دیر کو لوٹیں تو انہیں ڈسٹرب نہیں کرنا۔ ان کے اپس اسی وقت جانا ہے جب وہ خود اٹھ جائیں۔ بچے سمجھدار تھے اپنے آپ کو خود محفوظ رکھنے کے طریقے انہیں بخوبی آتے تھے۔ وی سی آر لگا لیا یا کامک بکس پڑھ لیں زیادہ بور ہوئے تو فرینڈز کو فون کر لیا یا ڈرائیور کے ساتھ کسی فرینڈ کے گھر ہو آئے۔ ان کا وقت اسی طرح گزر جایا کرتا تھا۔

سہ پہر کے تین بجے تک سمکی اور نعیم نہا دھو ناشتہ کر کے تازہ دم ہو چکے تھے۔ انہوں نے کچھ دیر بچوں کے ساتھ گپ شپ کی ٹی وی دیکھا اور آرام کیا۔

شام ہوئی تو نعیم نے جم خانہ جا کر سوئمنگ اور ٹینس کھیلنے جانے کی تیاری شروع کر دی۔ آج اس کا کورکمانڈر آفندی سے ڈبلز کھیلنے کا پروگرام بنا ہوا تھا' اس لیے وہ تو اپنا بیگ اٹھا کر جلدی جلدی نکل گیا اور سمکی بچوں کو ہوم ورک کرتا چھوڑ کر لاؤنج میں چلی آئی۔

فون کی گھنٹی بجی۔

"ہیلو! ہائے مائی ڈیئر۔ ہیپی نیو ائیر!"

"ہیلو جی! آپ کو بھی نئے سال کی بھرپور مبارکباد!" سمکی نے جواباً کہا۔

"سوری میری جھمورانی! میں رات پارٹی میں نہیں آ سکا۔ مجھے پتہ ہے تم مجھ سے بہت ناراض ہو گی لیکن کیا کرتا؟ کیسے آتا؟ عین وقت پر بیگم صاحبہ کی ڈسک سلپ ہو گئی۔ لو بھلا بتاؤ' یہ بھی کوئی وقت تھا ڈسک سلپ کرنے کا؟ قسم سے بہت بور کیا اس نے ساری رات پڑی ہائے ہائے کرتی رہی۔ نیو ائیر کی حسین رات غارت ہو کر رہ گئی۔ اچھا خیر تم سناؤ۔ میری رانی نے مجھے بہت مس کیا ہو گا۔ ہے نا؟ اور میرا پریذنٹ کیا ہوا سوٹ پہن کر تو تم یقیناً مغلیہ شہزادی لگ رہی ہو گی۔ کاش میں تمہیں ان کپڑوں میں دیکھ سکتا۔!"

وہ بغیر رکے بولتا چلا گیا۔

''ہاں! تم تو آئے نہیں۔ میرا دل پارٹی میں کیسے لگ سکتا تھا!'' سکی نے فون والے کو خفگی سے جواب دیا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں ہینڈسم ڈاکٹر وحید کا تصور کرنے لگی۔ کتنی توجہ دے رہا تھا وہ اس پر۔ اس کا ڈریسنگ سٹائل' اس کا دھیما دھیما رومانوی انداز گفتگو' کتنا متاثر کن تھا سب کچھ۔

''میرے بغیر جو بوریت تمہیں ہوئی اس کے لیے غلام معافی کا خواستگار ہے۔ معاف کر دو جان من!''

''جاؤ کر دیا!'' سکی کو اس وقت اس کی لمبی چوڑی وضاحتوں سے کوئی دلچسپی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ اس کے دل میں ایک نیا شگوفہ پھوٹ چکا تھا اور وہ اس نئی تبدیلی سے بہت خوش تھی۔

''آئی انڈرسٹینڈ! آخر تم صوفیہ کو تکلیف میں چھوڑ کر کیسے آ سکتے تھے! کوئی بات نہیں میں نے مائنڈ نہیں کیا!''

''کیا کہا؟ تم نے مائنڈ نہیں کیا؟ سویٹ ہارٹ یہ تم ہی بول رہی ہو؟ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟''

اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس کا تو خیال تھا سکی چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھا لے گی۔ اس سے جھگڑا کرے گی۔ رو رو کر اپنی آنکھیں سجا لے گی مگر سکی اس وقت بڑی انڈرسٹینڈنگ بنی ہوئی تھی۔ اسے سکی سے اور زیادہ پیار ہونے لگا تھا۔ کتنی اچھی تھی وہ۔ اسی لیے تو وہ ایک دوسرے کے اتنے قریب تھے۔ وہ اس کا اتنا خیال جو رکھتی تھی۔ اس کے مسائل کو سمجھتی تھی۔

''اچھا دیکھو اس وقت میں لمبی بات نہیں کر سکتی میں نے ڈرائیو وے میں نعیم کی گاڑی آتے دیکھ لی ہے! او کے؟ بائے!''

سکی نے ہاتھ میں پکڑی چٹ پہ لکھے نمبر کو غور سے دیکھا جو اس نے ابھی ابھی اپنے رات والے پرس میں سے نکالا تھا۔ نعیم تو ابھی بمشکل جم خانہ پہنچا ہوگا' مگر سکی کا دل نئے نمبر پر بات کرنے کو چاہ رہا تھا اسی لیے اس نے بہانہ بنا دیا۔

''او کے بائے جھوٹی رانی! جلدی فون کرنا' جیسے ہی موقع ملے۔''

فون بند ہو گیا۔

سکی نے نمبر ڈائل کیا۔ فون وحید نے ہی اٹھایا۔

''آج کیسی ہیں آپ؟ مائی فیئر لیڈی؟ بھئی آپ نے تو بہت ظلم ڈھایا!''

''کیوں کیا ہوا؟''

''دل لوٹ لیا' اور کیا ہونا تھا۔ جناب رات سے ہی اس بندہ ناچیز کے ہوش حواس ٹھکانے نہیں ہیں۔ اب کیا ہوگا ہمارا! ظالم کچھ رحم کھا!'' سمکی ہنس ہنس کر دوہری ہوگئی۔ وہی ہنسی جیسے جلترنگ سے نغمے پھوٹ نکلے ہوں۔

''کمال کرتے ہیں آپ! اب اتنا بھی نہ بنایئے!''

''سچ کہتا ہوں۔ نگر نگر' قریہ قریہ گھوما ہوں امریکہ' افریقہ' یورپ۔ ساری دنیا دیکھی ہے لیکن آپ کی شخصیت کا سا جادو کسی میں نہیں دیکھا۔ پاکستان جیسا حسن کہیں نہیں ملا۔''

''او۔ واقعی؟'' وہی کھلکھلاہٹ' غنچوں کے چٹخنے کی نرم آواز۔

''اور میں پاکستان کا ہر شہر گھوما ہوں مگر لاہور جیسا حسن مجھے کہیں نہیں ملا!۔ اب آپ کہیں گے آپ لاہور کا ہر گھر گھومے ہیں لیکن آپ کو مجھ جیسا حسن کہیں نہیں ملا؟''

''یو آر اے ڈیول!'' وہ اس کی حاضر جوابی کا قائل ہو گیا۔

''اگر میں پرنس چارمنگ ہوتا تو سچ مچ شیشے کا سینڈل لیے رات سے مڈنائٹ سنڈریلا کی تلاش میں لاہور کا ہر گھر چھان چکا ہوتا!''

سمکی خاموش ہوگئی۔ اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔

''پھر کب دکھائی دے گا ہمیں ہمارا آدھی رات کا چاند؟''

''انتظار کیجیے۔ انتظار کی لذت سے ہم آپ کو آشنا کروائیں گے!''

''صرف انتظار کی لذت سے' وصال کی لذت سے نہیں؟''

''ہائے اللہ' بڑے بے صبرے ہیں آپ! ابھی رات ہی تو پہلی ملاقات ہوئی ہے!''

''ہمیں نئی ملاقاتیں پسند ہیں۔ پرانی چیزوں میں ماضی کے آثار قدیمہ ہی ہمیں پسند ہیں اور کچھ نہیں!''

''مجھے بھی ویسے آپ کے سبجیکٹ سے بہت دلچسپی ہے۔ میں نے آرکیالوجی پر کئی کتابیں پڑھ رکھی ہیں۔ موہنجوداڑو مجھے ہمیشہ فیسی نیٹ کرتا رہا ہے!''

''آپ نے لاہور ٹھیک سے دیکھ رکھا ہے؟'' وحید سنجیدگی سے بولا۔

''دیکھ رکھا کیا مطلب؟ ظاہر ہے یہاں رہتی ہوں دیکھا ہوا ہی ہے؟''

''جی نہیں۔ دیکھنا اور رہنا' دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ آپ یہاں رہتے ضرور ہیں لیکن لاہور کی تاریخ کو جاننا' سمجھنا اس ورثہ کی خوشبو کو محسوس کرنا کچھ اور ہی بات ہے۔ شہر لاہور ہماری تاریخ میں ایک

جگمگاتے ہوئے نگینے کی سی حیثیت رکھتا ہے۔ ہماری تاریخی عمارات تو خیر مغلیہ دور کی شان و شوکت بیان کرتی ہی ہیں لیکن اس شہر کی فصیل' پرانے دروازے' مٹی کا ریزہ ریزہ' اپنے اندر ماضی کی ایک داستان چھپائے ہوئے ہے!"

"آج کل آپ اس فیلڈ میں کیا کر رہے ہیں؟" سمکی نے مزید دلچسپی لیتے ہوئے سوال کیا۔

"میں اندرون شہر کے پرانے گھروں سے نوادرات اکٹھے کر رہا ہوں۔ ویسے آپ نے پوچھا تو بتا دوں کہ ان دنوں میری ریسرچ کا رخ شاہی قلعے کے اس طرف والے بازار کے پرانے گھروں کی طرف ہے!"

"آپ کا مطلب ہے۔۔۔۔" ؟ وہ بے یقینی کے عالم میں بولی۔

"ہاں ہاں بھئی بازار حسن! وہ بھی تو ہمارے شہر میں تاریخی حیثیت کی حامل جگہ ہے!"

"ہائے اللہ! مجھے تو یقین نہیں آ رہا!"

"کیوں اس میں اتنا حیران ہونے والی کونسی بات ہے؟"

فون پر ابھی یہ دلچسپ گفتگو جاری ہی تھی کہ باہر گاڑی کا ہارن بجا۔ سمکی نے پردہ ہٹا کر دیکھا' اس کی سہیلی ڈولی اور اس کے دونوں بچے گاڑی میں سے اتر کر اندر آ رہے تھے۔ سمکی کو با دل ناخواستہ فون بند کر دینا پڑا۔

ڈولی کے بچے سمکی کے بچوں کے ساتھ ٹی وی پر کارٹون دیکھنے میں مشغول ہو گئے اور دونوں مائیں گذشتہ رات کی پارٹی پر تبصرہ کرنے لگیں۔

سمکی نے ڈولی کو وحید کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ وحید سے ہونے والی ٹیلیفون گفتگو بھی من و عن سنا دی۔

"اور شیرازی؟" ڈولی نے سوال کیا۔

"آیا تھا اس کا فون بھی۔ آج تو میرا موڈ ہی نہیں بنا اس سے لمبی بات کرنے کا۔ یار بڑا بور لگتا ہے وہ وحید کے سامنے۔ وحید کتنا ذہین' ہینڈسم' دلچسپ شخص ہے۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ اس کی اور میری ذہنی سطح ایک سی ہے اور شیرازی۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

"خیر تمہیں اتنے تحفے دیتا ہے۔ روز نیا جوڑا' نیا پرفیوم تمہارے لیے باہر سے لا رہا ہوتا ہے' عمدہ ڈنر کھلاتا ہے ہم سب کو تمہاری وجہ سے۔ بے چارے کو ایسے مسترد بھی نہ کرو خیر!" وہ مصنوعی ہمدردی سے بولی۔

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے! اسے کون سا کچھ کہہ رہی ہوں میں۔ اسے جوڑے دے کر جو خوشی ملتی ہے میں اس سے وہ خوشی نہیں چھینوں گی اب اتنی ظالم بھی نہیں ہو سکتی۔ مجھ سے محبت کرتا ہے' کرتا رہے۔ اس کا دل میں کیسے توڑ سکتی ہوں لیکن ہائے جو وحید میں بات ہے اس کا کوئی جواب نہیں۔!"

دونوں سہیلیاں ہنسنے لگیں۔

تھوڑی ہی دیر میں سمکی کا شوہر بھی جم خانہ سے لوٹ آیا۔ ڈولی کو کسی شادی میں جانا تھا۔ اس لیے اس نے جوانڈیا کی سلک کا جوڑا سمکی سے ادھار مانگنا تھا پہننے کے لیے وہ لیا اور رخصت ہوگئی۔

نعیم اور سمکی نے آج خلاف معمول کھانا بھی گھر پر بچوں کے ساتھ کھایا۔ ورنہ انہیں اس کا موقعہ ہی کہاں ملتا تھا۔ ہر رات تو کسی نہ کسی کے گھر کھانا ہوتا تھا یا گیٹ ٹوگیدر۔ اس لیے بچوں کو تو ملازمہ ہی کھانا دیا کرتی تھی۔

صبح بچوں کے سکول چلے جانے کے تقریباً دو گھنٹے بعد سمکی بیدار ہوئی۔ موسم ابر آلود ہو رہا تھا۔ اسے فوراً ہی وحید کا خیال آ گیا۔ ناشتے سے فارغ ہو کر وہ لان میں چہل قدمی کرنے لگی۔ ہر پتہ' ہر پھول خوبصورت اور نیا نیا سا لگ رہا تھا۔ ماحول بھی نکھرا ہوا تھا۔ "آئی تھنک آئی ایم ان لو!" سمکی نے گلابوں کی پتیاں نوچ کر ہوا میں اڑا دیں۔ کتنا مزا آ رہا تھا اسے وحید کے بارے میں سوچ کر۔ اس کے خیالات میں کھو جانے کو جی چاہ رہا تھا مگر ساڑھے دس بجے اسے اپنی ایروبکس Aerobics کی کلاس میں بھی جانا تھا۔

وہ اور اس کی سبھی سہیلیاں جسمانی فٹنس میں بہت یقین رکھتی تھیں اور پابندی سے جم میں جا کر ورزش کرتی ہیں۔

ان سب کا تقریباً روزانہ کا یہی معمول تھا صبح ایروبکس کلاس کے بعد بیوٹی پارلر جا کر فیشل' تھریڈنگ یا ویکسنگ کرواتیں۔ پھر لبرٹی مارکیٹ کے پیچھے والی مارکیٹ میں بیٹھے درزیوں کے چکر لگاتیں۔ نئے سوٹوں پر رنگوں اور ڈیزائنوں کی مناسبت سے لگوانے کیلئے ڈوریاں' فیتے' بٹن وغیرہ خریدنا بھی تو ایک مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔ اس لیے صبح کا وقت انہی کاموں میں گزر جاتا۔ کبھی کبھار بیچ میں ایک آدھ سہیلی کے گھر مارننگ کافی پارٹی بھی آ جاتی۔ ورنہ ہر ماہ ایک کمیٹی پارٹی تو لازمی تھی۔ سب سہیلیوں نے مل جل کر "جسٹ فار فن" کمیٹی ڈال رکھی تھی۔ پھر جس کی کمیٹی نکلتی' وہ سب کو چائنیز میں ٹریٹ دیتی۔ خوب مزا رہتا۔

سمکی کو ٹیلر کی دکان پر سویٹی اور ساشی مل گئیں۔

سویٹی چالیس کلیوں کا مرینہ کا کرتہ سلوا رہی تھی اور ساشی کی ورزی سے اس کی سرخ شیشوں والی قمیض پر کندھے کے پیڈ ٹھیک سے نہ لگانے پر جھڑپ ہو رہی تھی۔

شام کو خوشنودہ کے گھر پارٹی تھی اور وہیں پر پہننے کے لیے یہ کپڑے ارجنٹ ریٹ پر سلوانے کے لیے اتنی مصیبت پیدا ہو رہی تھی۔

"یہ آج کل کے درزی اپنے آپ کو صدر بش سے کم نہیں سمجھتے!"

سائٹی منہ پھلا کر آہستہ سے بڑبڑانے لگی۔

خوشنودہ کی پارٹی پر بھی دوستوں نے جانا تھا کیونکہ خوشنودہ نے اپنا نیا شوہر سب سے پہلی بار متعارف کروانا تھا۔ خوشنودہ پورے گروپ میں سب سے انوکھا شوق رکھتی تھی' نئی نئی شادیاں کرنے کے شوق۔ اس کے اسی شوق کی وجہ سے اس کی سہیلیوں نے اسے الزبتھ ٹیلر کا خطاب دے رکھا تھا۔

رات کو اس ڈنر پارٹی میں جانے کے لیے سب ہی بڑے مشتاق تھے کیونکہ اب کی بار خوشنودہ نے کوئی بہت ہی موٹا مرغا پھانسا تھا اور ہر وقت اس کی تعریفوں میں زمین آسمان کے قلابے ملاتی رہتی تھی۔

"اچھا بائے سی یو! شام کو پولو گراؤنڈ میں ملیں گے! سویٹی سائٹی ہاتھ ہلاتی جوتوں کی ایک دکان میں گھس گئیں۔"

شام کو پولو گراؤنڈ میں واک کرنا بھی سب سہیلیوں کا پسندیدہ شغل تھا۔ وہاں بچوں کو جھولے جھولنے کے لیے چھوڑ دیتیں اور خود جاگنگ شوز پہن کر گراؤنڈ کے چکر لگانا شروع کر دیتیں۔

وہاں لاہور کا بڑا ان کراؤڈ آتا تھا۔ نوجوان لڑکے لڑکیاں تو ایک دوسرے کو بے تکلفی سے ہیلو! کہہ کر ٹیلی فون نمبروں کا تبادلہ کر لیتے البتہ مڈل ایج گروپ ذرا چھپ چھپا کر یہ کام کرتا۔

پولو گراؤنڈ شام کو انسانوں کی منڈی کی طرح دکھتا۔ اس کے بارے میں یہ شہرت خاصی عام تھی کہ وہاں جا کر آپ کوئی "دوست" تلاش کرنے میں ضرور کامیاب ہو سکتے ہیں۔ باوقار' چھڑی ہاتھ میں تھامے بوڑھے' دوسروں کی بیویاں تاکنے والے مرد' دل پھینک نوجوان' ڈھلتی ہوئی عمر والی عورتیں جن کے چہرے امریکہ سے منگوائی ہوئی مہنگی اینٹی ایجنگ کریمیں ملنے کے باوجود جھریوں کی آمد کو نہیں روک سکتے' بلکہ ہر نئی جھری ایک نئے نروس بریک ڈاؤن کا پیش خیمہ بن جاتی ہے' سبھی پولو گراؤنڈ میں چہل قدمی کرنے آتے تھے۔ سمکی کا شام کو پولو گراؤنڈ جانے کا موڈ نہیں بنا۔ دراصل وہ خوشنودہ کی پارٹی میں ذرا آرام کر کے جانا چاہتی تھی۔ اگر وہاں چلی جاتی تو اس کی بیوٹی سلیپ پوری نہ ہونے کی وجہ سے اس کا چہرہ تھکا تھکا لگنے لگتا اور یہ اسے کسی صورت بھی گوارا نہیں تھا۔ وحید نے بھی اس پارٹی میں آنا تھا۔ یہ سوچ کر اس کا من گنگنانے لگا اور ذہن رات کو پہننے والے جوڑے کے انتخاب میں مصروف ہو گیا۔

نعیم کو دوپہر کی فلائٹ سے اسلام آباد جانا پڑ گیا تھا اور سمکی تھوڑی زیادہ فری محسوس کر رہی تھی

کیونکہ خاوند کے پارٹی میں موجود ہونے سے تھوڑا سا ریزرو تو آخر رہنا ہی پڑتا ہے۔

پارٹی بہت شاندار تھی۔ خوشنود اپنا نیا مرغا لیے سب کو ہیلو ہائے کہتے نہ تھک رہی تھی۔ بیلی خاوند کے موجود نہ ہونے کے ڈپریشن میں مسلسل گرفتار سگریٹ پہ سگریٹ سلگائے' ہلکا ہلکا ڈرنک کر رہی تھی۔ کبھی کبھار کسی بات پر بے اختیار ہو کر وہ بے ساختہ ایک آدھ قہقہہ بھی لگا دیتی۔

وحید' سمکی پر اپنی بھرپور توجہ نچھاور کر رہا تھا۔ ڈولی' حمیرا کے بھائی ٹونی کی محبت میں کسی صورت بھی گرفتار ہونے کے لیے تیار نہ تھی اس لیے ٹونی کے جھوٹے اظہار محبت کا جواب اسے اپنی بے نیازی سے دے رہی تھی۔ ابھی کچھ عرصے پہلے ہی تو وہ اچھی ہوئی تھی ورنہ دریں کے شاعر دیور شاہی نے تو اسے اپنے شعر سنا سنا کر اچھی بھلی مریض عشق بنا دیا تھا۔

ٹونی! تمہیں معلوم ہے وحید صاحب آج کل اس بازار کے پرانے مکانوں کی وضع قطع اور تاریخ پر ریسرچ کر رہے ہیں!''

ڈولی نے ٹونی کا دھیان بٹانے کے لیے موضوع بدل دیا۔

''کیا واقعی؟ وحید صاحب کیا یہ سچ کہہ رہی ہیں؟'' اس نے بے یقینی کے عالم میں پوچھا۔ سمکی اور بیلی بھی ہمہ تن گوش ہو گئیں۔

''جی بالکل! وہ علاقہ بھی ہماری تاریخ کا حصہ ہے آخر۔ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ شاہی عمارتوں اور چکلوں میں اکثر و بیشتر مکانی قرب رہا ہے۔ اس لیے کہ بادشاہ مجروں کے شوقین اور طوائفوں کے دلدادہ ہوا کرتے تھے۔ ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں میں سب سے پہلا چکلہ محمد تغلق نے اپنی راجدھانی دولت آباد کے نزدیک طرب آباد کے نام سے قائم کیا۔ شہنشاہ اکبر نے آگرہ میں فتح پور سیکری کے پاس ان کے لیے شیطان پورہ آباد کیا۔ دلی میں چاندنی چوک اور قلعہ معلی سے ملحق چاوڑی بازار تھا۔ لکھنو میں واجد علی شاہ نے طوائفوں کو اپنے محل سے نزدیک ترین رکھا ہوا تھا اور ہمارے شہر لاہور کو دیکھئے شاہی قلعہ اور ہیرامنڈی میں چند ہی قدم کا فاصلہ ہے۔ ہیرامنڈی میں بہت سے مکانات تاریخی حیثیت کے حامل ہیں!''

ٹونی اور سب فرینڈز بڑے تجسس سے سن رہی تھیں۔

''یار دیکھنا چاہیے کبھی جا کر!'' ٹونی کے چہرے پر ایک عیاش طبع مرد کی سی مسکراہٹ پھیلنے لگی۔

''ہائے دل تو بڑا چاہتا ہے مگر کیسے جائیں؟'' حمیرا نے بھی اظہار خیال کیا۔

''کیا واقعی آپ لوگ وہاں کبھی نہیں گئے؟'' وحید نے یوں سادگی سے پوچھا جیسے وہاں جانا کوئی معمولی بات ہو۔

"کیا مطلب ہے؟ ہم کیوں جانے لگے بھلا اس گندی جگہ پر'توبہ توبہ!" ببلی نے نیا سگریٹ سلگاتے ہوئے ناک بھوں چڑھائی۔

"بھئی ویسے ہی! مشاہدے کے لیے بھی تو بندہ کبھی جا سکتا ہے آخر! اتنا محدود مشاہدہ بھی نہیں ہونا چاہیے میرے خیال میں انسان کا! زندگی کے ہر پہلو پر نظر ڈال لینی چاہیے۔ اپنی دنیا سے باہر نکل کر بھی دیکھنا چاہیے کہ اس پار کے لوگ کس طرح کی زندگی بسر کرتے ہیں!"

سب لوگ قائل سے ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

" ویسے ایک بار ہم لوگوں نے خالی ڈرائیو کر کے ان گلیوں کو دیکھا تھا۔ یاد ہے سکی' نعیم بھائی اور عرفان اللہ ساتھ لے گئے تھے ہمیں!"

ڈولی نے بھانڈا پھوڑ دیا۔

"ہاں! بس ڈرائیو ہی کی تھی! اور تو کچھ نہیں کیا تھا"۔

سکی جھٹ سے بولی۔

"چلو یار' ہو جائے!" ٹونی نے تجویز پیش کی۔

"کیا؟" وحید نے پوچھا۔

"بھئی چلتے ہیں! ابھی رات جواں ہے۔ ذرا نظارہ کرتے ہیں۔ آخر مشاہدہ بھی تو کرنا ہے نا!"

سب ہنسنے لگے۔

"نہیں' نہیں مجھے تو بڑا ڈر لگتا ہے بھئی!" خوشنود اپنے نئے میاں سے لاڈ سے چپک گئی۔

"جس نے چلنا ہے چلے جس نے نہیں چلنا نہ چلے۔" ٹونی اٹھ کھڑا ہوا سکی نے وحید کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"چلنا ہے؟" وہ سرگوشی کے انداز میں بولا۔

"آپ کہیں اور ہم نہ آئیں ایسے کیسا ہو سکتا ہے؟" آپ ساتھ ہوں گے تو مجھے کوئی فکر غم نہیں!"

سکی نے دل ہی دل میں شکر کیا کہ اس کا میاں شہر سے باہر گیا ہوا تھا ورنہ شاید تھوڑا بہت ہنگامہ کرتا یا اسے جانے سے روک لیتا۔ کبھی کبھی وہ بہت اولڈ فیشنڈ لوگوں کی طرح تنگ دل ہو جایا کرتا تھا۔

دو گاڑیوں میں جانے والے سوار ہوئے۔ باہر کی نرم معطر ہوا کے شفیق لمس نے انہیں مزید شوخ بنا دیا۔ ٹونی بہت مچلا جا رہا تھا۔

"بھئی ہم تو فارنر ہیں ہمیں لاہور بائی نائٹ دیکھنے کا بہت شوق ہے۔ آپ سب ہمیں سیر

کروائیے! وہ بچوں کی طرح ضد کرنے لگا!"

ڈاکٹر وحید تو لاہور شہر کا چلتا پھرتا انسائیکلو پیڈیا ثابت ہو رہا تھا۔ اسے شہر کے بارے میں مکمل معلومات تھیں۔ پہلے اس نے سب کو مولا بخش کے مشہور و معروف پان کھلوائے' پھر گوالمنڈی کے قلفے کی دکان پر ہلّہ بول دیا۔

"یو نو ٹونی! مزنگ میں چائے کی ایک ایسی دکان ہے جو آج تک کبھی بند نہیں ہوئی۔ یعنی جب ایک دکاندار تھک جاتا ہے تو دوسرا آ سنبھالتا ہے عام طور پر باپ بیٹا مل کر یہ کام کرتے ہیں!"

وحید نے ٹونی کو مزید حیرت زدہ کر دیا۔

"ایسے ایور لاسٹنگ انسٹی ٹیوشنز کا تو "گینز بک آف ورلڈ ریکارڈز" میں ذکر ہونا چاہیے یار!"

ٹونی متاثر ہو کر بولا۔ وحید نے اس دکان کی چائے سب کو پلوائی تو سب اس چائے کی اعلیٰ کوالٹی کے بھی قائل ہو گئے۔

"اگلا سٹاپ راوی دریا ہے!" وحید نے اناؤنس کیا اور گاڑی پارک کرنے کے بعد وہ لوگ نیچے اتر آئے۔

"راوی کے بارے میں بھی ہمیں کچھ بتائیں پلیز!" ایک فرمائش آئی۔

"اس دریا میں اب وہ شاہانہ پن کہاں جو ماضی میں اس کی لہروں میں چھپا جھلملاتا ہوا زیور ہوا کرتا تھا۔ اب تو یہ ایک اجڑی ہوئی بیوہ کی مانند ویران ہو کر رہ گیا ہے۔ سکڑ کے یوں سمٹ کر رہ گیا ہے جس طرح کوئی ان چھوئی دوشیزہ اپنی عزت لٹ جانے کے بعد اپنی بچی کھچی عزت نفس کے چیتھڑے اپنے جسم پر لپیٹنے کی کوشش میں خود کو ناکام سا محسوس کر کے بے بسی کے گرداب میں پھنس کر رہ جاتی ہے۔ وقت بہت ظالم چیز ہے۔ ہر شے کو روند کر آگے بڑھ جاتا ہے۔"

"یار ڈپریس نہ کرو اور اگلی منزل پر لے چلو یعنی اصلی مقام پر!" ٹونی اس اداسی سے بھری ہوئی کمنٹری سے بور ہو چلا تھا۔

سب خوش ہو گئے اور اب گاڑیاں شاہی محلے کی طرف چل دیں۔

تنگ تنگ گلیوں اور اونچے چوباروں والا یہ عورت بازار' مردوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا نظر آتا تھا۔ زریں سمیت 'ڈولی' سبھی نے شریف عورتوں کی طرح اپنے دوپٹے سروں پر لے لیے اور دھڑکتے ہوئے دلوں کے ساتھ ادھر ادھر دیکھنا شروع کر دیا۔ گاڑی آہستہ آہستہ سڑک کے سینے پر رینگنے لگی۔

"ہائے اللہ جی! کیسی جگہ ہے!" انہوں نے بے یقینی کے عالم میں اوپر ایک چوبارے کی طرف

نظریں دوڑائیں اور پھر دیکھا کہ مختلف مکانوں کی بالکونیاں ایک سا نظارہ پیش کر رہی تھیں۔

ہر بالکونی پر ایک ایک دو دو لڑکیاں کرسی ڈالے مجسمے بنی بیٹھی متجسس نگاہوں سے راہ گیروں کو دعوت نظارہ دیتی نظر آ رہی تھیں۔ ان کے سروں پر دو دو سو پاور کے تیز بلب جگمگا رہے تھے جس میں نہائی وہ بھی سجائی شوکیس میں بجی لذیذ مٹھائیاں لگتی تھیں۔ مٹھائیوں کی دکان میں بجی مٹھائیاں دیکھ کر کس کافر کا دل للچائے بغیر رہ سکتا ہے اس لیے بالکونی کے نیچے کھڑے کتنے ہی درمدے بھیڑیے اپنی رال ٹپکاتی تھوتھنیاں اوپر اٹھائے اپنی غلیظ نظروں سے محض ونڈو شاپنگ کر کے ہی دل کو خوش کر رہے تھے۔

کچھ بالکونیاں ایسی بھی تھیں جو مٹھائیوں کے بجائے چرغے کی دکان دکھائی دیتی تھیں۔ ان پر رسیوں سے لٹکی ہوئی کھال نچی چٹخارے دار مصالے میں ڈوبی ہوئی ننگی روسٹ ہونے کو تیار مرغیاں خریدار کو اپنی طرف کھینچتی نظر آ رہی تھیں۔

"گندی عورتیں! کیوں ایسا غلیظ کام کرتی ہیں توبہ!" بیلی کو کراہت سی محسوس ہوئی۔

"عذاب الٰہی نازل ہوگا ان پر!" ہمکی بھی استغفار کرنے لگی۔

"کیا سین ہے یار! مزا آ گیا!" ٹونی بہت انجوائے کر رہا تھا۔

"مجھے تو بھوک لگی ہے اور سنا ہے یہاں کے پائے بہت مشہور ہیں!"

ٹونی نے ایک دکان پر بچھے کے پائے لکھے دیکھ کر نیا شوشہ چھوڑ دیا۔

"میری پارٹی سے کھا پی کر نہیں آئے کیا؟" خوشنود نے برا مناتے ہوئے کہا۔

"بھئی اتنی سیر کے بعد اگر یہاں کے مشہور پائے نہ چکھے تو اس ایڈونچر کا فائدہ؟ یا تو پھر آپ لوگ اور کچھ کھلا دیں تو میں کمپرومائز کر لوں گا!" ٹونی کھی کھی کرنے لگا۔

سب نے اسے گھور کر اس طرح دیکھا کہ وہ ڈھیٹ بن کر مذاقاً ان کے آگے ہاتھ جوڑنے لگا۔

"نو پرابلم بھئی بچھے کے پائے یہاں کی خاص ڈش ہے۔ کوئی حرج نہیں کھا لیتے ہیں۔"

وحید کے کہنے پر سب لوگ گاڑی سے اتر کر دکان کے اندر چلے گئے اور تھوڑی دیر میں کھانا آ گیا۔ تام چینی کی چھوٹی چھوٹی پلیٹوں میں پتلے سے شوربے میں ڈوبی ہوئی ایک ایک بوٹی اور نان ان کے سامنے رکھ دیے گئے۔ پینے کے لیے سٹیل کے جگ اور گلاس بھی بیرا بڑے اہتمام سے سیٹ کر کے رکھ گیا۔ برتن دیکھتے ہی خواتین نے عجیب و غریب نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

"سلاد؟" حمیرا نے میز پر نظریں دوڑائیں۔

"سلی گرل! یہاں صرف گوشت سرو کرتے ہیں!" وحید نے اطلاعاً کہا۔

''اچھا ذرا ٹشو ہی منگوا دیں!'' مسکی نے شوربے میں ڈوبی انگلیاں دیکھ کر بے چینی سے فرمائش کی۔

''آپ کھانے کے بعد ادھر ہاتھ دھو سکتے ہیں جی!'' نوکر نے ایک طرف لگے ہوئے واش بیسن کی طرف اشارہ کیا۔ جس کی ایک طرف ہاتھ پونچھنے کے لیے سفید' میلا سا تولیہ بھی لٹک رہا تھا۔

''Have Fun Ladies! ریلیکس اینڈ انجوائے دس پلیس'' ٹونی نے ہولے سے سرزنش کی اور سب سر جھکا کر کھانا کھانے میں مشغول ہو گئے۔

کھانا کھانے کے بعد مجبوراً اسی طریقے سے ہاتھ دھونے پڑے۔ شکر ہے وہاں ڈھنگ کا صابن کم از کم موجود تھا' مگر دھونے کے بعد جیسے ہی زریں نے تولیے کی جانب ہاتھ بڑھایا۔ بجلی نے پاگلوں کی طرح نروس ہو کر ہلکی سی چیخ مار کر اسے پیچھے کھینچ لیا۔

''ڈونٹ ٹچ اٹ! ایڈز! ایڈز!''

''ہائے اللہ۔ یو آر رائٹ!''

ایک دبی دبی چیخ ان کے لبوں سے نکلی۔ وہ یوں چونک کر اس تولیے سے دو دو گز دور ہو گئیں جس طرح وہ تولیہ بجلی کا تولیہ ہو۔ سب ہنس دیئے۔

''او کم آن لیڈیز! کیسے کیسے فوبیاز میں گرفتار ہیں آپ لوگ! اگر اتنا ہی خوف ہے تو چلیں واپس چلتے ہیں۔ میرا خیال ہے کافی سیر ہو گئی ہے' ٹھیک ہے؟''

ڈاکٹر وحید اپنے مخصوص دھیمے انداز میں بولا۔

''اسلام علیکم ڈاکٹر صاحب! کیا حال چال ہیں جناب کافی دنوں بعد نظر آئے۔ آپ کا کام ختم ہو گیا کیا؟''

نو وارد نے آتے ہی کئی سوال کر ڈالے۔ ڈاکٹر وحید اس سے بڑی گرمجوشی سے ملا اور اپنے دوستوں سے اس کا تعارف کروانے لگا۔

''یہ یہاں کے علاقہ کونسلر جناب ضمیر الدین ککے زئی ہیں۔ بہت اچھے شخص ہیں۔ ریسرچ کے دوران انہوں نے میری بہت مدد کی اور ہر طرح سے تعاون کیا۔ انہی کی وجہ سے میں ہیرا منڈی کی اصل تاریخی حیثیت کے بارے میں معلومات حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکا ہوں!''

''اچھا! اچھا! سب متاثر ہو کر دیکھنے لگے۔''

''گھر والے آئے ہیں شاید! یہاں کچھ کھائیں پئیں گی؟''

اس نے مہمان نوازی کا حق ادا کرتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں نہیں ہم لوگ تو ابھی پائے کھا کر بیٹھے ہیں۔ شکریہ یہ سب دوست ہیں۔ انہیں بہت تجسس تھا یہاں آ کر دیکھنے کا شوق تھا۔ اس لیے میں ان کی خواہش سے مجبور ہو کر انہیں یہاں لے آیا۔!"

وحید نے وضاحت کی۔

"اچھا تو پھر آپ کے دوست تو ہمارے دوست بھی ہوئے کیا خاطر کی جائے آپ لوگوں کی؟ جا یار بوتلیں لے کر آ۔!"

کونسلر نے اپنی ہیرے کی چمکتی انگوٹھی والا ہاتھ بڑھا کر ایک لڑکے کو پانچ سو کا نوٹ پکڑا دیا اور جلدی آنے کی تاکید کی۔

"نہیں نہیں آپ تکلیف نہ کریں۔ شکریہ بہت بہت بجلی جو بہت عقلمند تھی چپ نہ رہ سکی۔"

"تکلیف کیسے جی آپ ہمارے مہمان ہیں آپا جی۔ یہ تو کوئی بات ہی نہیں ڈاکٹر صاحب فرمایئے اور کوئی خدمت ہو تو؟"

"ہمیں ان کا ڈانس دیکھنے کا بہت شوق ہے! کیا ہمیں آپ کوئی مجرا دکھا سکتے ہیں کیونکہ ہم نے تو بس فلموں میں ہی دیکھ رکھا ہے!"

سمکی صاف جھوٹ بول گئی حالانکہ ابھی پچھلے ہی دنوں اس نے کسی ولیمے پر دو نوجوان رقاصاؤں کا مجرا دیکھا تھا جن کے بارے میں سنا تھا کہ وہ آج کل مارکیٹ میں ٹاپ پر جا رہی ہیں۔

"ہاں جی! ہم دیکھنا چاہتے ہیں ان کے گھر کیسے وہ سب کچھ کرتی ہیں؟ وہاں کا ماحول وغیرہ۔ یو نو! اگر ممکن ہو سکے تو۔۔۔ یعنی اگر آپ کو کوئی پرابلم نہ ہو تو۔۔۔۔۔۔!"

بجلی نے بڑے اخلاق سے بات کی۔

"کمال کرتی ہیں آپا جی آپ! پرابلم یا تکلیف کی کونسی بات ہے اس میں۔ یہ میری اپنی قوم ہے جی۔۔۔۔ میری اپنی بچیاں ہیں۔ ہم فنکار لوگ ہیں جی۔ فن بیچ کر پیٹ پالتے ہیں فن کا مظاہرہ ہی ہماری زندگی ہے۔ میں آپ کو لے چلتا ہوں۔ آپ فکر ہی نہ کریں!"

کونسلر بڑے فخر سے انہیں اپنے ساتھ لے کر چلنے لگا۔ راستے میں کچھ لوگوں نے سروں پر چادریں لیے فیشن ایبل عورتوں اور مردوں کو دیکھا تو چہ میگوئیاں شروع کر دیں۔

"ہائے اللہ کتنا Embarrassing لگ رہا ہے! کہیں چھاپہ نہ پڑ جائے اور اخبار میں ہماری فوٹو نہ آ جائے کل صبح۔"

ہمیشہ کی وہمی ڈولی نے اپنا اندیشہ ظاہر کیا۔

"کیا بیوقوفیاں بک رہی ہیں آپ۔ تمہارا کیا مطلب ہے ہم جیسوں کو کوئی 'وہ' سمجھ سکتا ہے! دماغ تو نہیں چل گیا! توبہ ہے تم بھی کبھی کبھار بڑی عجیب بات کر دیتی ہو کہاں "ہم" کہاں وہ۔ توبہ اللہ معاف کرے ان کے تو چہروں پر ہی پھٹکار پڑی ہوتی ہے۔ نحوست ماریاں!"

بجلی نے ڈولی کو چپ کروا دیا۔

گلیوں میں کھلتے دروازوں والی ہر مکان کی بیٹھک پر ایک پردہ پڑا ہوا تھا۔ جس میں سے باہر سے دیکھنے والے کو اندر کا 'کچھ ڈھکا' کچھ چھپا' نیم وا آنکھوں کا سا منظر دکھائی دے رہا تھا۔

"یہ پردے؟" بجلی نے پھر سوال کیا؟

"آپا جی پردہ نہ ڈالیں تو پولیس فحاشی کا الزام لگا دیتی ہے اور اگر مکمل طور پر پردہ ڈال کر رکھیں تو گاہک کو کیسے معلوم ہو کہ اندر والی کیسی ہے؟ جی بزنس کے لیے ان باتوں کا بڑا خیال رکھنا پڑتا ہے ہم لوگوں کو!"

اس نے بڑے کاروباری انداز میں جواب دیا۔

کونسلر نے کچھ ہی دیر میں انہیں ایک دو منزلہ مکان کے آگے لے جا کر کھڑا کر دیا۔ "یہ سندری اور مندری کا کوٹھا ہے۔ آج کل یہ بھی بہت پاپولر ہیں۔ دونوں بہنوں نے فن کی بلندیوں کو چھو لیا ہے۔ آپ دیکھیں گے تو بہت پسند کریں گے!"

وہ انہیں مکان کے اندر لے گیا۔ مگر ایک منٹ پر باہر رکنے کا اشارہ کیا۔ بیٹھک میں ان کے داخل ہونے سے پہلے وہ خود شاید ان کے بارے میں اندر والیوں کو کچھ بتانا چاہتا تھا اندر سے ملی جلی آوازیں آ رہی تھیں۔ ایک دو بار یہ فقرہ بھی کان میں پڑا۔

"شریف آئے ہیں! بوتلیں منگواؤ!"

"ہائے اللہ ناٹ اگین! بوتلیں پی پی کر تو میرا حشر ہو گیا ہے!"

ڈولی نے برا سا منہ بنایا۔

"بھئی ہم v i p ہیں آخر" زریں نے فخریہ انداز میں کہا۔

اسی لمحے گلی کے ایک کونے والے ویڈیو سنٹر سے اونچی آواز میں انگلش گانوں کی کیسٹ بجنے لگی۔

She works hard for the money

So you better treat her right.

امریکی پاپ سنگر ڈوناسمر اپنے مخصوص انداز میں پرجوش طریقے سے گا رہی تھی۔

''اوئی اوئی ویڈیو سنٹر!'' بیلی نے بلند آواز میں ویڈیو سنٹر کا نام پڑھا اور سب زیر لب مسکرا دیئے۔

''آیئے جی اندر!'' کونسلر انہیں بڑی عزت سے اندر لے گیا۔ اندر ایک بڑی عمر کی عورت اور دو نوجوان لڑکیاں کمرے میں موجود تھیں۔

''سلام علیکم جی!'' سب نے ایک دوسرے کو سلام کیا۔

ٹونی اور وحید بڑے خوش نظر آنے لگے اور کیوں نہ آتے' لڑکیاں دونوں بہنیں نوجوان تر و تازہ اور انداز سے مہذب دکھائی دیتی تھیں۔ سندری اپنے نام کی طرح سندر تھی۔ سرخ و سفید رنگت' تیکھے نقوش' لانبے سیاہ بال اور پتلی کمر اسے بہت پرکشش بنائے دے رہی تھی۔

مندری ذرا مختلف تھی۔ اس کا رنگ گندمی مائل اور نقوش کچھ ایسے غیر معمولی تو نہیں تھے مگر اس میں جسمانی کشش بدرجہ اتم موجود تھی۔ جب وہ اپنے شانے تک کٹے ہوئے سیاہ بالوں کو سٹائل سے جھٹکا دیتی تو اس پر ماضی کی اداکارہ نیلو کا گمان ہونے لگتا۔

ان کی ماں' بروکیڈ کے چمکدار گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے' پان چباتے' سازندوں کو اپنے سُر ٹھیک کرتے دیکھ رہی تھی۔ ہارمونیم اور طبلے سیٹ کیے جا رہے تھے۔ مگر موسیقی کے بجائے ہارمونیم سے دردیلی چیخیں اور ٹھونکے جانے والے طبلوں سے دل کی دھڑکنیں' ایک دھمک کے ساتھ اچھل اچھل کر باہر کو ایسے نکلتیں کہ درو دیوار لرزنے لگتے اور سوالیہ نشان پرانی سفیدی کی طرح اکھڑ اکھڑ کر نیچے گرنے لگتے۔ ایک عجیب سی افسردگی اور بے حسی کا وجود اس کمرے میں اپنی پوری طاقت کے ساتھ موجود تھا۔ چند ہی لمحوں میں بوتلیں آ گئیں۔ چار و ناچار سب کو پینا پڑیں ورنہ میزبانوں کی دل شکنی ہوتی۔

ابھی ساز سیٹ ہی ہو رہے تھے کہ مندری' جو شاید بڑی بہن تھی' اٹھ کر ایک کھڑکی نما دروازے سے گھر کے اندر چلی گئی۔

سمی کی نظروں نے اس کا تعاقب کیا مگر کھڑکی سے کچھ نظر نہ آتا تھا کیونکہ اس کے آگے ایک موٹا سا پردہ لگا ہوا تھا۔

''کیا اب شروع کیوں نہیں کر دیتیں؟''

مہمان خواتین نے کسمسانا شروع کر دیا۔

''کیا یہ لڑکی نیمن تارا تھی؟'' سمی نے نیمن تارا نامی رقاصہ کے بارے میں بہت سن رکھا تھا۔ اسے شاید سب تک ان دونوں لڑکیوں کے نام معلوم نہیں ہوئے تھے۔

"نہیں جی! نین تارا تو فلموں میں چلی گئی ہے۔ یہ بھی بہت فریش پیس ہیں جی!" کونسلر کھی کھی کرنے لگا۔

"لاحول ولاقوۃ!" بلی کو کوفت ہونے لگی تھی اس قسم کے انداز گفتگو سے۔

"دراصل جناب ابھی آفس کے ٹائم میں کچھ وقت رہتا ہے اور باجی ٹائم سے پہلے کام نہیں شروع کرتیں۔"

سندری نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔

"آفس!" خواتین کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔

"جی ہاں آپا جی' یہاں کے کام کے اوقات گیارہ بجے سے ایک بجے ہیں۔ انہی اوقات کے دوران ہی کام کیا جاتا ہے اور ابھی گیارہ بجنے میں پانچ منٹ ہیں' بس وہ اندر سے آتی ہی ہوں گی۔"

گلی میں کھلی کھڑکی میں سے انہوں نے کئی گاڑیاں آتی دیکھیں جن میں بھڑکیلے کپڑے پہنے فل میک اپ کئے خواتین بیٹھی تھیں۔ گاڑی کسی مکان کے آگے رکتی عورت اترتی اور بیٹھک کے اندر چلی جاتی۔ یہ وہ تھیں جنہوں نے اپنی رہائش شہر کے معزز علاقوں مثلاً گلبرگ' علامہ اقبال ٹاؤن' ماڈل ٹاؤن میں رکھی ہوئی تھی مگر صرف کام کی غرض سے آفس ٹائم میں ہی ہیرا منڈی میں آتی تھیں۔

گیارہ بجتے ہی موسیقی شروع ہو گئی۔ پردے گرا دیے گئے' سندری نے گھنگھرو پہن لیے اور رقص شروع کر دیا۔

"دھیرے دھیرے میری زندگی میں آنا۔۔۔۔ دھیرے دھیرے میرے دل کو چرانا۔۔۔۔"

رقص شروع ہو گیا مگر مندری کچھ دیر بعد آئی اور بہن کے ساتھ مل کر گانا اور رقص کرنا شروع کر دیا۔

"دیر سے کیوں آئی ہے؟ غالباً اندر بھی کسی کو اٹینڈ کر رہی ہو گی!"

زریں اور بلی سرگوشیوں میں طنز کرنے لگیں۔ سمکی نے دزدیدہ نگاہوں سے وحید کوتاکا۔ شکر ہے وہ رقاصہ کو نہیں بلکہ اسی کو معنی خیز نظروں سے دیکھ کر گیت کو انجوائے کر رہا تھا۔ سمکی کے دل میں اک ہوک سی اٹھی۔ دھیرے دھیرے میری زندگی میں آنا۔۔۔۔۔۔

مندری کے چہرے پر ایک پکی لگن سے کام کرنے والے ذمہ دار ورکر کا سا تاثر تھا۔ سندری البتہ الہڑ اور شوخ دکھتی تھی۔ اس کے انداز اور ادائیں اس کی کم عمری اور ذہنی ناپختگی کی چغلی کھاتی تھیں۔

ایک گانے کے بعد انہوں نے دوسرا فلمی گانا شروع کر دیا۔

"میں تیری دشمن دشمن تو میرا۔ میں ناگن تو سپیرا!"

"توبہ کتنا گھٹیا گاتا ہے!"

"اور کتنا غلیظ ماحول ہے۔۔۔۔ان عورتوں کو تو شرم وحیا پاس سے بھی نہیں چھو کر گزری۔۔۔کس طرح نوٹ سمیٹتی ہیں اپنے جسم کی نمائش کر کر کے!"

عورتوں میں حسب عادت بدخوئیاں شروع ہو چکی تھیں۔ٹونی نے ان کے تیور محسوس کر کے انہیں آنکھوں ہی آنکھوں میں سرزنش کی کیونکہ وہ تو اس ناچ گانے سے بھرپور لطف اٹھا رہا تھا۔کہاں نیو یارک اور لندن کی ریڈ لائٹ ایریا کی طوائفیں اور کہاں یہ رقص وموسیقی۔

"یار ہمارے مشرق میں ہر چیز ہوتی ہے مگر ہوتی ذرا سٹائل سے ہے!ہے نا؟"

اس نے وحید کے کان میں دھیرے سے سرگوشی کی۔

نغموں کی لے اور بول بدلتے جا رہے تھے مگر جسم وہی تھے۔وہ ہر تان پر تھرکنا لچکنا بخوبی جانتے تھے۔

"ارے کسی کو بھیج کر اچھے سے پان منگواؤ۔شریف آئے ہیں!"

لڑکیوں کی ماں نے ایک سازندے کو ایک گانا ختم ہوتے ہی آرڈر دیا۔

بلی کو یہ سن کر غرور سے نشہ سا آ گیا۔

اس سے پہلے کہ نیا گانا شروع ہوتا ایک ملازم نے مندری کے کان میں آ کر کچھ کہا۔مندری نے فوراً اپنے پاؤں کے گھنگھرو اتارے اور کمر کے گرد بندھا دوپٹہ ڈھیلا کرنا شروع کر دیا۔

مہمانوں نے استفہامیہ نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور اپنی نظروں میں ایک دوسرے کو جواب بھی دے دیا۔یقیناً اندر کوئی موجود تھا۔جو یہ پھر چل پڑی تھی۔

"بھئی یہ عورتیں پکی پروفیشنل ہیں۔کمائی کا کوئی بھی موقعہ ہاتھ سے نہیں جانے دیتیں۔اب دیکھو یہاں سے ناچ کر بھی کما رہی ہیں اور پردے کے پیچھے دیوار کے اس پار بھی اپنے دام کھرے کرنے کا کوئی موقعہ ہاتھ سے جانے نہیں دے رہیں۔ویسے آئی ریسپکٹ دیئر پروفیشنل ازم!" ڈولی نے بلی کے کان میں کہا۔

مندری نے ایک دو گانوں پر اکیلے ہی ڈانس کیا پھر کچھ دیر بعد تھک کر ستانے کے لیے بیٹھ گئی۔

نہ جانے مندری آنے میں اتنی دیر کیوں لگا رہی تھی۔

"میں تو بور ہو رہی ہوں۔"

"اور میرا دم گھٹنے لگا ہے اس ماحول میں لگتا ہے ہارٹ اٹیک ہو جائے گا مجھے تو!"

توبہ ہمارا مذہب کس طرح پامال ہو رہا ہے یہاں پر! اللہ میری توبہ!"

"مجھے تو ابکائی آ رہی ہے!"

"بھئی مجھ میں تو اور فاقہ شی دیکھنے کی تاب نہیں Lets Go"۔

مہمان خواتین آپس میں اظہار خیال کر کے اٹھنے لگیں۔

"باجی! وہ لوگ جا رہے ہیں!" سندری نے پردے کے قریب منہ لے جا کر کہا ایک لمحے کو خاموشی رہی پھر سندری بھی اندر کو چل دی۔

"بہت مصروف ہوگی۔ رہنے دو بھئی!" بجلی طنزیہ لہجے میں مسکرائی۔

"بڑی بدتمیز اور گھٹیا ہے یہ سستی عورت۔ اتنی توفیق نہیں ہوئی کہ ہم لوگوں کو جانے سے پہلے شکریہ اور سلام کر کے رخصت کرے۔ آخر پیسے دیئے ہیں! اسفت تو ناچ نہیں دیکھا ان کا!"

خوشنود نے توہین محسوس کرتے ہوئے ناک بھوں چڑھائی اور سب سیڑھیاں اترنے لگے۔

سندری دوبارہ باہر نکل آئی اور انہیں جاتا ہوا دیکھنے لگی۔

خوشنود کے اندر تجسس اور حقارت نے یکا یک ڈھٹائی آمیز جرات پیدا کر دی۔

سیڑھیاں اترنے سے پہلے کھڑکی نما دروازے کے پاس گزرتے ہوئے وہ سب کی نظریں بچا کر پردے کا کونہ سرکائے بغیر نہ رہ سکی۔ وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ آخر وہ کونسا ایسا عاشق تھا جس کی خاطر وہ بار بار اندر جا رہی تھی اور آخر میں تو اندر جا کر بیٹھ ہی گئی تھی۔

مگر اندر کا نظارہ اس کی توقع کے بالکل خلاف نکلا۔ اس کی نظریں ٹھٹک کر رہ گئیں۔ کمزور پاور کی زرد بیماری روشنی میں نہائے' گدلے پانی جیسے نیلے کمرے میں بچھی چار پائیوں پر آڑے ترچھے لیٹے کچھ افراد سو رہے تھے۔ کسی کسی چار پائی پر بچوں کے گچھے بھی بے خبر پڑے تھے۔ لیکن ایک بچہ گچھے سے علیحدہ بلب کے عین نیچے کتابیں لیے بیٹھا تھا۔

اس کے ساتھ اس کی ماں بھی اس کی کتابوں پر جھکی ہوئی اسے کچھ پڑھ کر سنا رہی تھیں۔ ماں نے فوراً پردہ اٹھا کر جھانکنے والی کو دیکھ لیا اور معذرتانہ انداز میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

"سوری جی! آپ لوگ جا رہے ہیں! پھر کبھی آیئے نا۔ دراصل صبح اس کا ٹیسٹ ہے اور میرے بغیر اسے کوئی ٹیسٹ یاد نہیں کروا سکتا! انگلش کا بڑا مشکل ٹیسٹ ہے اسی لیے میں اسے یاد کروا رہی تھی آپ کو تو پتہ ہے جب تک بچوں کے ساتھ خود نہ لگو کہاں پڑھتے ہیں آپ کچھ اور بیٹھے بس میں آ ہی رہی تھی!" خوشنود جلدی جلدی سیڑھیاں اترنے لگی اب اس کا واقعی دم گھٹنے لگا تھا۔

# نیلوفر اقبال

## آنٹی

روفہ کی پشت میری جانب تھی۔ اس کا سرخ لیس والا گاؤن جس کے پیچھے کے تمام بٹن کھلے ہوئے تھے کرسی کی دونوں جانب پروں کی مانند پھیلا ہوا تھا۔ کھڑکی سے آتی ہوئی ہلکی ہلکی دھوپ میں اس کے بلونڈ سر کے گرد سنہری ہالہ سا نظر آ رہا تھا اور پیچھے کی طرف سے وہ کسی فرشتے کا پاکیزہ اور پرنور سر نظر آ رہا تھا۔ اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ فرشتہ یکلخت غائب ہو گیا۔

"اگر اس نے مجھے ریپ کرنے کی کوشش کی تو؟......"

"تو تم ریپ ہو جاتا"

"ہاہاہا.....آئی لائیک اٹ.....بٹ مائی ڈیر گرل! یو ڈونٹ نو می.....میں اتنی ایزی نہیں ہوں.....پہلی دو ڈیٹس پر تو سوال ہی نہیں۔ مجھے بھی اپنی سیلف ریسپیکٹ پیاری ہے.....پہلی ڈیٹ پر ڈھے جانے والیوں کی تو مرد بالکل عزت نہیں کرتے....."

"جبکہ تیسری ڈیٹ پر ڈھے جانے والیوں کی تو ماں بہن کی طرح عزت کرتے ہیں۔"

"جہنم میں جائیں۔ تم ادھر آ کر ذرا شیشہ پکڑو۔ اس منحوس ڈریسنگ ٹیبل کی طرف تو بالکل اندھیرا ہے.....اف کیسا ذلیل بال ہے....." اس کے ایک ہاتھ میں چھوٹا سنہری ہینڈل والا شیشہ تھا اور دوسرا ہاتھ جس میں موچنا تھا بار بار جھٹکے سے اوپر اٹھتا نظر آ رہا تھا۔

عین اسی وقت کمرے میں سیاہ فام اور تنومند "السبیحہ" نے جھانکا جو ہوسٹل میں صفائی کرتی تھی۔

میری جان چھوٹ گئی......"السبیحہ میڈم کا شیشہ پکڑو آ کر" میں نے کہا۔

وہ فوراً لپک کر آئی۔ ویسے بھی اس کا دل اسی کمرے میں زیادہ لگا رہتا تھا۔ اس وقت بھی وہ روفہ کا بخشا ہوا سیاہ زمین پر بڑے بڑے اورنج پھولوں والا لباس کسی نہ کسی طرح چڑھائے ہوئے تھی۔ وہ بڑے غور سے اور دلچسپی سے روفہ کو بنتے سنورتے دیکھا کرتی تھی۔ جہاں روفہ کی نگاہ چوک جاتی وہاں السبیحہ کی باریک بین نظر فوراً تاڑ لیتی۔ "باجی اے وال رہ گیا جے" وہ روفہ کے موچنے کی زد سے بچ جانے والے بال کی

طرف فوراً توجہ دلا دیتی۔

روفہ بھی اسے دل کھول کر ٹپ دیتی تھی۔ اس کے پرانے کپڑے جو قریب نئے ہوتے تھے رنگ برنگے سینڈل' بچی کچھی لپ سٹکیں۔ تقریباً سوکھی ہوئی نیل پالش اور اختتام کو پہنچی ہوئی آئی برو پنسلیں ---سب کی حقدار وہی ٹھہرتی۔ اس لیے وہ روفہ کے کمرے کے کچھ زیادہ ہی پھیرے لگاتی۔

چھٹی والے دن روفہ اس سے مالش کرواتی تھی۔ مالش کے دوران اس کے بدن پر دو انگل جانگیے کے سوا کچھ نہ ہوتا۔ جونہی لسبجھ باتھ روم سے اولو آ ئیل کا سبز ٹن لیے 'نکلتی' میں کوئی کتاب اٹھا کر باہر لان کی طرف نکل جاتی۔ تقریباً پون گھنٹے بعد لسبجھ کسی ٹاکی سے ہاتھ پونچھتی باہر نکلتی دکھائی دیتی تو میں واپس کمرے میں جاتی۔

ورکنگ ویمن ہوسٹل میں کچھ عرصے سے میں اور روفہ ایک ہی کمرے میں تھیں۔ میری تقرری اسلام آباد کے ایک لڑکیوں کے کالج میں بطور انگلش کی لیکچرر کے ہوئی تھی۔ لاہور سے آنے کے بعد کچھ دن مجبوراً مجھے اپنی ایک رشتے کی خالہ کے گھر رہنا پڑا۔ جو اس کنبے پر بوجھ ہونے کے ساتھ میری عزت نفس پر بھی بوجھ بنتا جا رہا تھا۔ ایسے میں ایک دن کتابوں کی ایک دوکان سے نکلتے ہوئے ایک لڑکی کی چال اور ہیئت نے میری توجہ کھینچ لی۔ وہ میرے آگے آگے چل رہی تھی۔ اس کے سنہری بال سیاہ لباس کے ساتھ بڑا دلکش کنٹراسٹ پیدا کر رہے تھے۔ چال میں بڑی جارحانہ قسم کی بے باکی تھی۔ میں نے سوچا پیچھے سے تو بڑی شے ہیں دیکھوں سامنے سے کیا ہے۔ میں نے قدم ذرا تیز کیے اور برابر پہنچنے کے بعد کنکھیوں سے دیکھا۔ روفہ۔ ہم دونوں یونیورسٹی میں ساتھ تھیں۔

''میں دیکھ رہی تھی کہ یہ کون مس ایجر لوسب ٹہل جا رہی ہے۔''

اس نے خوش ہو کر زور سے قہقہہ لگایا۔ ہم دونوں اپنی عمر کی تیسری دہائی کے آخری حصے میں تھیں۔ وہ تین سال ہوئے طلاق لے چکی تھی اور میری کچھ جذباتی حادثات کی وجہ سے شادی نہیں ہو سکی تھی۔

ہم دونوں نے فاسٹ فوڈ کی ایک دوکان میں کوفی پیتے ہوئے ایک دوسرے کو اپنے اپنے حالات سنا دیے تھے۔ میری مشکل سن کر روفہ نے فوراً مجھے اپنے کمرے میں رہنے کی پیش کش کر دی جو میں نے اس شرط پر قبول کر لی کہ جونہی کوئی کمرہ مل گیا میں شفٹ کر لوں گی۔ لیکن اس کی اس فراخ دلی نے مجھے بہت متاثر کیا تھا۔ میرے ادبی رجحان اور سنجیدہ طبیعت کی وجہ سے وہ مجھ پر جذباتی اور نفسیاتی انحصار کرنے لگی اور ایک طرح سے مجھے مشیر کا سا درجہ دے دیا تھا۔ اپنی ہر بات وہ مجھے بتانے لگی اور میں اس کی بہت سی باتوں کو خلاف طبع سمجھنے کے باوجود اختلاف نہ کرنے پر مجبور تھی۔ کیونکہ یہ کوئی معمولی بات نہ تھی کہ اس نے مجھے اپنے کمرے میں جگہ

دے رکھی تھی۔

میرے سامنے روفہ کھلی کتاب تھی۔ محاورتاً نہیں بلکہ حقیقتاً! وہ کمرے میں عموماً نیم برہنہ گھومتی رہتی۔ اپنے جسم اور چہرے پر وہ اس قدر محنت کرتی تھی کہ بعض اوقات کوفت کے ساتھ ساتھ مجھے ترس آنے لگتا۔ جب وہ گھنٹوں تیاری کے بعد مجھ سے پوچھتی "کیسی لگ رہی ہوں" تو میں شہادت کی انگلی اور انگوٹھے کو ملا کر "اے ون" کا اشارہ دکھاتی لیکن دل ہی دل میں سوچتی کہ پتہ نہیں کیوں بجائے کم سن اور حسین نظر آنے کے یہ محض ایک کرخت صورت فلم ایکٹرس نظر آ رہی ہے۔ لیکن میں اس کی تعریف کرنے پر مجبور تھی اور وہ اس تعریف پر ذرا بھی شبہ نہ کرتی اور آئینے میں ہر رخ اور ہر زاویے سے خود کو خوش ہو کر دیکھتی اور اکثر اپنے پسندیدہ جملے دہراتی۔

"ہم جو ہیں نا ہم۔۔۔ ہماری عمر کی عورتیں۔۔۔ کیا بات ہے ہماری۔۔۔ کیا مقابلہ کر سکتی ہیں ہمارا یہ کل کی ٹین ایجر پھلجڑیاں۔ یہ کالجوں سے نکلی ہوئی چھٹنکیاں۔۔۔ ہماری میچوریٹی۔۔۔ ہمارا کمپوژر (Composure)۔۔۔ وی آر دی کوئینز مائی ڈیر۔۔۔ وی آر دی کوئنز۔۔۔ اور تمہیں بتا دوں۔ یہ مرد اور ینگ لڑکے ہماری عمر کی عورتوں سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ وے آر جسٹ فیسی نیٹڈ!۔۔۔ ہماری عمر کی جو عورتیں ہوتی ہیں نا۔۔۔ کیا چیز ہیں ہمارے سامنے یہ چوزیاں یہ بچونگڑیاں۔۔۔ ہاہ!"

"بچونگڑیاں" واقعی روفہ کے سامنے کیا چیز ہوں گی۔ کیونکہ اس سلسلے میں جو ہوم ورک روفہ کا تھا وہ ہر کسی کے بس کا روگ نہیں۔

اس کے کمرے میں منتقل ہونے کے اگلے روز ہی مجھ پر یہ بات عیاں ہوگئی۔ پہلی صبح ہی میری آنکھ عجیب عجیب آوازوں کے ساتھ کھل گئی۔۔۔ سرسراہٹ اور تیز تیز سانسوں کی آواز۔۔۔ ابھی پوری طرح روشنی نہیں پھیلی تھی۔ تقریباً اندھیرا تھا۔ اس دھندلکے میں مجھے کمرے میں کوئی چیز تیزی سے اوپر نیچے ہلتی دکھائی دی۔۔۔ غور سے دیکھا تو روفہ ڈمبل اٹھائے اٹھک بیٹھک کر رہی تھی۔ اس نے سیاہ لیوٹارڈ پہن رکھا تھا۔ کھڑکی سے آتی ہوئی ہلکی روشنی میں اس کا سفید جسم دمک رہا تھا۔ مجھے سر اٹھائے دیکھ کر اس نے بدستور حرکت کرتے پھولے ہوئے سانسوں کے درمیان پوچھا۔

"کیسا ہے میرا فگر" کھڑکی کی بیک گراؤنڈ میں اس کے جسم کے خطوط ترشے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ "بالکل مری کی سڑک" میں نے اپنی دانست میں خاصا بھونڈا اور عامیانہ سا فقرہ کہا۔ لیکن وہ بہت خوش ہوئی۔ اس نے ڈمبل زمین پر رکھ دیے اور اپنے کولہوں پر ہاتھ پونچھتے ہوئے کہنے لگی۔ "دیکھ لینا۔ تم ایک دن بہت کامیاب ادیبہ ہوگی۔۔۔ دیکھ لینا۔ دس از مائی پریڈکشن۔"

روفہ کی زندگی میں کئی مرد آئے اور اس نے ہر دفعہ بڑے خلوص سے محبت کی۔ وہ "افضیر بدانے افضیر" کی قائل نہ تھی۔ عشق و محبت اس کے نزدیک نہایت اعلیٰ و ارفع چیز تھی جس میں افلاطونی اور جسمانی محبت کا ایک خوبصورت توازن اور آہنگ ضروری تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر محبت صرف جسمانی ہو تو یہ محبت نہیں بلکہ نری حیوانیت ہوتی ہے۔ بقول اس کے کتے اور انسان میں کچھ تو فرق ہونا چاہیے اور اگر صرف افلاطونی ہو تو ---- پھر مرد بہت جلد گھبرا کر بھاگ جاتے ہیں۔

لہٰذا وہ دونوں برابر گھول کر پلا دیتی تھی۔ اگر کوئی تب بھی بھاگ جاتا تو وہ دل میں کوئی کینہ نہ رکھتی۔ بلکہ جانے والے کو ہمیشہ اچھے لفظوں میں یاد رکھتی تھی۔

آج وہ کسی سے ملنے جا رہی تھی۔ لڑکا تازہ تازہ یونیورسٹی سے نکلا تھا اور عمر میں اس سے کافی چھوٹا تھا۔ لیکن روفہ کا خیال تھا کہ وہ اسے اپنی ہم عمر سمجھتا ہے۔ روفہ نے ہنستے ہوئے بتایا کہ بڑا چالاک ہے۔ کسی انٹرنیشنل ایجنسی میں نوکری دلانے کے بہانے آمدنی کا رونا رو رہا تھا۔ بڑی مشکل سے ٹالا۔ روفہ کا خیال تھا کہ سالے نے سارا چکر صحیح عمر جاننے کے لیے چلایا۔

صبح سے بلکہ منہ اندھیرے سے وہ تیاریوں میں لگی تھی۔ بلکہ میرے حساب وہ تیاریوں کے اذیت ناک مراحل سے گزر رہی تھی۔ آخر وہ خود بھی بول اٹھی۔

"اف کس قدر نعمتیں ہم نے ان کے لیے۔ کتنی تکلیف اٹھاتی ہیں ---- اب بتاؤ یہ تھریڈنگ نورچیں تو کیا ہے" وہ اپنی پیشانی پر تھریڈنگ کرتے ہوئے بولی "پھر ویکسنگ ---- فیشل اور بلیک ہیڈ ریموونگ ---- ہیئر ڈریسنگ مینی کیور پیڈی کیور ---- واٹ نور چرز ---- بٹ واٹ پلیژرز! ---- یہ تھینک لیس مرد تو سوچ بھی نہیں سکتے ہوں گے کہ ---- خود تو بس شیو کرلیا۔ نہالیا زیادہ سے زیادہ آفٹر شیو یا ڈیوڈرنٹ لگالیا ---- باؤان فیئر ---- لیکن خیر کیا ہوسکتا ہے ---- ادھر آؤ تو ---- ذرا ڈریس چننے میں تو مدد کر دو ---- ڈارک بلیو بہت پیارا ہے لیکن فرنٹ او پننگ ہے۔ تو پہلی ڈیٹ میں میں کبھی رسک نہ لوں ---- یہ ریڈ ٹھیک ہوگا ---- تمہارا کیا خیال ہے وہ کوئی گڑبڑ تو نہیں کرے گا میرے ساتھ؟ ----" اس کے اس کبھی کبھار کے بھول پن کے پوز سے مجھے سخت کوفت ہوتی تھی۔ اسی لیے میں نے جل کر کہا۔

"میرے خیال میں تو تم خود اس کے ساتھ گڑبڑ کر دوگی۔"

"ہاہا ---- تھوڑی بہت گڑبڑ تو جائز بھی ہے ورنہ پھر کیا مزا ---- لیکن تھوڑی بہت ---- تیسری ڈیٹ سے پہلے تو ہرگز نہیں ---" اس نے ہنس کر شانوں سے گاؤن گراتے ہوئے کہا۔ میں نے منہ

کے ساتھ اخبار کر لیا۔ اس کے باتھ روم میں گھس کر دروازہ بند کرنے کی آواز آئی۔ اسی وقت ازبتھ عرف "لسبتھ" دروازے میں نمودار ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹی سی پلاسٹک کی تھیلی تھی۔ وہ سیدھی باتھ روم کی طرف چلی۔

"یہ کیا ہے؟"

"برف اے باجی لئی"

"برف باتھ روم میں؟"

"باجی ہور ی سیکا کر دے نیں۔"

"سیکا برف کا؟ کہاں ۔۔۔۔ کیسے؟"

"خورے" اس نے اپنے پلے پلے شانے اچکائے اور باتھ روم کی طرف چل دی۔

"لو باجی اپنی چیز" اس نے کہا۔ دروازہ تھوڑا سا کھلا اور روف نے تھیلی وصول کر لی اور لسبتھ روف کے دیے ہوئے بسنتی امبریلا کٹ لباس میں اپنا دافر بدن جھلاتی کمرے سے نکل گئی۔

تھوڑی دیر میں دروازہ کھلا اور روف سیاہ لیس کے انڈر گارمنٹس میں نمودار ہوئی۔ میں نے حسب دستور کتاب پر نظریں گاڑ لیں۔ تھوڑی دیر تک کمرے میں کپڑوں کی سرسراہٹ کی آوازیں آتی رہیں۔ پھر سپرے کی آواز آئی اور کمرہ تیز خوشبو سے بھر گیا ۔۔۔۔۔۔ "کنسیلر کدھر مر گیا" اس کی تیز آواز آئی۔

اس کمپل ذلیل کو بھی آج ہی نکلنا تھا" وہ ڈریسنگ ٹیبل پر لگی ہوئی بوتلوں' شیشیوں' ڈبیوں' برشوں' رولرز' پفوں کی ڈھیری میں کنسیلر ڈھونڈ رہی تھی۔ کمرے کی ہوا طرح طرح کی بوؤں اور خوشبوؤں کی وجہ سے کثیف ہو رہی تھی۔ پہلے ویکس کی بو حاوی تھی پھر کوسمیٹکس اور آخر میں پرفیوم کی تیز بو ۔۔۔۔ سانس لینا دشوار ہو رہا تھا۔ جوں جوں دن چڑھ رہا تھا گرمی بڑھ رہی تھی۔ مجھ پر غنودگی سی طاری ہونے لگی۔ میں نے بند ہوتی ہوئی آنکھوں سے روف کو دیکھا۔ رنگوں کا جھماکا سا ہوا ۔۔۔۔۔ چیختے ہوئے سرخ رنگ کا لباس ۔۔۔۔ بلونڈ بال ۔۔۔۔ لپورنگ ہونٹ ۔۔۔۔ آتشی گلابی رخسار ۔۔۔۔۔۔

"کیسی لگ رہی ہوں؟" اس نے آئینے میں چہرہ گھماتے ہوئے پوچھا۔

"غضب!" میں نے منہ پر کتاب رکھتے کہا۔

شام کو میں اپنی ایک کولیگ کے گھر پارٹی پر مدعو تھی۔ آٹھ بجے وہاں سے فارغ ہو کر میں مارکیٹ چلی گئی۔ ضرورت کی کچھ چیزیں لیں۔ نو بجے کے قریب واپس پہنچی تو کمرہ خالی تھا۔ "عیش کر رہی ہے" میں نے سوچا۔ کوئی ساڑھے دس بجے کے قریب دھڑاک سے دروازہ کھلا اور روف جھومتی گنگناتی داخل ہوئی۔

آتے ہی اس نے اپنا سرخ لیدر کا پرس بستر پر پھینکا اور "اف" اور "ہائے ہائے" کہتی ہوئی پلنگ پر بیٹھ کر سینڈل کھولنے لگی۔ کچھ دیر تک وہ اپنے پاؤں کے انگوٹھے اور انگلیاں اوپر نیچے نچاتی رہی اور پھر آہستہ آہستہ سنا کنگز اتارنے لگی۔

"بڑا حرامزادہ نکلا" اس نے سنا کنگز کا گولا سا بنا کر سامنے ڈریسنگ ٹیبل پر پھینکا۔ اس کے ہونٹوں پر بھنچی بھنچی سی مسکراہٹ تھی۔۔۔۔۔

"بڑا کمینہ نکلا۔۔۔ مجھے کہا تھا پائینز چلیں گے۔۔۔ پھر کہنے لگا ابھی تو بہت دیر ہے۔ کہیں بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔ اس کے دوستوں نے کہیں کمرہ لے رکھا تھا۔ جب وہاں پہنچے تو سارے دوست کہیں گئے ہوئے تھے۔ خالی کمرہ تھا۔ میں پہلی ڈیٹ پر ہمیشہ خالی کمرہ اوائڈ کرتی ہوں پر۔۔۔ بدتمیز کہیں کا۔۔۔ ینگ لڑکوں کے ساتھ یہی مصیبت ہے۔۔۔ دے آر ٹو امپیشنٹ۔۔۔ اف اتنی بھوک لگ رہی ہے۔۔۔ تم نے تو کھا لیا ہوگا۔۔۔ ہیں؟"

"کیا مطلب ہے! کھلا کر بھی نہیں بھیجا؟"

"دن کو جو کھایا تھا۔۔۔ بہت شاندار لنچ تھا۔ ہم لوگ "چنگ ہوا" گئے تھے۔۔۔ بڑا مزا آیا۔ بائی چانس اس کے تین چار دوست بھی وہیں آ گئے۔ اس نے مجھے سب سے انٹروڈیوس کرایا۔ مجھے بہت اچھا لگا۔۔۔ دے ور سچ سویٹ بوائز۔۔۔ ہم نے دو سزلرز Sizzlers منگائے۔ پورنز اور تھائی سوپ بہت اچھا تھا وہاں کا۔ ڈٹ کر کھایا ساروں نے۔۔۔ آدھی تنخواہ تو نکل گئی میری۔ بٹ اٹ واز ورتھ اٹ"

"کیا مطلب؟ تم نے بل دیا!"

"اور کس نے دینا تھا؟ وہ بے چارہ اب اتنوں کو کہاں سے کھلا سکتا تھا۔ مجھے تو اس نے کھلانا تھا ہنڈرڈ پرسنٹ۔ لیکن اتنے سارے دوست جو آ گئے اچانک۔۔۔ وہ کیا کرتا بے چارہ۔ تقریباً سٹوڈنٹ سا ہی تو ہے۔۔۔ اور اس کے دوست سارے۔ کوئی یونیورسٹی میں ہے کوئی اسی سال نکلا ہے۔ ٹھیک ہے جاب کر رہا ہے وہ لیکن پھر بھی اتنا تو نہیں ہے اس کے پاس۔۔۔۔"

"بے چارہ۔۔۔ جبکہ تمہاری جاگیروں سے تو ہزاروں پاؤنڈز آ رہے ہیں"

"میں نے نہیں کبھی پرواہ کی ان چھوٹی چھوٹی باتوں کی۔۔۔ کیا فرق پڑتا ہے کہ اس نے کھلایا کہ اس نے کھلایا۔۔۔ ڈیئر آر آل پیٹی میٹرز۔ میں ان باتوں میں اپنا وقت نہیں ضائع کرتی۔۔۔ جہاں پیار ہو وہاں کیا فرق پڑتا ہے" اس نے جھٹکے سے کرسی کی پشت سے گاؤن اٹھایا۔

"تمہیں میری بات بری لگی؟"

"اونو۔۔۔۔" وہ گاؤن کرسی پر پھینک کر دوڑی آئی اور میرے گلے سے لگ گئی۔ "تم ہی تو میری ایک دوست ہو۔۔۔۔۔" میرے گلے کے گرد اس کی نرم نرم بانہوں کا لمس اتنا بے ضرر اور معصوم سا لگ رہا تھا کہ کچھ دیر کے لیے مجھے وہ ایسی ننھی سی بچی لگی جو ہجوم میں کہیں بھٹک گئی ہو۔۔۔۔ لیکن اگلے ہی لمحے مجھے خود کو جھنجوڑ کر یاد دلانا پڑا کہ یہ کوئی ننھی سی معصوم بچی نہیں بلکہ تقریباً سینتیس سال کی جہاندیدہ عورت ہے جو صرف چند گھنٹے پہلے مذہب اور سوسائٹی کی طرف سے عائد کردہ تمام حدود بڑی دیدہ دلیری کے ساتھ توڑ کر آئی ہے۔۔۔ میں نے غیر محسوس طور سے خود کو چھڑا لیا اور وہ گاؤن سنبھالتی باتھ روم میں چلی گئی۔

ان دنوں پاکستان میں ایک اصطلاح "نظام مصطفیٰ" کا بہت چرچا تھا اور اس کے ہاتھوں روف بہت نالاں تھی۔ اس کے نزدیک نظام مصطفیٰ کا مطلب کوڑے تھا۔ وہ کمرے میں ٹہل ٹہل کر اس "وحشی" نظام کے خلاف بولتی' جس کی وجہ سے پاکستان اب کسی صورت کسی مہذب اور تعلیم یافتہ انسان کے رہنے کے قابل نہ رہا تھا۔ لگتا تھا کسی لمحے بھی کوڑے کسی کونے کھدرے سے کڑکتے ہوئے نکلیں گے اور اس کی پشت کی نرم و نازک کھال کو ادھیڑتے ہوئے نکل جائیں گے۔ بلکہ اس نے ایک آدھ بار مجھ سے پوچھا بھی کہ کوڑا کتنی زور سے لگتا ہے میں اسے صحیح طور پر نہیں بتا سکی۔ البتہ میں نے اسے یہ بتا دیا کہ ایک وریئیشن سنگسار بھی ہے جس میں پتھر وغیرہ کھانے پڑتے ہیں۔ وہ کافی دیر تک غور کرتی رہی کہ دونوں میں کون سا طریقہ زیادہ "کمفرٹیبل" ہے۔ آخر جھنجلا کر اس گندی سوسائٹی اور اس ملک پر برس پڑی جہاں انسان کو ہر وقت اپنی کھال کی ہی فکر پڑی رہے اور وہ بھی "انوسنٹ پلیورز" (Innocent Pleasures) کی خاطر "نیو یارک" ناسکو کہیں بھی پیدا ہو جاتی۔" وہ حسرت سے کہتی۔ دو ایک ملکوں کی یونیورسٹیوں میں داخلے کے لیے اس نے اپلائی بھی کر دیا تھا۔۔۔ "بس ایک دفعہ۔۔۔۔ ایک دفعہ بس نکل جاؤں اس ملک سے پھر خدا کی قسم کبھی رخ نہ کروں ادھر کا۔" اب وہ بوائے فرینڈ سے ملنے کے بعد ہوسٹل کے گیٹ کے بجائے کمرشل مارکیٹ میں اتر جاتی تھی۔ اس نے بتایا کہ پچھلی دفعہ جب وہ گیٹ پر اتری تو پٹھان چوکیدار نے اتنی عجیب نظروں سے اسے گھورا کہ اسے جھرجھری سی آگئی اور اسے یقین ہو گیا کہ یہ کہیں سے جا کر نظام مصطفیٰ والوں کو پکڑ لائے گا۔ مارے ڈر کے اسے آدھی رات تک نیند نہ آئی۔

وہ اس لڑکے جیجی سے ہفتے میں ایک بار ملتی تھی جو کہ بقول اس کے "ڈیسنٹ گیپ" تھا۔ ہر ملاقات کے بعد وہ اس انداز سے اس کے حسن کا تذکرہ کرتی جیسے لولی پوپ چوس رہی ہو۔ اس کی رنگت' اس کے بھورے بال' اس کی بلوں جیسی آنکھیں' اس کا پھرتیلا جسم۔۔۔ میں نے اس سے کہا یہ آدمی کا ذکر ہے کہ بلی کا۔۔۔۔۔ لیکن وہ مصر تھی کہ جیجی بہت ہی "مینلی" (Manly) ہے۔

ایک دن وہ اس سے مل کر آئی تو کچھ چپ چپ سی تھی۔۔۔۔سوچوں میں گم۔ حالانکہ اپنے ہر راندے وو (Rendezvous) کے بعد بڑے جوش کے ساتھ ایک ایک تفصیل بتانا اس کا معمول تھا اور مبالغے کی حد تک بھرپور دلچسپی کے ساتھ سننا اب میری عادت بن چکی تھی۔

"کیا ہوا۔۔۔لڑائی وڑائی ہوگئی؟" میں نے پوچھا۔

"اونو۔۔۔ہم تو اتنے کلوز ہو گئے ہیں۔ اتنے کہ مجھے تو ڈر لگتا ہے کہ اگر کچھ ہوگیا تو کیا ہوگا۔ اس کا تو یہ حال ہے کہ کہہ رہا تھا کہ میری تو زندگی کی سب سے بڑی خواہش ہے کہ کسی دن رات بھر تمہیں پاس رکھوں۔ پر کمرے میں اس کے دوست سوتے ہیں اور ہوٹلوں میں جاتے ویسے ہی آج کل ڈر لگتا ہے۔ کہہ رہا تھا تمہیں میں اپنی بہن سے ملواؤں گا۔ میرے خیال میں تو وہ پروپوز کرنے کا سوچ رہا ہے۔" پھر وہ چپ ہوگئی۔

"چپ چپ کیوں ہو" میں نے پوچھا۔ وہ کچھ دیر سوچتی رہی۔ پھر بولی۔

"۔۔۔آج جب ہم واپس آرہے تھے تو وہ گاڑی کو پٹرول پمپ میں لے گیا۔ کہنے لگا یہ اچھی بات نہیں کہ کسی کی گاڑی بھی مانگو اور پٹرول بھی اس کا خرچ کرو۔ اف یو ڈونٹ مائنڈ۔۔۔ میں نے دو سو کا پٹرول ڈلوا دیا۔ میں بھی ایسی گدھی پہلے پوری ٹینکی بھروانے لگی تھی۔ پھر عقل آ گئی۔۔۔۔۔"

"شاباش! بہت اچھا کیا۔ اچھی محبوبائیں ایسا ہی کرتی ہیں۔۔۔ میں طنز نہیں کر رہی۔ ایمان سے" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"تمہارے خیال میں۔۔۔یہ ٹھیک ہوا؟۔۔۔۔"

"تم نے خود کہا تھا جہاں پیار ہو وہاں چھوٹی چھوٹی باتوں کی اہمیت نہیں ہوتی۔"

"لیکن ابھی بات ختم نہیں ہوئی نا۔۔۔ جب میں مارکیٹ میں گاڑی سے اتر رہی تھی تو اس نے کہا کہ کل اس کے ابا ہوسپٹل سے ڈسچارج ہو رہے ہیں۔ پانچ سو روپوں کی سخت ضرورت ہے۔۔۔ اب تم بتاؤ۔۔۔ میرے پاس کل ہزار روپے تھے۔ آج بائیس تاریخ ہے۔ دو سو کا پٹرول ڈلوا دیا۔ پانچ سو کل اس کو دے دوں۔ خود کیا کروں گی باقی دن۔"

"نہ دو۔"

"اچھا نہیں لگتا۔"

"دے دو۔"

"دے دوں؟۔۔۔اور خود۔۔۔۔"

"کسی پیڑ کے نیچے بیٹھ کر اس کے پیار کے دوہے گاؤ۔"

"مذاق سے ہٹ کر۔۔۔دراصل۔۔۔اب ہوسپٹل کا معاملہ ہے نا۔۔۔اون ہیومن گراؤنڈز۔۔۔ویسے میرے اکاؤنٹ میں تو ہیں کچھ پیسے۔۔۔اینڈ آئی لو ہم۔۔۔۔"

میں نے کروٹ بدل کر دیوار کی طرف منہ پھیر لیا۔

میرا خیال تھا روفہ کا یہ "افیئر" بھی پہلے قصوں کی طرح چند دن کا کھیل ہے۔ لیکن بقول روفہ کے وہ اور پنکی دن بدن اور قریب ہوتے جا رہے تھے۔ وہ اسے روپے اور تحفے دے کر خوش ہوتی تھی' جبکہ وہ روفہ سے ہر طرح سے خوش تھا۔ وہ جب بھی اپنے شہر جہلم سے ہو کر آتا روفہ کو بتاتا کہ اس کے لیے کتنے رشتے آ رہے ہیں اور اس کی امی اس پر ہاں کرنے کے لیے دباؤ ڈال رہی ہیں۔ لیکن وہ روفہ کی وجہ سے انہیں رد کر رہا ہے۔ اس نے تقریباً روفہ کو پروپوز کر دیا تھا۔ بس بہن سے ملوانے کی دیر تھی۔

میں نے ایک آدھ دفعہ اس کو سمجھانے کی کوشش بھی کی کہ جب وہ ابھی مشکل سے پینتیس کا ہوگا تو تم پچاس سے بھی اوپر ہو گی' پھر کیا ہوگا۔۔۔ لیکن روفہ نے میری طرف یوں دیکھا جیسے میں نے کوئی تیسرے درجے کی احمقانہ بات کہہ دی ہے اور جیسے اسے میری ناتجربہ کاری پر ترس آ رہا ہے۔ اس نے میری بات کے جواب میں ہنس کر صرف اتنا کہنا کافی سمجھا کہ "تب کا تب دیکھا جائے گا!"

چند دنوں کے بعد پرویز عرف پنکی کی سالگرہ آ رہی تھی اور روفہ تحفے کے سلسلے میں مجھ سے مشورے کر رہی تھی۔۔۔ جو کہ بعد میں جھوٹ موٹ کے مشورے ثابت ہوئے۔ میرے مشورے جو کہ کف لنکس' پرفیوم' ٹائی یا شرٹ وغیرہ تحفے سن لینے کے بعد اس نے ذرا سا ہچکچاتے ہوئے بتایا کہ دراصل اس نے تو خود ہی اپنی چیز بتا دی ہے۔ وہ کہتا کہ اس کے سارے دوستوں کے پاس سونے کی چین ہے۔ کاش اسے بھی کوئی دیتا۔ بقول روفہ کے صاف طور پر تو اس نے نہیں کہا لیکن اس بات کا کیا مطلب ہو سکتا ہے' وہ مجھ سے پوچھنے لگی۔

"مطلب یہ ہے کہ پرسوں اس کی سالگرہ پر آپ اس کے گلے میں سونے کی چین پہنائیں۔۔۔اور ذرا بھاری والی۔ ہلکی سے شاید وہ خوش نہ ہو۔ ویسے بھی اس کا دل توڑنا تم افورڈ نہیں کر سکتی' جب کہ چین تم افورڈ کر سکتی ہو۔"

"افورڈ؟ میرے اکاؤنٹ میں تو بالکل تھوڑے سے پیسے ہیں۔۔۔۔۔افورڈ! انسٹالمنٹ بھی تو دینا ہے پلاٹ کا۔"

"ایسا کرو پلاٹ کینسل کرا دو۔"

"اف! طنز۔۔۔خیر کوئی بات نہیں آئی ایم یوزڈ ٹو اٹ۔۔۔۔۔ویسے میں کر بھی کیا سکتی ہوں۔ ہمارے افیئر کے بعد پکی پر تھوڑے آ رہی ہے اس کی۔"

"پہلی برتھ ڈے!۔۔۔ تمہاری بھی تو آئی تھی پچھلے مہینے۔"

"میں نے نہیں بتایا اس کو۔۔۔ خوامخواہ انسان چیپ سا لگتا ہے۔۔۔ میں نے ہمیشہ اپنی سیلف ریسپیکٹ کا خیال رکھا ہے۔۔۔ اس لیے تو وہ کہتا ہے کہ یو آر وی اونلی گرل جس کی میں عزت کرتا ہوں۔ ویسے ایک بات تو بتاؤ۔۔۔ تمہارا اس کے بارے میں کیا خیال ہے۔ سچ سچ بتانا۔۔۔۔ اب جبکہ وہ پروپوز کرنے والا ہے اور ہمارا شادی کا بھی خیال ہے تو۔۔۔ ٹھیک سے رائے دینا۔ دیکھو جھوٹ نہیں بولنا۔"

"میرا تو خیال ہے کہ تمہارا یہ پرویز عرف پنجی پکا پاجی ہے اور بھیجا بھی نہیں اس کے سر میں۔"

"بھیجا؟ بھیجے کو چاٹنا ہے؟۔۔۔۔ کیا کرنا ہے بھیجے کا۔ میرے ایکس ہزبینڈ کا تھا بہت بھیجا۔۔۔۔ دیٹ پگ اوف این انٹیلکچوئل (That Pig of an intellectual)۔۔۔ میرے کس کام آیا۔۔۔ کم اون کوئی دوسری بات کرو۔"

"اور میرے خیال میں تو وہ۔۔۔۔ وہ ہے۔"

"وہ کیا؟"

"وہی"

"کیا وہی"

"ڑگولو ٹائپ؟"

"ڑگولو کیا؟"

"مرد طوائف۔"

"مرد طوائف۔"

"چلو میل پروسٹی چیوٹ کہہ لو۔"

وہ اچھل کر سیدھی بیٹھ گئی۔ یوں لگا جیسے وہ بہت کچھ کہے گی۔۔۔۔ میں بھی تن کر بیٹھ گئی اور بہت کچھ سننے کو تیار ہو گئی۔ لیکن وہ "یو آر نوٹ فیر" کہہ کر باتھ روم چلی گئی۔

جمعہ کو برتھ ڈے تھی۔ وہ جمعرات کی صبح سے سخت مصروف تھی۔ اسے بنک جانا تھا اور سونے کی چین کے لیے رقم نکلوانی تھی۔ شام کو وہ زبردستی مجھے اپنے ساتھ لے گئی۔ ہم مختلف جیولرز کی دکانوں میں گھومتے رہے۔ میں اس کام میں ملوث نہیں ہونا چاہتی تھی لیکن۔۔۔۔ آخر ایک مناسب چین نظر آ گئی۔ اس کی قیمت اتنی نہ تھی جتنی بھاری وہ نظر آ رہی تھی۔ روفی کو اس کے ساتھ ملنے والی ذرا سی ڈبیہ پسند نہیں آ رہی تھی۔ آخر جیولر نے سرخ مخمل کا ایک نفیس اور نسبتاً بڑا سا ڈبہ اندر سے نکال کر دکھایا اور روفی مطمئن ہو گئی۔ وہاں

سے وہ سیدھی سٹیشنری کی دکان پر گفٹ پیپر لینے کے لیے گئی۔ اسے کوئی کاغذ ہی پسند نہیں آرہا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ گفٹ پیپر میں بھی کوئی بات ہو، کوئی اشارہ ہو۔ آخر چمکیلے سرخ رنگ پر سنہرے دلوں والا ایک کاغذ اس نے چنا اور اوپر سے لگانے کے لیے سنہری سجاوٹی پھول خریدا۔ کمرے میں آ کر اس نے بڑی محنت سے چین کا ڈبہ پیک کیا اور ڈریسنگ ٹیبل کے وسط میں رکھ دیا اور آتے جاتے وہ بار بار اس پیکٹ کو نظروں سے چومتی اور سہلاتی رہی۔ "کیسی خوبصورت پیکنگ ہوئی ہے۔" اس نے کئی بار کہا۔

روزِ جمعہ کی صبح سے تیاریوں کے مختلف مراحل سے گزر رہی تھی۔ شام کو برتھ ڈے تھی۔ اس نے بیوٹی پارلر جا کر تیار ہونے پر بھی غور کیا لیکن پھر یہ سوچ کر خیال رد کر دیا کہ وہ کہیں کچھ گڑبڑ نہ کر دیں اور ایسا نہ ہو کہ جو وہ نظر آنا چاہتی تھی ویسی نظر نہ آ سکے۔ لہٰذا صبح سے وہ اپنے حلیے پر خود ہی تجربے کر رہی تھی۔ اس نے اس موقع کے لیے خاص لباس خریدا تھا۔ سیاہ سلک کے لباس کے گلے اور آستینوں پر سیاہ فرانسیسی لیس لگی ہوئی تھی جس پر ننھے ننھے سلور ستارے دمک رہے تھے۔ ہیرے کے سیٹ کے مطابق ڈیزائن کردہ نقلی سیٹ اس کے کانوں اور گلے کے گرد جگمگا رہا تھا۔ سلور میٹلیک پرس کندھے سے لٹکانے کے بعد اس نے پوچھا۔

"کیسی لگ رہی ہوں؟"

"شاندار! گلیمرس" اس نے خوش ہو کر اپنی سلور پنسل ہیل پر گھوم کر ایک چکر کاٹا۔ ویسے میرے حسابوں پرویز عرف جیجی جس کے لیے کپڑے رستے کی رکاوٹ کے علاوہ کیا مفہوم رکھتے ہوں گے کوئی ایسی شے نہیں تھا جس کے لیے پہلے درجے کی فرانسیسی موڈل نظر آنے کی سعی کی جاتی۔ اس لحاظ سے وہ اوور نظر آ رہی تھی۔۔۔۔ قابلِ رحم حد تک اوور۔

چھٹی والے دنوں میں ہوسٹل میں واپسی کے قواعد میں اتنی سختی نہیں تھی لیکن مجھے جلدی لوٹ آنے کی عادت تھی۔ آج مجھے لاشعوری طور پر روزِ کی واپسی کا انتظار تھا۔ شاید کھد بدی لگی تھی کہ سونے کی چین، سالگرہ، ستاروں والا لباس۔۔۔۔ سب کا کیا بنا۔ سونے کی تیاری کرتے ہوئے میرے کان کوریڈور میں اس کی باریک ہیل کی مخصوص ٹک ٹک پر لگے ہوئے تھے۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ ساڑھے دس سے پہلے نہیں آئے گی۔ لیکن پونے نو بجے کے قریب کوریڈور میں اس کے آنے کی مخصوص آواز سنائی دی۔ "عیش کرو بھئی عیش کرو" میں نے سوچا۔ اسی وقت دروازہ چرچرا کر کھلا اور وہ اپنے ستاروں والے لباس، جگمگاتی جیولری اور سلور میٹلیک پرس سمیت دروازے میں نمودار ہوئی۔ اس ایک لمحے میں وہ مجھے ایسی عمارت کی طرح دکھائی دی جسے بلڈوزروں نے تہس نہس کر دیا ہو۔ دروازہ بند کر کے پلٹی تو۔۔۔۔ شاید کاسمیٹکس کی تہہ دن بھر میں کہیں ہوا میں تحلیل ہو گئی تھی۔ یا شاید چہرے کے مساموں نے جذب کر لی تھی۔ گہرے سلیٹی حلقوں کے اوپر اس کی

آنکھیں بے جان تھیں۔ رخسار یوں سوجے ہوئے اور تمتمائے ہوئے تھے جیسے پیشن اون کا کرشمہ نہیں بلکہ کسی نے کس کس کر چانٹے مارے ہوں۔

"کیا ہوا؟" میں بستر پر سیدھی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ وہ خاموش رہی اور میری طرف دیکھ کر "کچھ نہیں" کے انداز میں یوں سر ہلایا جیسے اس کی زبان بولنے کی صلاحیت کھو بیٹھی تھی۔ پھر اس نے آہستگی سے اپنا سلور میٹیلک پرس جس پر مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس کی تقریباً آدھے ماہ کی تنخواہ خرچ آئی تھی یوں ڈریسنگ ٹیبل پر ڈال دیا جیسے ہر بات کا ذمہ دار وہی تھا۔ کرسی پر سے اپنا گاؤن اٹھا کر وہ باتھ روم میں چلی گئی۔ باتھ روم سے چہرے پر پانی کے چھپاکے مارنے کی آوازیں آنے لگیں۔ تھوڑی دیر میں وہ باہر نکلی تو اس نے گاؤن پہن رکھا تھا اور اپنا سیاہ سلک کا فرانسیسی لیس والا لباس یوں چٹکیوں میں تھام رکھا تھا جیسے بہت سے مرے ہوئے چوہوں کو دموں سے لٹکا رکھا ہے۔ پھر کھلی ہوئی الماری میں اسے یوں پھینک دیا جیسے کوڑے کے ڈرم کے حوالے کر رہی ہو۔ پھر وہ کمرے کے وسط میں آ کر کرسی کے سہارے بت کی طرح کھڑی ہو گئی اور میکانکی انداز سے چھوٹے سے گلابی تولیے سے چہرے کو تھپتھپانے لگی۔

"خدا کے لیے کچھ بولو روزنہ لاٹش کی طرح تو نہ کھڑی رہو۔"

اس نے تولیہ کرسی پر پھینکا اور آ کر پلنگ پر بیٹھ گئی۔ کھوئے کھوئے انداز میں اس نے اپنے سلور سینڈل اتارے اور اپنی پنڈلیوں پر سے پھولدار سیاہ لیس کے سٹوکنگز آہستہ آہستہ رول کرتے ہوئے بولی۔

"اتنی انسلٹ ہوئی میری۔۔۔ اتنی بے عزتی۔۔۔" اس کا گلا رندھ گیا اور سسکیاں دبانے کے لیے اس نے اپنا چہرہ کہنی کے خم میں چھپا لیا۔

"گینگ ریپ" بم کی طرح یہ لفظ پھٹا اور دھماکے سے ہر چیز اڑ گئی۔۔۔ کم بخت لڑکی۔۔۔۔۔ بدبخت لڑکی۔۔۔ آخر تو یہ ہونا ہی تھا ایک دن۔۔۔۔۔ اس نے ٹشو پیپر سے ناک صاف کی۔ آنکھوں کو تھپتھپایا۔ کھانس کر گلا صاف کیا۔ پھر جب وہ بولی تو وہ اس کی نورمل آواز تھی۔

"آج جب ہم۔۔۔ شام تک تو ہم دونوں کمرے میں اکیلے تھے۔۔۔ پھر کوئی پانچ بجے اس کے دوست آ گئے۔ چاروں۔۔۔ ایک نے کیک کا ڈبا اٹھایا ہوا تھا۔۔۔ ایک پاؤنڈ کا تھا ابھرا ہوا کریم سے۔۔۔ پلیٹ تک تو تھی نہیں۔ نیچے دری بچھا کر ڈبہ بیچ میں رکھ دیا۔ پھر چھری نہیں مل رہی تھی۔ پھر ایک چمچ مل گئی اس کی ڈنڈی سے کیک کاٹا جانا تھا۔ پھر موم بتی نہ ملے آخر مل گئی ایک گندی سی۔ ٹین کے ڈھکنے پر چپکی ہوئی۔۔۔ خیر کیک کاٹا اس نے۔۔۔ سب نے خوب شور مچایا ہیپی برتھ ڈے کا۔ اس نے کیک کا ٹکڑا توڑ کر زبردستی میرے منہ میں ٹھونس دیا۔ وچ آئی ڈڈنٹ لائک (Which I Didn't like) ٹشو پیپر سے منہ

پوچھا پڑا۔ پھر میں نے چین کا ڈبہ نکالا۔ وچ سیمڈ ٹو کوز کویٹ اے سینسیشن ۔۔۔۔ انہوں نے خوب تالیاں بجائیں۔ کہنے لگے خود پہنائیں۔ میں نے اس کے گلے میں چین پہنا دی۔ جب میں پہنا رہی تھی تو اس نے میری رسٹ پر کس کر دیا۔ پھر سب کیک کھانے لگے۔ میں نے چمچے کی ڈنڈی سے سب کو پیس کر کر کے دیے ۔۔۔ میری انگلیاں کریم سے لتھڑ گئیں۔ میں دھونے کے لیے باتھ روم میں چلی گئی ۔۔۔ نکا چلایا ۔۔۔ شاید ان کا خیال ہو گا کہ کہ نکلنے کے شور میں آواز نہیں آئے گی۔ اس کا ایک دوست بولا' بڑی زور دار چین ماری ہے یار' پھر پتہ نہیں کسی نے کیا کہا' وہ مجھے سمجھ نہیں آیا۔ ہاتھوں پر ہاتھ مار کے ہنسنے کی آواز آئی۔ پھر اس ذلیل ہیجی کی آواز آئی۔ اس کا خیال تھا باتھ روم تک آواز نہیں پہنچے گی۔ لیکن پہنچ گئی۔ وہ بولا ''آنٹیوں کا یہی تو ایک فائدہ ہے۔'' پھر سب کمینوں کے ہنسنے کی آواز آئی۔ پھر ایک اور سئور کی آواز آئی'' ویسے یار! آنٹی ہے بڑی ٹیٹ'' ۔۔۔ ٹائٹ کوئیٹ کہہ رہا تھا ذلیل ۔۔۔۔۔ پھر سارے ہنسنے لگے ۔۔۔ میرے تو جیسے کسی نے منہ پر چپیڑیں ماردیں ۔۔۔۔ خواہ مخواہ ہاتھ دھوتی رہی۔ سمجھ نہیں آرہا تھا باہر کیسے نکلوں۔ ایسے ہی دو دفعہ فلش بھی چلا دیا۔ حالانکہ تمہیں پتہ ہے میں کبھی مردوں کی موجودگی میں ٹوئلٹ یوز نہیں کرتی۔ لیکن اس وقت کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا۔ میں زندگی میں کبھی اتنی ایمبر اسڈ (Embarrassed) نہیں ہوئی ۔۔۔ کیا اس دن کے لیے میں نے کاکا ڈیدار کا میو پڑھے تھے کہ ڈھائی پیسے کے یہ چھوکرے جو فائدہ کو فیدہ اور ٹائٹ کو ٹیٹ کہتے ہیں' دو ذلیل لفظوں میں مجھے سم اپ کر دیں ۔۔۔۔''

لیکن میری پیاری رؤف! میں نے بمشکل ہنسی ضبط کرتے ہوئے سوچا تم نے اس ہٹ کٹی لسبھ سے مالشیں اور ڈمبل تو اسی دن کے لیے اٹھائے تھے ۔۔ اور ہاں ۔۔ برف کے ٹکے ۔۔۔۔۔۔

''ذلیل' کمینہ سئور ۔۔۔۔۔ نفرت ہوگئی ہے مجھے اس کی کتے جیسی شکل سے ۔۔۔ لالچی ۔۔۔ فیدہ کا بچہ''

''اچھا ہوا جلدی کھل گیا ۔۔۔۔ ورنہ پتہ نہیں کب تک بیوقوف بناتا رہتا۔''

''لیکن ۔۔۔ لیکن میرا دل چاہتا ہے اسے بھی پتہ چلے کہ وہ ایکسپوز ہو گیا ہے ۔۔۔ جانتا نہیں وہ مجھے ۔۔۔ اب میری باری ہے ۔۔۔ میرا بھی نام رؤف ہے۔''

''کیا کرو گی؟ میں تو کہتی ہوں شکر کرو ۔۔۔۔ ورنہ قسم خدا کی میں نے تو سمجھا تھا خدانخواستہ گینگ ریپ وغیرہ ۔۔۔۔''

''گینگ ریپ شیپ کی تو خیر ہے ۔۔۔ وہ تو انسان ہینڈل کر لیتا ہے ۔۔۔ میں تو اب اس ذلیل کا منہ توڑنا چاہتی ہوں ۔۔۔۔ میں نے سوچا ہے اب کل جب اس کا فون آئے آفس میں تو میں کہوں گی

تمہاری آنٹی بول رہی ہوں۔۔۔ کیا خیال ہے؟ تھپیڑ پڑ جائے گی سور کے منہ پر۔۔۔۔"

بلب کی مدھم زرد سی روشنی میں اس کا چہرہ پھیکی پھیکی بے نام سی رنگت اختیار کر گیا تھا اور آنکھوں کے نیچے گہرے سلیٹی حلقے اس کے چہرے کو قبر کی طرح بھیانک بنا رہے تھے۔ روکھے مٹیالے ہونٹوں کے گوشوں میں سفید کف کا شائبہ سا تھا۔ میں نے منہ دوسری طرف کر لیا اور ٹیپ ریکارڈر آن کر دیا۔

"۔۔۔۔یا پھر ایسے کرتی ہوں۔۔۔۔۔ خدا کے لیے اس مصیبت کو تو بند کرو۔۔۔۔ میری جان نکل رہی ہے۔۔۔۔۔ اور ایک طریقہ ہے اس سور کو ذلیل کرنے کا۔۔۔۔ مجھ سے شرٹ مانگ رہا ہے۔۔۔۔۔ وائٹ گراؤنڈ پر پنک دھاریوں والی۔۔۔۔ اب تو میں پہنا کر چھوڑوں گی وائٹ گراؤنڈ پر پنک دھاریاں ذلیل کو۔۔۔۔ کل ہی چل کر شرٹ خریدتی ہوں۔ گفٹ پیکنگ کروں گی اور اندر کارڈ رکھ دوں گی" آنٹی کی طرف سے۔۔۔۔ "اور پھر کبھی حرامزادے کی شکل نہیں دیکھوں گی۔"

وہ اضطراب میں کبھی مٹھیاں بند کر رہی تھی کبھی کھول رہی تھی۔ میں نے دیکھا اس کی درمیان والی انگلی کا ناخن ٹوٹا ہوا تھا۔ ایسا شاذ ہوتا تھا۔ وہ تو ناخن ٹوٹنے کے ساتھ ہی کسی گم یا سکوچ ٹیپ سے جوڑ لیا کرتی تھی۔

"تمہارا ناخن؟۔۔۔۔"

"ہاں۔۔۔۔ گر گیا کہیں شاید۔۔۔۔ پان تو پھینکوں ذلیل کا۔"

وہ جھٹکے سے اٹھی اور ڈریسنگ ٹیبل پر رکھا ہوا سلور میٹیلک پرس کھول کر سنہری پتے میں لپٹا ہوا پان نکالا۔۔۔۔ "تھوکتی ہوں اس کے ذلیل پان پر۔۔۔۔ پان ہی رہ گئے ہیں میرے لیے" کہتی ہوئی کونے میں رکھی ہوئی پلاسٹک کی ٹوکری کے پاس گئی اور پوری طاقت کے ساتھ پان کو ٹوکری میں پھینک دیا۔

"اب سو جاؤ" میں نے سوئچ کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"سو جاؤں گی۔۔۔۔ سونا ہی ہے اب" وہ بستر پر چت گر گئی اور چھت کو گھورنے لگی۔ کمرے میں اندھیرا تھا لیکن کھڑکی میں سے سڑک کے کھمبے کی ہلکی ہلکی روشنی آ رہی تھی۔ کبھی کبھی سڑک سے گزرنے والی کسی کار کی بتیاں چھت اور دیواروں پر روشنی کا جادوئی سا کھیل رچا کر گزر جاتیں اور دیوار پر لگے ہوئے کلاک کا کوئی کونا یا ڈریسنگ ٹیبل کا شیشہ کچھ دیر کو چمک اٹھتا۔

رؤف کے بستر سے بار بار ناک صاف کرنے اور لمبے لمبے سانسوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ پھر اندھیرے میں اس کی بیٹھی ہوئی پھٹی پھٹی سی آواز ابھری۔

"وہ ذلیل آدمی۔۔۔۔ ذلیل سارے ہی ہیں۔۔۔۔ سارے مرد پکے سور ہیں۔۔۔۔ لیکن وہ اینگلو سٹیبلشمنٹ کی اولاد۔۔۔۔ لبرل کا بچہ۔۔۔۔ بڑا لبرل بنا پھرتا تھا۔۔۔۔ ویٹ بوژنگ

سوڈو مائزنگ سوائین۔۔۔۔مڈل کلاس مورلٹی۔۔۔سکرو بلز۔۔۔۔۔۔کتنی حقارت تھی اس کے دل میں۔۔۔سب کے لیے ایک ہی لفظ تھا اس کے پاس ''میڈیو کریٹی''۔۔۔۔ہی کڈ نوٹ سٹینڈ میڈیو کریٹی (He could not stand mediocrity) اور جب۔۔۔۔جب میری ذرا سی بات پتہ چل گئی۔۔۔تو۔۔۔۔تو ہی ری ایکٹڈ لائک آ لوئر مڈل کلاس پرچون والا۔۔۔۔دیٹ باسٹرڈ اوف دی تھرڈ ڈگری۔۔۔۔میں نے پوری کوشش کی تھی۔۔۔پوری کوشش۔۔۔۔۔۔اچھی ہاؤس وائف بننے کی۔۔۔۔اور کیسی ہوتی ہے اچھی ہاؤس وائف۔۔۔۔آئی کلکڈ۔۔۔۔آئی واشڈ ڈشز۔۔۔۔شٹ۔۔۔۔''

صبح ڈائننگ ہال میں ناشتہ کرنے کے بعد ہم اپنے اپنے کاغذات اور بیگ وغیرہ لینے واپس کمرے میں آئیں۔میں بیگ کندھے پر ڈال کر دروازے کی طرف بڑھ رہی تھی تو وہ بولی۔

''پانچ منٹ ہوں گے تمہارے پاس۔۔۔۔میں نے کوئی بات کرنی ہے۔''

ہم دونوں اپنے اپنے بستر پر آمنے سامنے بیٹھ گئیں۔

''میں رات بہت دیر تک سوچتی رہی۔۔رات بھی کیا چیز بنائی ہے اللہ نے۔۔۔اف ڈیئر از رئیلی ون۔۔۔میں نے بہت سارے فیکٹس جمع کیے ہیں۔۔۔فیکٹس۔۔۔۔لیں۔۔۔فیکٹس۔۔۔یہ فیکٹ ہے کہ آئی ایم اولموسٹ تھرٹی ایٹ (Almost Thirty eight) یہ فیکٹ ہے کہ وہ مجھ سے چھوٹا ہے۔۔کافی چھوٹا۔۔۔یہ فیکٹ ہے کہ اگر کل والے اپی سوڈ (Episode) کو نکال دیا جائے تو اور وائز ہماری ریلیشن شپ پرفیکٹ ہے۔۔۔اینڈ موسٹ سینس فائنگ نو۔۔۔۔یہ فیکٹ ہے کہ اگر آج ہمارا افیئر ختم ہو جاتا ہے تو اسے دس لڑکیاں مل جائیں گی۔۔۔لیکن میں۔۔۔میری زندگی میں کیا رہ جائے گا۔۔۔''

''وہ تمہارا ناخن؟۔۔۔۔'' مجھے اس کے پلنگ کی پٹی کے عین نیچے سلور پینٹ کیا ہوا نیم چاند کی شکل کا اس کا ناخن چمکتا ہوا نظر آ گیا۔

''اووف! شکر ہے۔۔۔۔۔مجھے تو رات سے اس کا غم لگا ہوا تھا۔۔۔۔۔۔تھینک گاڈ۔۔۔ذرا اٹھانا۔۔۔شکر ہے! آئی ایم سو ہیپی۔۔۔۔۔''

واجدہ تبسم

# روزی کا سوال

''اری او خصم کی رنڈی۔ وہ میرے پاس آ رہا تھا'' بھرے بھرے بدن والی بولی۔

''اری چل ری چل بھاڑ کھاؤنی' وہ میرے پاس آ رہا تھا۔''

''ہاں ہاں وہ تیرا باپ تھا نا اسی واسطے تیرے کو گود میں سلانے آ رہا تھا۔''

''اور نہیں تو وہ تیرا بچہ تھا نا تیری مانڈی پر لپٹ کر تیرا دودھ پینے آ رہا تھا۔''

ذرا ٹھہر تو چھنال گھوڑی تیرا منہ پیٹ تو چ ڈالی تو میرے کو بولنا پھر۔''

اور ان شاندار ڈائیلاگ کے ساتھ وہ چھینا جھپٹی ہوئی کہ اشرف کے ہوش ٹھکانے آ گئے۔ ایک کے بال دوسری کے ہاتھ میں تھے تو دوسری کے بلاؤز کے چیتھڑے پہلی والی کے ہاتھ میں جھول رہے تھے۔

پہلی والی ہانپ کر بولی۔ ''ٹھہر ذرا اسی سے پوچھ لے کہ وہ کس کے کنے آ رہا تھا''

دوسری لپک کر اشرف کے پاس آئی اور اس کا کالر پکڑ کر بولی۔

''بولو صاحب! تم کس کے پاس جانے والے تھے؟ میرے نا؟ یا اس کنٹی دو ٹکے کی چھنال کے؟''

اس کے انداز اس قدر جارحانہ تھے کہ اشرف جو آگے ہی باؤلا سا ہو رہا تھا۔ بالکل ہی ٹپٹا گیا۔

جی۔ جی۔ وہ۔ میں۔''

''ارے جی جی میں میں کیا لگا رہے جی۔ بکری کے بچے جیسی' میرا نام شالو ہے۔ وہ حرام کی جنی کتیا کی اولاد چنی ہے۔ بولو شالو کے واسطے آئے تھے یا چنی کے؟''

اشرف نے واقعی بکری کے میمنے کی طرح معصوم نگاہوں سے دونوں کی طرف باری باری دیکھا۔ زبان ساتھ چھوڑ گئی۔

''اب بولتا ہے کہ دیوں ایک رپاٹا''

شالو نے اشرف کو ایک طرف اتنی آسانی سے جھلا دیا کہ لمبا چوڑا مرد ہوتے بھی وہ ڈر کے دیک

سا گیا۔ یقیناً اس کے اندازے کے مطابق شالو ہی زیادہ طاقت ور اور قابض قسم کی تھی۔ اس لیے اس نے عافیت اسی میں سمجھی کہ وہ وہیں سے شالو کا دم لے دے۔

"جی میں دراصل آیا تو آپ ہی سے ملنے کے لیے تھا۔"

"ملنے کے لیے؟" شالو ایک حقارت آمیز قہقہہ لگا کر بولی۔ ملنے کے لیے؟ ارے صاحب! ملنے کے لیے تو ماں بہنوں سے جاتے ہیں۔ ہم کیا تم کو اپنی ماں بہن لگتے ہیں؟"

"جی جی دراصل میں ایک تجرباتی فلم لکھنا چاہتا تھا۔"

"معلم۔۔؟" شالو نے بہت کچھ سمجھ لینے کے انداز میں سر ہلایا۔ "مطلب تم ایکسٹرا بھرتی کروانے کو آئے ہوں گے نا۔"

ایکسٹرا؟! اشرف گڑبڑا کر بولا۔ پھر ایک دم اس کے دماغ میں ایک بلب سا جلا۔ ایکسٹرا۔ وہ پہلی بار ذرا سا مسکرایا۔

"جی نہیں! آپ غلط سمجھیں۔ میں ایکسٹرا بھرتی کروانے نہیں آیا۔ میں تو دراصل کہانی لکھنے والا ہوں اور کہانی کی تلاش میں یہاں آیا تھا۔"

شالو ذرا مایوسی سے بڑے ذلیل کرنے والے انداز سے بولی۔ "تو یوں کہو نا صاحب کہ تمہاری گاڑی میں پٹرول نہیں ہے۔"

اشرف نے سر موڑ کر باہر گلی کی طرف دیکھا جہاں یقیناً اس کی گاڑی کھڑی نہیں تھی اس لیے کہ اب تک وہ اتنا خوش نصیب نہیں تھا کہ گاڑی خرید پاتا وہ بولا۔

"دیکھیے شالو بی بی! میرے پاس گاڑی تو ہے ہی نہیں اس لیے پٹرول کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

شالو چلا کر بولی۔

"اے او صاب' گاڑی میں پٹرول کا مطلب تمیں معلوم ارے جو مرد ڈھیلا رہتا ہے نا اس کے واسطے ہماری بول چال میں ایسا ہی بولتے کہ گاڑی میں پٹرول نہیں تو آیا کیا کرنے۔ سمجھے کہ نئیں او کہانیاں لکھنے والے صاب!"

اشرف کا پورا جسم پسینے میں بھیگ گیا۔

اگر کوئی برابری کا مرد یہ طعنہ دیتا تو ایسا کرارا ہاتھ دیتا کہ چودہ طبق روشن ہو جاتے مگر اس چھوکری کے دو کیا منہ لگتا۔

چنی موقع کی نزاکت سے فائدہ اٹھا کر دور جا کھڑی ہوئی اور شالو کو انگوٹھا دکھا کر بولی۔

"لے ٹھینگا۔ اب اتراتی رہ کہ وہ میرے واسطے آیا تھا۔ ایسے چھوٹے ڈھول تو ہی سنبھال میں تو چلی۔"

"چلی کہاں ہے کتے کی جنی۔ میرے گراہک کو چھوٹا ڈھول بولتی۔"

"پھر کیا؟" چنی کا حوصلہ اس وقت بڑھا ہوا تھا وہ ہاتھ نچا کر بولی۔

"سو بار بولوں گی چھوٹا ڈھول چھوٹا ڈھول چھوٹا ڈھول۔ اب بول کیا کرتی ہے میرا۔"

"چھوٹا ڈھول دکھ رہا تھا تو تو نے اس کو دیکھ کر اشارہ کیوں کری تھی؟"

"اشارہ میں نے کری تھی؟ اری چھنال تو نے ہی ساڑھی کا پلو سینے پر سے گرائی تھی۔"

"سینے پر سے پلو میں نے گرائی تھی؟ اری جل ککڑی! میرا سینہ ہی نو دا تنا ہوا ہے کہ پلو گر گر جاتا تیرے جیسا سپاٹ مرغی کا کھڑا نہ میرا سینہ نہیں ہے سمجھی۔"

"ہاں ہاں سب معلوم ہے یہ تیرے جیسا ربر کے کپ اوپر سے کر کر کے میں نئی رکھتی۔"

"کیا بولی ڈکری کی بچی۔ میں ربر رکھتی چولی میں گھسیڑ کے۔ لے دیکھ ادھر دیکھ۔" اور اس نے جھر رکر کے اپنا بلاؤز پھاڑ کے رکھ دیا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اشرف کی نگاہیں اٹھ گئیں اور اسے ایسا لگا جیسے اس کی ٹنکی پٹرول سے فل ہو اور فی گھنٹہ ڈیڑھ سو میل کی رفتار سے اس کی گاڑی اڑی چلی جا رہی ہو۔

کانوں میں شائیں شائیں کرتے انجن کو اس نے بڑی مشکل سے روکا اور منہ پھیر کر بولا۔

"شالو بی بی! آپ خواہ مخواہ جھگڑے کھڑے کرتی ہیں۔"

باریک ساڑھی کا پلو ایک تناکے سے اپنے کھلے سینے پر ڈال کر وہ اشرف کے عین چہرے کے پاس آ کر چلائی۔

"بی بی۔ بی بی بی بی بی ہوئی تیری ماں' تیری بہن! تیری ہوتی سوتی میرے کو ایسی گالیاں مت دے بڑا آیا کہانیاں لکھنے والا۔ چل نکل یہاں سے' کہانیاں قلم سے کاغذ پر لکھے جاتے۔ یہاں ہمارے جسموں پر مردوں کی انگلیاں چلتے' ایسی کوئی کہانی لکھنے کا ہے تو لکھ میں تو اپنا راستہ ناپ وہ ادھر ہیں' سیڑھیاں جدھر سے چڑھا تھا۔"

"میں بھی سالا کدھر آ کر پھنس گیا۔" اشراف نے خود کو سنایا۔ "ریڈ لائٹ ایریا" پر کہانی لکھنے کا آئیڈیا پتہ نہیں کس منحوس گھڑی سے آیا تھا کہ لاکھ کی عزت خاک ہوئی جا رہی تھی۔ نہ اب تک کوئی پلاٹ ہاتھ لگا تھا نہ کوئی خاص معلومات ہی مل سکی تھی۔ لے دے کے چند گالیاں ضرور نئی نئی معلوم ہوئی تھیں لیکن اب اس

کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس جنجال سے نکلے تو کیسے؟ دونوں شیرنیوں کی طرح ایک دوسرے کے سامنے تنی کھڑی تھیں۔

پرلے کمرے سے آواز آئی۔ بے حد کراری۔

''ارے چنی! وہ تیرا گاہک پیچھے باز و سے کب سے آ کر بیٹھا ہے' دودھ والا بھیا! کیا کر رہی ہے وہاں۔''

شالو حقارت سے چنی کی طرف دیکھ کر بولی۔

اری او بھینس! جا اپنا دودھ دوہا لے! آ گیا تیرا بھیا''

چنی کچھ فخر سے بولی۔''اب بول نا کہ وہ بھی تیرا ہی گراہک ہے۔''

اب کی بار شالو خلاف توقع بے حد کھسیاہٹ سے بولی۔

''وہ تو تیرا بندھا ہوا گراہک ہے میرے کو معلوم نہیں کیا؟ مگر جب کوئی نوا گراہکی کے واسطے آتا اور جھپٹ لیتی تو پھر کیوں تیری بوٹیاں نہیں نوچوں؟''

اتنے میں وہ کراری آواز والی محترمہ کمرے میں تشریف لا چکی تھیں۔ منہ بھر کے پان' دانت سیتا پھل کے بیجوں کی طرح سیاہ' سر میں بے حد چپڑ چپڑ تیل' کان میں ادھ جلی سگریٹ اٹکا ہوا۔ بے حد گہرے رنگ کی لال لپ سٹک جوان کے سیاہ چہرے پر سخت کنٹراسٹ پیدا کر رہی تھی بڑے بڑے چھاپے والی ساڑھی میل بھرے زیوروں سے لدی۔

''صاحب بائی جی سلام کرو۔'' چنی نے اشرف کو تہذیب سکھائی۔

ابھی اشرف سلام کر بھی نہ پایا تھا کہ شالو ایک نظر اشرف اور ایک نظر چنی کو ذرا حقارت سے دیکھ کر بولی۔

''ان لوگوں کو کہاں اتنی انگریجی آئے' کتی بار سمجھائی کہ ممی بولا کر۔''

اشرف نے بوکھلا کر شالو کو دیکھا جو بے حد لاپروائی سے کہہ رہی تھی۔

''ادھر پوری چال میں بس میرے کو انگریجی آتی ہے صاحب! معلوم ہے کیوں؟ ایک بار میں پھلم میں کام کرنے کے واسطے گئی تھی اس واسطے۔''

اچھا؟ اشرف کو دل ہی دل میں ہنسی آئی۔ لیکن وہ یہ ہنسی ہونٹوں پر لا کر اس جھگڑالو عورت سے الجھنا نہیں چاہتا تھا وہ بولا۔

''پھر کیا ہوا؟ وہ فلم ریلیز ہوئی یا نہیں آپ کی۔''''نہیں صاحب وہ پھلم میری غلطی سے رنج

نہیں ہو سکی۔"

"وجہ کوئی؟"

"وہ وجہ یہ ہو گئی تھی۔" وہ ہاتھ ہلا کر بتانے لگی" کہ پہلے ہی دن ہم چار پانچ چھوکری لوگ کو ایک ڈسٹرا سپلائی کرنے والا ادھر اسٹوڈیو میں لے گیا' وہ پھلم جو بنتا ہے اس آدمی کو کیا بولتے صاحب؟" وہ شاید بھول گئی تھی' اشرف نے یاد دلایا!"

"ڈائریکٹر۔"

لفظ کچھ مشکل تھا' شالو کے پلے نہیں پڑا' ہاتھ کو جھٹک کر بولی۔

"ہو یگا کوئی بھی ڈکٹر کا مکا' میرے کو کیا؟ ہاں تو معاملہ کاٹے سے چوپٹ ہو گیا' معلوم؟ وہ پھلم بنانے والا میرے کو سکھایا کہ اب تم نے ایک ڈیالوگ بولنا۔۔۔۔۔۔"

"ڈیالوگ؟" اشرف بڑبڑایا' دوسرے ہی لمحے وہ سنبھل گیا' اچھا اچھا ڈائیلاگ۔"

"دیکھو صاحب! میں پہلے ہی بول دی کہ ادھر بس تھوڑی تھوڑی میرے کو انگریجی آتی ہے۔ تم بات پوری سنو' بیچ میں ٹوکو مت۔ ایسے سے قصہ سنانے میں بہت ڈسٹرب ہوتا۔"

"ٹھیک ہے معاف کر دیجئے' میں آگے سے چپ چاپ سنوں گا۔"

"تو تم نکلے کی اولاد ہے کیا' منہ میں زبان نہیں کیا جو چپ چاپ سنوں گا۔ مکا معلوم کس کو بولتے' جس کو بات کرنا نہیں آتا۔ میرے کو ایسے لوگ بھوبس لگتے کہ میں تو چپڑ چپڑ باتیں سناؤں اور خود خالی بیٹھ کر سن رئے۔ تم بات کرو ضرور' مگر کب؟ جب تمہارے کو کوئی انگریجی بات سمجھ میں نہ آئے۔"

"جی درست فرمایا" اشرف بظاہر سنجیدہ بن کر بولا۔

"تو پھلم بنانے والا میرے کو بولا کہ اب تم یہ ڈیالوگ بولنا' اگر تم نے میری طرف دیکھا تو میں تیری آنکھ پھوڑ دوں گی۔" اب جو ولن تھا نا۔ ولن سمجھتے ہو کہ نہیں تم؟"

"جی ہاں جی ہاں' سمجھتا ہوں وہ ولن جو ہوتا ہے۔"

"خاک پڑے تمہاری عقل پر' لے کے بول دیا۔ وہی جو ولن ہوتا ہے۔ ارے ولن وہ جو ہمیشہ پھلم کی چھوکری کی عزت خراب کرتا۔"

"جی ہاں میں بالکل سمجھ گیا۔ آپ بات پوری کیجئے گا۔"

"تو ولن جو تھا' اس نے میرے کو لال لال آنکھوں سے گھورا۔ تو میں خوب تیزی سے دوڑی ایسا بولتے ہوئے کہ' اگر تو نے میری طرف دیکھا تو میں تیری آنکھ پھوڑ دوں گی۔" مگر شاید میرے آنکھ پھوڑنے

میں کچھ کسر رہ گئی ہو ویں گی۔ کیونکہ اس کا دیدہ برابر سے میرے ہاتھ میں نہیں آیا بس ذرا سی کمی رہ گئی۔ سب لوگ بجائے واہ واہ کرنے کے دلن کی طرف دوڑے کیونکہ وہ ہائے ہائے کرکے وہیں لمبا لمبا لیٹ گیا تھا اور آنکھ کے آس پاس سے اور گال پر سے کچھ خون بھی نکل رہا تھا۔"

اشرف نے اپنا گال سہلایا اور دھیرے دھیرے سر ہلا کر بولا۔

جی ہاں ذرا اصل، وہ فلم ڈائریکٹر آپ کے فن کو پرکھ نہ پایا ورنہ فلم ہٹ ہو جاتی۔"

"ارے تمیں جی صاحب! پھر میں اس چکر میں پڑی ہی تھی، معلوم کیوں؟"

"جی نہیں اشرف مسکی صورت بنا کر بولا۔ وہ اس واسطے کہ میرے کو جلدی ہی معلوم پڑ گیا کہ جو دھندہ یہاں شرافت سے کوٹھری میں بیٹھ کر ہوتا وہی سب ایشر لڑکیوں کے ساتھ بے شرمی سے باہر ہوتا تو تم ہی بتاؤ صاحب! یہ شرافت کا دھندہ یہاں اچھا کہ کھلے میں سب کے سامنے؟ اصل سوال تو روپے کا ہے وہ یہاں بھی ملتا صاحب ہے کیا مت؟"

پتہ نہیں بائی جی کب چھتی کو اپنے ساتھ لے کر کوٹھری کے پچھواڑے چلی گئی تھیں کہ اب شالو کی باتوں۔ ذرا مہلت پائی تو اشرف نے دیکھا کہ چھتی ساڑھی برابر کرتی، بلاوز کے ہک لگاتی پھر سے کوٹھری میں وارد ہو چکی تھی۔ کچھ فاتحانہ انداز سے وہ شالو سے بولی۔

"تو تو یونہی تجل کوٹری میں لگی رہی، میں نے تو ایک گراہک بھی نمٹا دی۔"

کتنا دے کر گیا؟ شالو بڑی خوشی سے بولی"

"وہ تو روز کا بندھا ہوا ہے تین روپے۔"

شالو کے چہرے پر دکھ کا ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ جسے اشرف نے بڑی حیرت سے دیکھا۔

ایک بار۔۔؟ وہ اپنے مخصوص چھپے ڈھکے لہجے میں پوچھنے لگی جو اشرف کے پلے نہ پڑا۔

"پھر اور کتنی بار۔ اصل میں دیوالی، عید دونوں قریب ہے نا؟ دیکھ بھیڑ کتی ہے۔ جلدی جلدی گاہک آتے ہیں تو نپٹانا بھی جلدی ہی پڑتا ہے نا۔"

دونوں ہنسنے لگیں۔ اشرف کی سمجھ میں ان کی لڑائی آئی تھی نہ ہنسی۔

اس نے بیچ میں کئی بار اٹھنا چاہا لیکن پتہ نہیں کیوں اس کی نکاراتہ حس کہہ رہی تھی کہ کچھ دیر اور بیٹھا تو کچھ نہ کچھ مال مسالہ تو لے کر ہی اٹھے گا اسی لیے وہ کراہت سی محسوس کرنے کے باوجود ایسے کثیف ماحول میں اپنے آپ کو بٹھائے جا رہا تھا۔

قید خانے کی سی سلاخوں والی کوٹھری کے اندر سے اچانک شالو اور چھتی کی نظریں باہر جا پڑیں۔

جہاں ایک شرمائی شرمائی صورت والا نوجوان کچھ کر گزرنے کی ہمت نہ پاسکنے کی جھجک کے مابین کھڑا اندر جھانکے جا رہا تھا۔

ایک دم شالو چلائی

''اے دیکھ تو نے حرامی پن کری تو' دیکھ وہ میرے کو ہی دیکھ رہا ہے اس نے اپنے پھٹے ہوئے بلاؤز پر سے دانستہ ساڑھی ہٹادی۔

''بھئی یہ حرکت آپ بار بار نہ کریں۔'' اشرف گڑبڑا کر بولا۔

اس کی بات سنی ان سنی کر کے شالو چتی سے بولی۔

''دیکھ بول دی میں نے یہ گراہک میرا ہے۔ وہ سیدھا میرے کو ہی دیکھ رہا ہے۔''

''اری چل ری۔ تیرے میں کیا دم ہے بس زبان ہی چلتی ہے تیری تو' اور گراہک کو پھنسانے کے واسطے کچھ اور بھی چلانا پڑتا ہے۔''

''حرام کی جنی ایک ایک رات میں بارہ بارہ کو بھگتا کے بیٹھی ہوں میرے کو سمجھتی کیا ہے؟''

اور کچھ نہیں تو اپنے آپ کو کیا سمجھتی ہے نمبر ے کو تو کچھی کے دیسی کر و کھتی تیری۔''

اری چھنال۔ کچھی کے دیسی کر پر تو مرد کی جان جاتی' تیرے جیسی زہر کی پٹاری نہیں ہوں میں کہ مرد بازو سے اٹھے تو آنگ دھونے کو سیدھا موری میں بھاگے۔''

ابھی چتی کچھ جواب نہ دے پائی تھی کہ پھر بائی جی وارد ہوگئیں ان کے ایک ہاتھ میں بھیل پوڑی کی ایک میلی سی رکابی تھی جس میں سے وہ پھنکے لگاتی جا رہی تھیں۔ بیچ بیچ میں وہ اپنی کتھے چونے سے لتھڑی انگلی سے ہری مرچوں کی چٹنی بھی چاٹتی جا رہی تھیں۔

''دیکھ شالو' انہوں نے اسے غیرت دلائی۔'' چتی نے میرے کو آٹھ آنے بھیل پوڑی کے واسطے کمیشن سے ہٹ کر دی تو تو کیسی ہے کنجوسڑی' کچھ نہیں دیتی۔''

شالو نے صرف غصے سے دیکھا' کہا کچھ نہیں۔

''اور ہولی پر ساڑھی بھی دی تھی اور عید پر کان کے بھی۔۔۔۔۔''

شالو پھر سے باہر جھانکتے اس شرمیلے مرد کو گھیرنے کی کوشش میں لگ گئی تھی۔ بائی جی نے اشرف کو ذرا غور سے اور زیادہ غصے سے دیکھا اور غصے کے اظہار کے طور پر زیادہ چٹنی کھا کر بولیں۔

اب کیا ہے؟''

''اب؟ جی۔۔جی۔'' وہ بوکھلا کر بولا'' جی جب بھی کچھ نہیں تھا۔''

"وہ تو میرے کو معلوم ہے۔ جی کہ جب بھی پتہ نہیں تھا اسی لیے تو پوچھ رہی ہوں کہ اب کیا ہے؟"

اچانک اشرف کو احساس ہوا کہ اس نے واقعی اب تک سخت حماقت کا مظاہرہ کیا ہے۔ ڈھلتی شام کے اس بزنس کے سمے میں وہ ان لڑکیوں کا سخت مالی نقصان کر رہا تھا۔ اگر وہ کسی غلط ارادے سے نہیں بھی آیا تھا تو کم از کم اسے اتنا تو کہہ دینا ہی چاہیے تھے کہ وہ کچھ نہ کرے۔ بہر حال پیسے ضرور دے گا تا کہ ان لڑکیوں اور بائی جی کو کوئی اعتراض اور مالی تکلیف نہ ہو۔

وہ سخت کش مکش کا شکار تھا کہ اس قسم کی گندے سودے بازی کے لیے کون سے الفاظ استعمال کرے۔ بہر حال ہمت کر کے بولا۔

"جی آپ کو روپیہ بھی توقع سے زیادہ ہی دے جاؤں گا۔"

بائی جی زہر خند ہنسی کے ساتھ بولیں۔

"کیا خالی باتوں کے پچاس روپے دے جائیں گے؟ یہاں تو بیٹھنے والے بھی پچیس نہیں دیتے۔"

وہ تو بڑی تکلیف سے بولا۔ "جی میں ایک دو گھنٹہ اور بیٹھوں گا اور سو روپے دے کر جاؤں گا۔"

ایک دم ایک طرف سے شالو اور دوسری طرف سے چتی اس سے آ کر لپٹ گئیں۔

صائب! تم یہ روپے کس کو دیں گے؟"

صائب! یہ روپے تم میرے کو دیں گے نا؟"

"صائب پہلے چی بولو تم نے میرے کو دیکھ کر مسکرائے تھے نا؟"

"صائب! تم شرما کے بات مت ٹالو تم نے پہلے چی بولنا میرے کو آنکھ مارے تھے نا؟"

سو روپے کی نوید سن کر بائی جی کے الگ دیدے پھٹ گئے تھے۔ وہ تو اچھا ہوا جیل پوری پہلے ہی چٹ کر چکی تھیں البتہ پیلی تام چینی کی رکابی ایک جھٹکے سے گری اور یہاں وہاں باریک تام چینی کے ریزے پھیل گئے۔ ٹین کی رکابی دیر تک کھڑ کھڑ کھڑ گول گول گھومتی اور بجتی رہی۔

اشرف کا اپنا دماغ بھی گول گول گھوم رہا تھا۔

"کس الو کے پٹھے نے تمہیں یہ مشورہ دیا تھا بیٹے کہ طوائفوں پر فلمی کہانی لکھو اور نام کماؤ۔؟"

دونوں کی کھینچا تانی اختتام پر یوں آئی کہ چالاک شالو نے چتی کے حق میں فیصلہ دے دیا کہ باہر کھڑا جو دہ شرمیلا نوجوان تجھے ہی اشارہ کر رہا تھا۔ شالو یقیناً زیادہ چتری تھی کیونکہ پردے کے پیچھے اپنا سنگھار تازہ کرنے چلی گئی تو وہ اشرف کے کندھے پر جھک کر بولی۔

''وہ چھنال رنڈی اب دفعان ہوگئی اب تم صاحب جو چاہو کر لیو مگر وہ سو روپے میرے کو دے دیو۔''

اشرف نے احمقوں کی طرح پوچھا۔

''چنی کہاں چلی گئی؟''

''ارے وہ جب سے جو جھانک رہا تھا جس پر ہم دونوں لڑ رہے تھے وہ اس کو لے کر پچھواڑے چلی گئی۔''

تو آپ نے اسے کیوں جانے دیا؟''

''ارے صاحب!'' وہ اس سے ذرا دور ہٹ کے اسے غور سے دیکھتی ہوئی بولی ''تمہارے اس کھوپڑے میں کچھ عقل ہے کہ نہیں' وہ بھاڑ کھاؤ اسے کیا دیں گے۔ زیادہ میں زیادہ پانچ روپے۔ بہوت ہوئے دس روپے۔ اسی واسطے تو میں نے چنی کو بول دی کہ وہ آدمی بچی تیرے کو ہی تاک رہا تھا۔ اب دیکھو وہ ادھر چلی گئی تو تم میرے کو مل گئے' مطلب پورے پچاس روپے میرے''

''پچاس۔'' اشرف حیرت سے بولا ''لیکن میں تو آپ کا وقت خراب کرنے کا پورا سو روپیہ دوں گا۔''

''ہاں صاحب! تم تو سو ہی دیں گے مگر وہ کھوسٹ چھنال بھی چالیس روپے لے لیں گی وہ موا ہجڑوا دس روپے' پچاس میرے کو بچ جائیں گے۔''

''یہ بھی اور۔۔۔۔۔'' وہ کچھ رک کر بولا ''ہجڑوے کا کیا قصہ ہے مگر۔۔۔''

''اونہہ وہ بے حد حقارت سے بولی ''صاحب تم بھی لیبروں کے جاہل ہو۔ ارے یہ بائی جی ہے نا۔ یہ ہم جیسی دس بارہ چھوکریاں رکھتی۔ اس کا اپنا ایک آدمی رہتا' وہ بڈھی بائی جی کہلاتی' وہ ساتھ والا جو گھیر گھار کے تم جیسے شریف کمین مردوں کو لاتا ہجڑوا کہلاتا آدھی ہماری کمائی تو یہیں دو کھا جاتے۔''

اشرف رک رک کر کچھ حیرت سے بولا۔

''تو آپ لوگ ان صاحب کو ہجڑوا ہی کہہ کر پکارتی ہیں؟''

وہ بڑی لاپرواہی سے بولی'' جس کا جو جی چاہے کہہ لے' ہم نے اپنی آسانی اور سہولت کے واسطے نام رکھ لیے ہیں۔ اب جیسے سامنے منہ پر منہ پڑتا تو اس کھوسٹ رانڈ کو بھی بولنا پڑتا۔ پیٹھ پیچھے ہم چھوکریاں اس کو چنڈالنی بولتے۔ وہ ہجڑوا جو ہے اس کو کھوتیا بولتے۔ کرایک جب ہم خود پہچانتے تو کبوتر پکڑتا بولتے۔ ہجڑوا گھیر گھار کر لاتا تو اس کو مرغا پھنسا بولتے۔ رات گزارنے کو ''بیٹھنا'' بھی بولتے۔ اور اپنے

بالکل ہی آپس کی بات اردو بولتے۔ کتوں کو رات بھر میں مہندی لگا کے چھوڑی۔۔۔۔"

اشرف گھٹنوں پسینے میں نہا رہا تھا مگر شالو بے تکان سنائے جا رہی تھی۔

"یہ سب ہمارے رازکی باتاں ہیں۔ سب کو تھوڑی بولتے صائب تم بولے نا صاحب کہ تم کہانیاں لکھتے تو اسی لیے بتادی صائب کہ شاید اپنے نصیبوں کی کہانی تم کبھی لکھ دو صائب یہ انڈیا میں بہت پورنی ہے تو غرض ہی بس۔ پورے آزو بازو میں ایک میرے کو ہی انگریجی آتی صائب! باقی تو سب جاہل ہیں رانڈاں بس گر ایک آیا کہ بستر کے ویسا بچھ گیاں۔ مگر میں اخبار بھی پڑھتی ہوں صائب مگر اخبار اپنے پیسے سے نہیں پڑھتی، جوؤں کے پیسے سے پڑھتی ہوں۔۔۔۔"

"جوؤں کے؟"

اشرف ہڑبڑا کر بولا۔

"ہاں صائب جوؤں کے، صائب! یہ ہماری بھاڑ کھاؤنی ممی ہے نا، یہ نشے میں وحت رہتی۔ کسی سے پاؤں دبواتی۔ کسی سے جوواں دکھواتی۔ پاؤں دبوانے والی کو ایک گھنٹہ کا پچاس پیسہ دیتی اور جوؤں نکالنے کا ایک جوں کا پانچ پیسہ۔ تو صائب! میں ساڑھی کے پلو میں کالا زیرہ باندھ کر رکھ لیتی۔ صائب کالا زیرہ تم سمجھتے نا۔ دال سالن میں پڑتا وہ۔ بس اس چھنال کے سر میں بیس پچیس کالے زیرہ کے دانے چھوڑ دیتی میں اور ڈھونڈ کر نکال نکال کر اس کی ہتھیلی میں رکھتی جاتی۔ اس کو آنکھا سے ذرا کم دکھتا صائب! بس وہ ہتھیلی پر کالی چیز دیکھ کر سمجھتی کہ جوں ہے اور ہر جوں کے پانچ پانچ پیسے دیتی جاتی۔۔۔۔۔۔"

اب کے اشرف نے ذرا غصے سے اسے دیکھ کر پوچھا۔

"مگر آپ ایک بات بتانے کی کوشش کریں گی کہ آخر آپ لوگوں کو پیسے کی اتنی لالچ کیوں ہے؟ جب سے آیا ہوں دیکھ رہا ہوں پہلے تو تم نے مجھ غریب ہی کی وجہ سے چنی سے وہ مارا ماری کی کہ اسے لہولہان کرنا باقی رہ گیا۔ پھر اپنی داستانیں بھی خود ہی سنا رہی ہیں۔ اب میرے سو روپے کی بات سن کر چنی کو بھگا دیا، یہ سب کیا ہے؟"

"روزی کا سوال ہے صائب!" شالو نے بے حد بے نیازی سے جواب دیا۔

"روزی کا سوال تو چنی کے لیے بھی ہے اور آٹھ دس غریب لڑکیوں کے لیے بھی، جنھیں میں نے نہیں دیکھا لیکن جو انہی پنجروں میں کہیں بند ہوں گی۔"

اس کے اندر کا فنکار جاگ اٹھا تھا اور وہ سچ مچ شالو پر غصہ ہونے لگا تھا۔

"صائب جز وقت بھی سب اپنی اپنی کھینچ پر رہتیاں ہیں۔" وہ ہاتھ ہلا کر بولی۔

اشرف نے جل کر پوچھا "اور یہ تو بتایئے کہ آپ نے اب تک کتنی جمع جتھا جوڑ لی ہے؟"

شالو نے ادھر ادھر دیکھ کر اطمینان کر لیا کہ کوئی سن تو نہیں رہا۔ پھر اشرف کے پاس منہ لا کر بولی:

"ڈیڑھ ہزار۔"

اس کا انداز یوں تھا کہ گویا اشرف کا اتنی بڑی رقم کے بارے میں سن کر ہارٹ فیل ہو جائے گا لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ بہر حال وہ سب سے بڑا کہانی نویس نہیں تو اتنا حقیر بھی نہ تھا۔ سال کے پندرہ بیس ہزار تو بنا ہی لیتا تھا۔

"اتنا روپیہ یعنی کہ اتنا بہت سارا روپیہ جمع کر کے آپ کیا کریں گی؟" وہ نہیں چاہتا تھا کہ ڈیڑھ ہزار کو اتنے حقیر انداز میں بتائے کہ وہ شرمندہ یا غصہ ہو جائے۔

"اس میں کچھ اور روپیہ جمع کروں گی اس کے بعد گھر بناؤں گی۔"

"گھر۔۔۔۔؟" اشرف حیرت سے بولا۔

"ہاں ہاں گھر۔۔۔ کبھی گھر نہیں دیکھے صاب تم نے؟ چار دیواری کا گھر۔ جو بس اپنا ہو شادی وادی تو ہم جیسوں سے کون کرنے چلا صاب اس کی آرزو کرتے بھی نہیں مگر گھر ضرور ہونا چاہیے صاب! کیوں؟ کیوں بولے تو کیا معلوم؟" اس انداز سوال پر وہ اشرف کو سخت معصوم لگی وہ کچھ نہیں بولا وہی سنانے لگی۔

"کیوں بولے تو کیا معلوم صاب اس واسطے کہ طوائف کا بڑھاپا بڑی سخت ہوتا کوئی نہیں پوچھتا صاب میں کتے رنڈاں دیکھی سڑک کے کنارے مرتے دے۔ دیکھی صاب۔ بس اس واسطے دل بولتا کہ ایک اپنا چھوٹا سا گھر ہوتا۔ اس گھر میں کچھ نہیں کچھ نہیں تو بھی پھولوں کے پودے ضرور لگاؤں گی۔ صاب کیوں بولے تو کیا معلوم صاب۔ اس واسطے کہ اس پنجرے میں رہتے رہتے میں ٹھنڈی ہوا کے واسطے ترس گئی صاب۔"

اشرف کچھ نہیں بولا' کچھ بول ہی نہ سکا۔ اس کی جیبوں میں سب کل ملا کر دو سو روپے نکلے۔ وہ اس نے سب کے سب ملا کر شالو کے ہاتھ پر رکھ دیے۔ اور بھیگی ہوئی آنکھیں لیے اس پنجرے سے باہر نکل آیا۔

---

تین برس بعد جب اشرف کی پہلی فلم ہٹ ہوئی جو اس نے طوائفوں کے ناپک پر لکھی تھی تو اس پر شہرت اور دولت کے دروازے کھل گئے' اسے سب سے پہلے شالو یاد آئی۔

اس کی لمبی سی گاڑی جب اس بدبودار تنگ گلی کے سامنے جا کر رکی تو پنجرے نما کوٹھریوں سے سستے کریم پوڈر اور گہری گہری لپ اسٹک سے سجے کتنے ہی باسی چہرے جھانکنے لگے۔

سب کو نظر انداز کرتا ہوا وہ شالو کی کوٹھری میں چڑھ گیا۔ بائی جی کان میں ٹوٹی بیڑی دبائے میلی رکابی میں بھیل پوری کے پھنکے لگا رہی تھیں۔ گاڑی کو اپنے گھر کے سامنے رکتا دیکھ کر وہ ذرا نا قابل یقین انداز میں لڑکھڑائی تو تھیں۔ لیکن یہ سوچ کر کہ وہ کہاں اور ایسی گاڑی کہاں۔ پھر بھیل پوری میں جت گئی تھیں لیکن اب اتنے پورے اور اونچے مرد کو اپنے سامنے دیکھ کر وہ پوری کی پوری بوکھلا گئیں اور جوانھی ہیں تو رکابی مع بھیل پوری کے ان کے ہاتھ سے چھوٹ کر گری اور کھڑ کھڑ کی آواز کے ساتھ گول گول گھومنے لگی۔

اس شان اور رعب داب کی وجہ سے وہ اسے پہچان نہ پائیں سب نئے چہرے تھے۔ وہ رک رک کر بولا۔

"وہ۔۔ شالو بی بی کہاں ہیں؟"

دو چار لڑکیاں کھسر پھسر کر کے ہنسنے لگیں۔

بائی جی کراری آواز سے بولیں (کراری آواز لجاجت سے اور خوشامد سے بوجھل تھی)

"اُئی پرانی باسی چھوکری کو کیا پوچھنا سرکار۔۔ ادھر دیکھو۔۔۔"

وہ سٹ پٹا کر بولا "جی مجھے ان سے کچھ بات کرنی تھی۔ وہ شالو بی بی اور ان کی ایک ساتھی چنی۔۔۔"

"ارے وہ چنی۔" بڑھیا نفرت سے بولی "سڑ گئی رانڈ وہ تو۔"

"جی" اشرف کا دل دکھ گیا۔ بڑھیا لاپرواہی سے بولی۔ "ہاں کوئی روگ لگ گیا تھا پورا انگ دانوں پھنسیوں سے بھر گیا تھا۔ کوئی منہ میں پانی ڈالنے کو بھی خالی نہ تھا۔ وہی پاگل رانڈ شالو اس کو لے کر گئی ہسپتال میں داخل کروائی پوری جمع جتھا اس پر لٹادی اپنی اس گدھے کی اولاد نے۔"

"جی۔۔!" اشرف کو یقین نہ آیا۔ "مگر مجھے تو ایسا یاد پڑتا ہے کہ ان کی اور چنی کی سخت لڑائی رہتی تھی۔" وہ بڑی مشکل سے بولا۔

"لڑائی تو ایسی رہتی تھی کہ مرغیوں کی بطخوں کی چیلوں کی لڑائی کیا ہو گی۔ جیسی وہ شالو حرام کی جنی اس سے لڑتی تھی مگر وہ چنی بیمار پڑی تو بولی میں اس کا علاج نہیں کراؤں گی تو کون کروائیں گی۔ یہ تو اس کی روزی کا سوال ہے۔ صحت مند رہیں گی تو ہی کوئی اس کے پاس پھٹکے گا تبھی تو وہ اپنا پیٹ کیسے پالیں گی۔ ایسا بول کے ہی تو وہ اس کو لے گئی تھی۔"

"آپ کو پتہ ہے وہ اس وقت کون سے ہاسپٹل میں ملیں گی؟"

بڑھیا نے کچھ اچنبھے سے اشرف کو دیکھا جیسے اس کے دماغ ہونے میں شک کر رہی ہو پھر ہاتھ جھٹک کر بولی:

"ارے صاحب جنی کی بیماری اس کو بھی لگ گئی تھی اور اسی بیماری میں وہ چٹ پٹ بھی ہو گئی۔ میں خود ہسپتال گئی نہ اپنی چھوکریوں کو جانے دی۔ ایک آدھ کو اور بھی یہ روگ لگ جاتا تو میری روزی کا کیا ہوتا؟ کیا ہوتا؟؟ بولو؟؟"

اشرف اس سوال کا کوئی جواب نہ دے سکا۔